نومبر 2014

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

☆ بھلا کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور کس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس سے سرسبز باغ اگائے تمہارا کام تو نہ تھا کہ تم ان کے درختوں کو اگاتے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے ہرگز نہیں بلکہ یہ لوگ رستے سے الگ ہو رہے ہیں بھلا کس نے زمین کو قرار گاہ بنایا اور اس کے بیچ نہریں بنائیں اور اس کے لئے پہاڑ بنائے اور کس نے دو سمندروں کے بیچ اوٹ بنائی۔ یہ سب کچھ اللہ نے بنایا تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے ہرگز نہیں بلکہ ان میں اکثر دانش نہیں رکھتے۔ بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اسے دعا کرتا ہے اور کون اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے اور کون تم کو زمین میں گلوں کا جانشین بناتا ہے یہ سب کچھ اللہ کرتا ہے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہیں ہے ہرگز نہیں مگر تم بہت کم غور کرتے ہو۔ بھلا کون تم کو جنگل اور دریا کے اندھیروں میں رستہ بتاتا اور کون ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ یہ لوگ جو شرک کرتے ہیں اللہ کی شان اس سے بلند ہے بھلا کون خلقت کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر اس کو بار بار پیدا کرتا رہتا ہے اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے۔ تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ ہرگز نہیں کہہ دو کہ مشرکو اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔
(سورۃ نمل 27 آیت 60 سے 64)

☆ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھ کے لوگ کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات قیام کیا کرتے ہو۔ اور اللہ تو رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے تو اس نے تم پر مہربانی کی پس جتنا آسانی سے ہو سکے اتنا قرآن پڑھ لیا کرو اس نے جانا کہ تم میں بعض بیمار بھی ہوتے ہیں اور بعض اللہ کے فضل یعنی معاش کی تلاش میں ملک میں سفر کرتے ہیں اور بعض اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ تو جتنا آسانی سے ہو سکے اتنا پڑھ لیا کرو اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو نیک اور خلوص نیت سے قرض دیتے رہو۔ اور جو عمل نیک تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اس کو اللہ کے ہاں بہتر اور صلے میں بزرگ تر پاؤ گے۔ اور اللہ سے بخشش مانگتے رہو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ طٰہٰ 20 آیت 73)

☆ اور تم تعجب کرو جب دیکھو کہ گنہگار اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہونگے اور کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا تو ہم کو دنیا میں واپس بھیج دے کہ نیک عمل کریں، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں۔
(سورۃ سجدہ 32 آیت 12)

خطوط

انعم شہزادی گجرات سے۔ میری طرف سے تمام قارئین لکھاری اور تمام اسٹاف ڈر کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام اور عید مبارک...... اکتوبر کا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ میں کالی چڑیل اسٹوری پڑھ رہی ہوں جو کہ بھائی چاند عباسی نے بہت احسن انداز سے لکھی ہے لفٹ آپی ساحل دعا بخاری نے بہت اچھی لکھی۔ ان کو ہماری طرف سے پھولوں کا گلدستہ...... براہ کرم قبول کیجئے گا...... انوکھی ہمدردی ساجدہ راجہ، جادوئی چکر، مدثر بخاری، نئی قبر، ایس امتیاز احمد، خونی ہیولہ، شائستہ سحر، ان سب نے بہت محنت سے...... بہت خوب لکھا۔ خالد شہان بھائی کی اسٹوری سالگرہ نمبر میں نہ پا کر دکھ ہوا۔ باقی اشعار اور غزلیں بھی اچھی تھیں بالخصوص مصباح کریم، میواتی اینڈ ندیم عباس میواتی میں نے تو جن کو بھیجنے کی دھمکی ہی دی۔ آپ نے فوراً میرا خط شائع کر دیا۔ واہ جی واہ...... تھینک یو سو ویری مچ۔ آپ نے کہا تو میں پھر حاضر ہوگئی مگر اب کچھ ڈر کم ہوگیا ہے۔ آپ کی مہربانی اور حوصلہ افزائی دیکھ کر۔ مائی جان ماہ نور اینڈ آمنہ کو مصباح کریم اینڈ محمد ندیم عباس میواتی کو سلام۔ ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ انعم صاحبہ: اب آپ خط نہ بھیجنے کا سوچنا بھی نہیں اگر ایسا ہوا تو ہم بوتل میں قید جن کو آپ کے پاس بھیج دیں گے۔ خیر خلوص نامہ بھیجنے اور ڈر کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس۔

نبیلہ چوھدری کراچی سے۔ سب سے پہلے ڈر ڈائجسٹ کی 16 ویں سالگرہ کی پرخلوص مبارک باد قبول فرمائیں۔ دوسری مبارک باد اس بات کی کی آپ بڑے باہمت اور حوصلہ مند ہیں کہ ان نامساعد حالات میں ڈر ڈائجسٹ کو بڑی پابندی اور باقاعدگی سے نکال رہے ہیں، مجھے یاد پڑتا ہے کہ سولہ برس کے اس طویل عرصے میں کبھی آپ کا پرچہ تاخیر سے نہیں آیا اور نہ ہی اس کا معیار گرنے دیا جو بہت بڑی بات ہے۔ ہاتھی خریدنا آسان اسے پالنا مشکل۔ بہت سارے پرانے اور معروف ڈائجسٹ بند ہوگئے ہیں۔ میں اس شرط پر اظہار خیال کر رہی ہوں کہ اسے من و عن شائع کریں گے۔ کانٹ چھانٹ قطعی نہ ہوگی۔ میں نے آج تک کسی بھی جریدے کو خط نہیں لکھا ہم چوں کہ ایک قلبی لگاؤ ہے اس لئے بے لاگ تنقید کر رہی ہوں۔ گھر میں کوئی بھی چیز خراب ہو جائے تو اسے پھینک نہیں دیا جاتا نہ ردی والے کو دیا جاتا ہے آپ یہ کہیں کہ میں مخلصانہ طور پر ڈر ڈائجسٹ کی خامیوں کی نشان دہی کر رہی ہوں۔ قارئین سے شکایت ہے کہ وہ کہانیوں پر تنقید اور تبصروں کے بجائے اور موضوعات پر اظہار کرتے ہیں جو کسی طرح سے مطابقت نہیں رکھتی ہے، وہ ہر کہانی اور سلسلہ وار پر کھل کر تنقید کریں تاکہ معیار بہتر ہو۔ مجھے محترمہ فرزانہ عابد صاحبہ کی رائے سے اتفاق نہیں جو انہوں نے ایم الیاس صاحب کے بارے میں دی، مجھے حیرت ہوئی، میں صرف ایم الیاس کی فین ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ غلط بات کہوں، محترمہ فرزانہ عابد نے شاید کبھی ایم الیاس صاحب کو پڑھا نہیں ورنہ یہ بات نہیں کہتیں کہ ان کی تحریروں میں صرف نام کا فرق ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی کے کہنے پر اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ میں اور ڈائجسٹوں کی بات نہیں کر رہی ہوں صرف ڈر ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ان کی تحریروں کی بات کر رہی ہوں جو ایک عظیم اثاثہ ہیں۔ اور موجودہ سلسلہ وار کہانی عشق ناگن ہے جو اس وقت ایک بہترین سلسلہ ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ میں ان کے بارے میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں وہ اپنے قلم کو قابو میں رکھیں اور احتیاط کا دامن نہ چھوڑیں۔ میں چوں کہ ان کی زبردست فین ہوں۔ اس لیے ان کی تحریر جہاں کہیں بھی چھپتی ہے۔ ضرور پڑھتی ہوں۔ ایم اے راحت صاحب کو فکشن اور ہر موضوع پر لکھنے کی قدرت ہے۔ وہ برسوں سے بہت اچھا لکھ رہے ہیں مگر معلوم نہیں کیوں ڈر ڈائجسٹ میں اب تک ان کے جتنے بھی سلسلے وار شائع ہوئے ہیں متاثر نہ کر سکے، محترم اے وحید صاحب ڈر ڈائجسٹ میں آئے اور رولو کا سے چھا گئے۔ اب تک رولو کا ایک سو گیارہ اقساط پر محیط ہے۔ ان کی تحریروں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دو سو اقساط سے زائد لکھ لیں گے، ان کی ہر قسط کی خوبی رہی ہے کہ اس میں دلچسپی تجسس، اور قدم قدم پر اسرار ہے، جس کے باعث ان کی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ قارئین میری اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ڈر ڈائجسٹ میں

اب تک جتنے سلسلے شائع ہوئے ہیں ان میں صرف جادوگر اور ر ولو کا ہیں، ادارہ اپنے اس اثاثے پر جتنا فخر کرے کم ہے کیوں کہ ایسی تحریریں بار بار نہیں لکھی جاتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس عریضہ کو شائع کریں گے۔ Thanks نہیں بلکہ شکریہ۔ اس سالگرہ پر سب کو پرخلوص مبارک باد، کیوں کہ اس کی ترقی اور کامرانی میں ان سب کا حصہ ہے۔

☆☆ نبیلہ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید امید ہے کہ آپ ہر ماہ اپنا تجزیہ ارسال کرتی رہیں گی۔ ہر کسی کا اپنا اپنا خیال ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ تو تمام قارئین ہی کرسکتے ہیں کہ کون تنقید برائے اصلاح کرتا ہے اور کون تنقید برائے تنقید کرتا ہے۔

شگفتہ ارم درانی پشاور سے، السلام علیکم، میں امید کرتی ہوں کہ احوال بخیر ہوں گے۔ آپ کو بتا نہیں سکتی کہ یہ دلہن اور کہانی کس عجلت میں لکھ کر بھیج رہی ہوں کل 23 اگست کو ستمبر کا شمارہ ادارے کی طرف سے موصول ہوا۔ بہت خوشی ہوئی بہت بہت مہربانی۔ لیکن یہ پڑھ کر میں تو چونک اٹھی کہ میں نے تو اکتوبر کے سالگرہ نمبر سے پہلے ہی کہانی ارسال کردی ہے لیکن اس پر سالگرہ نمبر نہیں لکھا اور ادارے کی طرف سے ہدایت کی گئی ہے کہ سالگرہ نمبر کہانی پر لکھا جائے۔ بس پھر تو آپ کو اندازہ نہیں مجھے کتنی پریشانی ہوئی۔ اپنی ڈائری لے کر میں نے فوراً ایک نئی کہانی کا خاکہ تیار کیا۔ امی کو دکھایا تو انہیں بہت پسند آیا۔ اور کہانی لکھنے بیٹھ گئی۔ 23 تاریخ کو ہی دوپہر تین بجے سے میں نے اسٹارٹ لیا اور اس وقت رات کے 2 بج رہے ہیں۔ اور 24 تاریخ ہے میں نے دلہن مکمل کرلی۔ میرے ہاتھوں کی درد کے مارے کیا کیفیت ہے، کہ میں ہی جانتی ہوں۔ لیکن سالگرہ نمبر کے لئے اپنے محبوب رسالے کو کہانیوں کا ڈبل ڈوز تحفہ ''عینی'' اور ''دلہن'' کی صورت میں بھیج کر دل بہت خوش ہو رہا ہے۔ کہانی میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معذرت خواہ ہوں I Know! کہ میری Writing بھی ٹھیک نہیں ہے اس میں لیکن کیا کریں ہاتھوں کو کپڑے سے بار بار باندھ کر اور مالش کر کے ابھی مکمل کی ہے۔ پلیز میری ''دلہن'' کو سالگرہ نمبر میں ضرور شائع کر کے مجھے میری شادی کا تحفہ ضرور دیجئے گا۔ سب کے لئے ڈھیروں دعائیں ڈرڈائجسٹ کو سالگرہ دل سے مبارک ہو۔

☆☆ شگفتہ صاحبہ: چلیے آپ کی دلہن بھی منظر عام پر آگئی۔ پہلے عینی کمپوز ہوچکی تھی، دلہن بعد میں آئی۔ خیر آپ کو تمام اسٹاف ڈرڈائجسٹ اور قارئین کی طرف سے شادی مبارک ہو مگر امید ہے خط اور کہانی بھیجنا بھولیں گی نہیں۔ پلیز! پلیز!

طاہرہ آصف ساہیوال سے، السلام علیکم میں نے اس سے قبل ایک کہانی آپ کے جریدے کے لئے لکھی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ آپ کو موصول نہ ہوسکی اور تین ماہ گزر گئے اب اس دوران میں نے ایک مختصر ناول اور تحریر کرلیا اب آپ کی خدمت عالیہ میں دونوں پیش ہیں امید کرتی ہوں کہ اسے اپنے جریدے میں جگہ دے کر حوصلہ افزائی فرمائیں گے میری التجاء یہی ہے کہ ہوسکے تو میری دونوں کاوشوں کو ڈر میں جگہ دیں ذاتی طور پر میں خود ڈر کی مداح ہوں اور میں اس کی مستقل مصنفہ بننے کی آرزومند ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ میری موجودہ تحاریر آپ کو اتنی زیادہ متاثر نہ کرسکیں لیکن اگر آپ موقع دیتے رہیں گے تو یقین رکھیئے کہ میری تحاریر بھی نکھرتی جائیں گی ابھی تو محض طبع زاد کہانیاں تحریر کی ہیں آئندہ میں چند حقیقی واقعات کو قلمبند کروں گی۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ میں ''پروفیشنل رائٹر'' بننا چاہتی ہوں یعنی میں محض اعزازی مصنفہ بننے کا ارادہ نہیں رکھتی امید ہے کہ میری اس کہانی کا نام آپ خود تجویز کریں جب کہ پہلے والی تحریر کا نام دختر آتش ہے۔

☆☆ طاہرہ صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم آپ کی کہانی اصلاح کے بعد عنقریب شائع کردی جائے گی۔ محنت محنت اور صرف محنت سے ہی آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتی ہیں لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔

سیدہ عطیہ زاہرہ لاہور سے، سب سے پہلے تو سالگرہ ڈرڈائجسٹ کی مبارک باد قبول کیجئے، اور اس کے ساتھ ساتھ عیدالضحیٰ بھی تمام قارئین اور ڈرڈائجسٹ کو بہت بہت مبارک ہو ڈرڈائجسٹ آج بروز منگل مورخہ 22 ستمبر بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ اور یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ میری کہانی سالگرہ نمبر میں شامل تھی۔ اس کے لئے میں ادارے کی شکرگزار ہوں۔ سب سے پہلے میں سرورق کی تعریف کروں گی۔ اس ماہ کے رسالے کا سرورق بہت خوبصورت ہے۔ پھر جو چیز میں رسالے میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ وہ قارئین کے خطوط ہیں سب سے زیادہ خوشی بلکہ بہت ہی زیادہ خوشی۔ ایس امتیاز احمد کا خط پڑھ کر ہوئی۔ انہوں نے تبصرہ کرنے کا حق ادا کردیا۔ واہ بھائی جی واہ دیر سے آئے پر درست آئے۔ دوسری بات میں ان تمام بہنوں اور بھائیوں کی شکرگزار ہوں جنہوں نے میری کہانیوں کی تعریف کی۔ اور مجھے ڈر کے لئے ایک اچھا

اضافہ قرار دیا۔ محمد قاسم رحمان صاحب آپ کا شکریہ اور ہاں یہ سچ ہے کہ ڈر نے مجھے بہت محبت دی ہے۔ اور آپ کی رائے کا شکریہ دوبارہ! اور ساجدہ راجہ صاحبہ مجھے آپ کے چاچو کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ ان کو جنت میں جگہ دے (آمین) دراصل ستمبر کے شروع میں میرے سب سے چھوٹے چچا کی وفات ہوگئی۔ صدمہ بہت بڑا تھا۔ آپ سب سے درخواست ہے کہ میرے چاچا جان کی مغفرت کے لئے دعا کیجئے گا۔ ایک اور کہانی ''مجبوری ہے'' ارسال کررہی ہوں امید ہے قارئین ڈرڈائجسٹ کو مایوس نہ کرے گی۔ اب اجازت دیں اللہ حافظ!

☆☆ عطیہ صاحبہ: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے چاچا کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور لواحقین کو صبر جمیل۔ کہانی شامل اشاعت ہے۔

قاضی حماد سرور اوکاڑہ سے، میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں ڈرڈائجسٹ کا بہت پرانا قاری ہوں یا ڈرڈائجسٹ پڑھے بغیر نیند نہیں آتی یا بھوک نہیں لگتی، تاہم یہ ضرور گوش گزار کروں گا کہ گزشتہ تین سال سے مسلسل زیر مطالعہ رہنے کے بعد اپنے اس فعل کا برملا اقرار کروں گا کہ عیال دار ہونے کے باوجود ہر ماہ ڈر کا انتظار ایک محبوب کی طرح کرتا ہوں! چونکہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں اس لئے وقت کی کمی کا رونا روتے ہوئے اور مصروفیت کا جواز پیش کرتے ہوئے ماہ اکتوبر 2014ء کے ڈائجسٹ کی صرف پہلی کہانی ''آخری اچھا'' ہی پڑھ پایا ہوں جس کے بارے میں عرض کروں کہ کہانی کا پلاٹ اور آغاز جتنا اچھا اور جاندار تھا کہانی کا اینڈ اتنا ہی بے جان ثابت ہوا۔ بہرحال گزشتہ ڈرڈائجسٹوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ بات ضرور کہوں گا کہ تمام لکھاری حضرات اپنی اپنی کوششوں سے ڈر کا ایک معیار اور مقبولیت قائم کیئے ہوئے ہیں۔ جس میں پوری ڈر کی ٹیم کی بھی انتھک محنتیں اور نیک نیتی شامل ہیں۔ مگر ایک التماس تمام رائٹر حضرات سے کروں گا کہ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد بہت سے انمٹ سچی کہانیاں سینہ میں آج بھی موجود ہیں۔ انہیں ضرور تلاش کر کے ڈر کی زینت بنائیں۔ جس طرح ڈرڈائجسٹ میں اصول زمانہ کے مطابق لیڈیز فرسٹ کی بنیاد پر صنفِ نازک کے خطوط کو پہلے جگہ دینے اور پڑھنے کی باری ہوتی ہے بالکل اسی طرح ''قوس قزح'' میں صرف ایک آدھ صفحہ مختصر اشعار کو دیتے ہیں جب کہ غزلوں کو چار پانچ صفحات میسر ہوتے ہیں۔ جو کہ میری نظر میں سراسر زیادتی ہے۔ آخر میں ایک بات ضرور کرنا چاہوں گا کہ ہر انسان کی پوری زندگی کا دارومدار اس کی نیت پر منحصر ہے۔ ہم سب اپنی اپنی کامیابی و ناکامی کا راگ تو الاپتے ہیں مگر یہ نہیں سوچتے کہ اللہ رب العزت نیتوں اور دلوں کے حال بہتر جاننے والا ہے۔ اللہ سے دعا ہے ڈرڈائجسٹ سے منسلک تمام ٹیم کو دن دگنی رات چوگنی کامیابی و کامرانی عطا ہو۔ بندہ ناچیز کے ساتھ آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی شامل حال رہی تو آئندہ بھی آپ بزم یاراں میں حاضر ہونے کی جسارت کرتا رہوں گا۔ تجربہ نہ ہونے کی بناء پر پہلی کاوش میں کسی کا دل دکھا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

☆☆ حماد صاحب: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم آپ کی تمام باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ تمام رائٹر دلی لگاؤ کے ساتھ اپنی کاوشیں ارسال کررہے ہیں اللہ تعالیٰ تمام رائٹروں کو زورِ قلم اور دے۔ آپ کے قلبی لگاؤ کا آئندہ ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

Thanks

ایس۔ امتیاز احمد کراچی سے، بڑی انتظار کے بعد ڈرڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر ہمارے سامنے ہے سوچا تھا کہ سالگرہ نمبر ذرا ضخیم سا ہوگا جیسا کہ اکثر ہوا ہے مگر......؟ چلیے آتے ہیں سالگرہ نمبر کے تجزیے کی طرف ''قرآن کی باتیں'' قرآن مجید کے روشن موتی سے خوبصورت انتخاب ہم سب کے لئے مشعل راہ۔ ''خطوط'' ڈرڈائجسٹ کے خوبصورت دو ویورز کے خطوط سے سجی محفل خوب رہی۔ ''آخری اچھا'' ایس حبیب خان، کراچی سے لے کر آئیں۔ دل و دماغ پر سحر کرتی ہوئی خوبصورت تحریر جس نے دل و دماغ پر ایک خوبصورت اثر چھوڑا۔ ویلڈن حبیب صاحبہ بہت اچھا لکھ رہی ہیں آپ کی Next کاوش کے ہم سب منتظر ہیں۔ ''انوکھی ہمدردی'' سرگودھا سے، ساجدہ راجہ نے لکھی! ایک نوجوان کی خوفناک کتھا۔ ڈر اور سسپنس کا حسین امتزاج ساجدہ جی بہت اچھے ''نئی قبر'' جی ہاں ہم نے لکھی ہے اسٹوری اور یہ آپ بتائیں گے کیسی لکھی۔ ''خونی ہیولے'' شائستہ سحر، راولپنڈی سے ہارر اسٹوری لے کر آئیں۔ خوف و اسرار اور ہارر سے لبریز اسٹوری اچھی رہی شیطانی قوتوں کی چالاکیاں اور خوف کا حسین امتزاج اچھا لگا۔ ''رولوکا'' اے وحید، کی حسین تخلیق ایک پاورفل شخص کی پاور

فل توت جس نے ڈر کے وویورز کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا ہے۔ گڈ اے وحید، صاحب آپ کی رولو کا کا جواب نہیں۔ ''لفٹ'' دیکھ کر لفٹ لیا کریں۔ کہیں کسی چکروں میں نہ پھنس جائیں۔ لفٹ لینے والوں کا قصہ یادرینہ جسے ساحل دعا بخاری، بصیر پور سی لے کر آئیں۔ آپ بھی اچھا لکھ لیتی ہیں جی! ''جادوئی چکر'' جادو پر یقین کرنے والوں کا نامہ اعمال مگر بعض دفعہ جادو سحر کی طرح طاری ہو جاتا ہے آپ پڑھ سکتے ہیں اور یقین آپ کی مرضی ورنہ مدثر بخاری، شہر سلطان سے پوچھ لیں۔ ''قبر کی چوری'' قبرستان کے سحر انگیز ماحول ان قبروں کی کہانی جو اپنے تاریک اندھیروں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ فیصل آباد سے ناصر محمود فرہاد، کی خوبصورت تحریر۔ ناصر صاحب جواب نہیں آپ کا۔ ''زندہ صدیاں'' ایم اے راحت۔ کی صدیوں پر محیط سسپنس، اور حقیقت سے بھر پور خوبصورت تحریر۔ ایم، اے راحت کی تعریف کرنا کم از کم سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہیں۔ مگر ہم پھر بھی یہی کہیں گے جواب نہیں آپ کا! ''روح کا راز'' عطیہ زاہرہ لاہور، کی خوبصورت تحریر ایک شخص کی داستان حیات جس نے ایک روح کے ساتھ تین سال گزارے عطیہ جی! بہت اچھا لکھ رہی ہیں آپ۔ ''سفید حویلی'' عامر ملک راولپنڈی، سے سالگرہ نمبر کے لئے لے کر آئے عشق ومحبت اور سسپنس کا بھرپور خاکہ اچھی کوشش رہی عامر جی! ''نادیدہ مجرم'' کوئٹہ سے عمران قریشی، عمران صاحب آپ کی اسٹوری میں ایک پیغام ہے ماحول ذرا پاک ہند سے ملتا ہوا ہے اچھا لکھ رہے ہیں آپ۔ ''عشق ناگن'' ایم الیاس کی دل آویز محبت کا احاطہ کرتی ہوئی رومانٹک اسٹوری 13 ویں قسط میں داخل ہوگئی ہے الیاس صاحب جواب نہیں آپ کا! ''عینی'' پشاور سے شگفتہ ارم درانی، کی حسین تخلیق آپ کی اسٹوری کا جواب نہیں گر تھوڑی سی محنت اور کرلیتیں مگر اچھی کوشش رہی۔ ''پراسرار آئینہ'' رضوان سومرو کراچی سے، آئینے کی پراسرائیت کے ساتھ آئے دیو مالائی پراسرار دنیا کی خوبصورت کہانی کیا بات ہے رضوان سومرو صاحب! ''قوس قزح'' ڈرڈائجسٹ کے خوبصورت وویورز کا حسین ذوق، اشعار کے انتخاب عمدہ رہے۔ ''غزل'' ڈرڈائجسٹ کے خوبصورت رائٹرز اور وویرز کی حسین تخلیقات جواب نہیں! ''کالی چڑیل'' ڈر کے صفحات کی آخری اسٹوری حسب معمول شہزادہ چاند عباسی کراچی، سے لائے۔ ہارر بلکہ سپر ہارر اسٹوری۔ یقیناً آپ کو بھی اچھی لگے گی مگر ڈرنا تو منع ہے۔ ویلڈن شہزادہ جی! خدا کرے اور ہو زور قلم زیادہ۔ آخر میں اتنا اچھا خوبصورت سالگرہ نمبر نکالنے پر ڈرڈائجسٹ کے تمام اسٹاف اور شاہد صاحب، خالد علی اور آصف صاحب کو دلی مبارک باد۔

☆☆ امتیاز صاحب: بہت بہت شکریہ آپ قلبی لگاؤ سے تجزیہ ارسال کر رہے ہیں اور گزارش ہے کہ آپ آئندہ ہر ماہ اسی قلبی لگاؤ کے ساتھ خلوص نامہ ارسال کرتے رہیں گے۔ Thanks

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم نیک دعاؤں اور خیروعافیت کے ساتھ حاضر ہوں۔ ماہ اکتوبر کا ڈر ڈائجسٹ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی سرورق بڑا لاجواب تھا۔ اندر رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی خط اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ موسم آہستہ آہستہ بدلتا جا رہا ہے مگر معاشی طور پر حالات نہیں بدلتے دھرنوں اور سیلابوں نے انسانی زندگی مفلوج کر دی ہر انسان غمزدہ دکھائی دیتا ہے ساتھ ہی عیدالاضحیٰ کی آمد آمد ہے۔ میں پرچے کا بہت پرانا قاری ہوں قرآن کی باتیں دل کو منور کرتی ہیں خطوط میں قارئین کی پرچے کے بارے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار ہوتا ہے پرچہ پہلے سے کافی بہتر جا رہا ہے خدا اسے ترقی سے ہمکنار کرے اس دفعہ ہر کہانی خوب سے خوب تر تھی قوس قزح کے تمام اشعار اچھے تھے غزلیں بھی بہتر تھیں۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کی محبت ڈرڈائجسٹ سے قابل دید ہے اور امید واثق ہے کہ یہ محبت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو پل پل خوش وخرم رکھے۔ امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجنا نہ بھولیں گے۔ Thanks

مدثر بخاری شہر سلطان سے، امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ دعا ہے رب ذوالجلال سے کہ صدا خوش رہیں۔ آمین۔ اکتوبر 2014ء کا سالگرہ نمبر 22 ستمبر کی صبح موصول ہوا۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ سب سے پہلے تو سولھویں سالگرہ مبارک، ہنی مون پہ بھی ریٹرن آف دی ڈے مسٹر ڈر......! خدا کرے ترقی کا سفر جاری رہے۔ لکھاری اپنی محنت دکھاتے رہیں اور ڈر کو مزید اعلیٰ معیار کی طرف لے جائیں۔ آمین۔ بات کرتے ہیں خوبصورت اور معیاری تبصروں کی۔ اس دفعہ خطوط اعلیٰ پائے کے

تھے۔خاص طور پر محترم ایس۔امتیاز صاحب کا تجزیہ شامل تھا۔اچھے شاعر بھی ہیں۔مبارکباد کہ ان کی دوسری کتاب مارکیٹ میں لاوئنچ ہوگئی۔ناصر محمود فرہاد صاحب، آپ بہادر آدمی ہیں۔زندگی امید اور اس کا نام ہے۔ہم سب نے ایک دن واپس لوٹ کے جانا ہے حوصلہ رکھیں۔ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔محترمہ ساجدہ راجہ کے انکل کی وفات کا افسوس ہوا۔اللہ آپ کو صبر وجمیل عطا فرمائے۔آمین۔نمبر 1 شمارہ ساری اسٹوریز نمبر 1 ایس امتیاز صاحب کی نئی قبر، زبردست، ویری گڈ جناب! نادیدہ مجرم، عمران قریشی صاحب ایک اچھی تحریر لائے ساحل صاحبہ کی لفٹ بھی اچھی رہی۔"روح کا راز" عطیہ زہرہ ویلڈن، "جادوئی چکر" اور یہ تو میری اسٹوری تھی۔یہ تو خیر آپ بتائیں گے۔اور جادوئی چکر کو جگہ دینے کا شکریہ......! پچھلے ماہ میں نے دو اسٹوریز روانہ کی تھی۔پتہ نہیں اپ تک پہنچی کہ نہیں۔اب کی بار دو مختصر اسٹوریز حاضر ہیں خونی پیکٹ اور نظر بد۔کہتے ہیں محبت کا بدلہ محبت ہوتا ہے۔ہماری اور ڈر کی محبت ہمیشہ زندہ رہے گی۔اس امید کے ساتھ کہ سانسیں مہلت دینگی تو اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے اللہ پاکستان کو خوشحال رکھے۔اور دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں شمار کرے۔آمین۔

☆☆ مدثر صاحب: پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ آئندہ ماہ بھی خلوص نامے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد خالد شاہان صادق آباد سے، ڈر ڈائجسٹ کے تمام اسٹاف وقارئین اور رائٹرز کو جنہوں نے اپنی محنت لگن کے ساتھ ڈر ڈائجسٹ کو خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف ہیں۔میں خالد علی صاحب کی بات سے متفق ہوں کہ یہ ڈر ڈائجسٹ ایک رسالہ ہی نہیں ہے۔بلکہ اس میں ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔جس میں ایڈیٹر صاحب ڈر ڈائجسٹ کے تمام اسٹاف قارئین، اور سب رائٹر شامل ہیں۔ڈر کو یہاں تک پہنچانے میں کسی ایک کا نہیں۔اللہ کی رحمت کے ساتھ ساتھ ہم سب کا ہاتھ ہے کیونکہ ہم ایک خاندان کی طرح ہیں جس میں کچھ جا رہے ہیں تو کچھ نیو ساتھی آ بھی رہے ہیں کچھ ناراض ہے، تو کچھ خوش ہے، کیونکہ ہم ایک خاندان کی طرح ہیں اور اس خاندان کے ہر فرد کو چاہئیے کہ وہ اپنے اس گھر ڈر ڈائجسٹ کو ہمت لگن پیار ومحبت کے ساتھ ساتھ اور زیادہ کوشش کرے جیسے ہر انسان اپنے آپ کو سنوارنے میں لگا ہوتا ہے کہ وہ سب سے الگ اور خوبصورت نظر آئے اسٹاف قارئین، و رائٹرز کر بھی رہے ہے۔یہ ان سب کی محنت کا نتیجہ ہے کہ وہ تنقید کرے پر نازیبا الفاظ استعمال نہ کرے۔تنقید ایسے کرے کہ کسی رائٹر کی دل آزاری نہ ہو بلکہ وہ آپ کی تنقید سے اپنی غلطی کو اور احسن انداز میں درست کرے۔کہانیوں میں رولو کا اے وحید صاحب کی، لاجواب تحریر ہے اس کے بعد میرے استاد محترم ایم اے راحت صاحب کی زندہ صدیاں ایک ایسی تحریر جس کے سحر سے نکلنا بہت ہی مشکل نظر آرہا ہے۔ایس امتیاز احمد کی نئی قبر ڈر خوف کے ساتھ بہت خوب رہی۔اور سسٹرز میں خونی ہیولے شائستہ سحر انوکھی، ہمدردی، ساجدہ راجہ، لفٹ ساحل دعا بخاری، روح کا راز، عطیہ زاہرہ، عینی، شگفتہ ارم درانی، یہ سب لاجواب، اور ڈر وخوف کے ساتھ ساتھ ایڈونچر اسٹوری تھیں۔ناصر صاحب کے والد اور ساجدہ سسٹر کے چاچا کے انتقال کا سن کر دلی دکھ ہوا۔اللہ تعالٰی ان کو جنت فردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین۔

☆☆ خالد صاحب: خوش ہو جائیے آپ کی محبت کی بازی شائع ہوگئی۔آپ کی تمام باتیں بالکل صحیح ہیں اور آپ کی نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتے رہیے اس میں زیادہ فائدہ ہے۔

ضرغام محمود کراچی سے، آداب تسلیم اکتوبر 2014ء کا ڈر ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر ملا، فوراً ہی فہرست پر نظر دوڑائی مگر اپنی تحریر نہ پا کر منہ سے بے ساختہ یہ شعر نکل گیا۔دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے، گلستاں میں جگہ نہ ملی میرے آشیانے کو، اس سے زیادہ کچھ کہنا خلاف ادب ہوگا۔سالگرہ نمبر ہاتھ میں آیا تو ہمیں 440 وولٹ کا کرنٹ لگا پریشان ہو کر پنکھے کو دیکھا مگر وہ KElectric کی مہربانی سے ساکت تھا۔بجلی حسب معمول جانے کہاں چہل قدمی کرنے گئی ہوئی تھی پھر پریشان ہو کر سالگرہ نمبر کو ہاتھ میں لیا تو کرنٹ پھر لگا غور کیا تو پتا چلا کہ کرنٹ تو سالگرہ نمبر کے سرورق پر موجود محترمہ کے وجود میں دوڑ رہا ہے اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے بقول فراز۔دونوں انسان ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ہیں۔مگر ہم بھی ایک کائیاں شخص ہیں۔فوراً جواب ارسال کیا۔تصور میں جلوے ہے بہشت کے، جدائی سلامت مزے آرہے ہیں۔سالگرہ نمبر میں تمام تحریریں بہت اچھی تھیں خاص طور پر ایس حبیب خان صاحب کی آخری اچھا شائستہ سحر صاحبہ کی خونی ہیولے، مدثر بخاری

صاحب کی جادوئی چکر، عطیہ زاہرہ صاحبہ کی روح کا راز، شگفتہ ارم درانی صاحبہ کی عینی اور شہزادہ چاندزیب عباسی صاحب کی طویل کہانی کالی چڑیل قابل ذکر تھیں۔ ایم اے راحت صاحب کہانی کی زندہ صدیاں نے پہلی قسط سے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ خط کے آخر میں ڈرڈائجسٹ کے تمام عملے اور قارئین کو ڈرڈائجسٹ کی سولہویں سالگرہ مبارک ہو۔

☆☆ ضرغام صاحب: بہت بہت معذرت کہ آپ کی کہانی سالگرہ نمبر میں نہ آسکی۔ آئندہ ہماری کوشش ہوگی کہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

عامر ملک راولپنڈی سے، خدا کرے ڈر کا تمام عملہ اور قارئین خیریت سے ہوں ڈر کا سالگرہ نمبر اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس میں شامل تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ تمام رائٹرز کو دلی مبارک قبول ہو۔ خاص کر جادوئی چکر، لفٹ، انوکھی ہمدردی، عینی اور روح کا راز پسند آئیں۔ میں بخاری سسٹرز خاص کر ساحل دعا بخاری اور راحل بخاری کا بہت ہی ممنون ہوں کہ میری یہ بہنیں مجھے یاد رکھتی ہیں۔ اور میری تحریروں کو بھی پسند کرتی ہیں۔ یہ تو آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے ورنہ میں اس قابل کہاں میں تو ٹوٹی پھوٹی تحریر لکھتا ہوں۔ جبکہ میری بہن ساحل دعا۔ آپ تو بڑے رائٹر ہیں سچ۔ میں آپ کی تحریروں کا فین ہوں۔ راحل بہنا، بہت شکریہ آپ جیتی رہو۔ جی ہاں۔ اس سال میں اپنے گھر کی تعمیر میں مصروف تھا اس لئے غیر حاضر رہا۔ تمہاری لکھوائی ہوئی اور ساحل کی لکھی ہوئی کہانی ''نقاب'' کا شمار کلاسیکل کہانیوں میں ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ تم دونوں، بہنوں کے لئے ڈھیروں دعائیں۔

☆☆ عامر صاحب: خط لکھنے کہانیوں اور رائٹر کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ امید ہے نئی کہانی جلد از جلد بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

محمد ندیم عباسی میواتی چتوکی سے، ہنستے مسکراتے قارئین السلام علیکم۔ ڈر کی سالگرہ اور گوشت والی عید مبارک سالگرہ نمبر خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ جو کہ 24 ستمبر کو بورے والا سے لیا۔ ہماری من پسند رائٹر آپی ساحل دعا بخاری لفٹ اسٹوری کے ساتھ جلوہ افروز تھیں مگر دوسرے من پسند رائٹر بھائی خالد شاہان غیر حاضر۔ آخری اچھا۔ ایس حبیب خان صاحبہ، جادوئی چکر، مدثر بخاری، بہت خوب لکھا۔ اسی طرح شائستہ سحر خونی ہیولہ اینڈ انوکھی ہمدردی ساجدہ راجہ۔ محفل کو چار چاند لگا رہی تھی۔ نئی قبر، ایس امتیاز احمد اینڈ قبر کی چوری ناصر محمود فرہاد نے بھی بہت خوب لکھا۔ عمدہ اسٹوری تھیں۔

☆☆ ندیم صاحب: کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس۔ آپ کے نوازش نامہ کا اگلے ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، السلام علیکم سب کی خیریت کا طالب اور ترقی و کامرانی کے لئے دست بہ دعا، سالگرہ نمبر ہمارے سامنے ہے انجوائے کر رہے ہیں۔ قرآن کی باتوں سے ایمان اور ہی بہت سوں کا ایمان تازہ ہوا۔ خطوط میں خالد صاحب کے خیالات سے متفق ہیں ساجدہ راجہ، صاحبہ کے چچا، ناصر محمود فرہاد کے والد، محسن عزیز حلیم کے دوست کی والدہ، کا پڑھ کر بہت صدمہ ہوا۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے اپنے بچھڑ گئے ہم نے یتیمی دیکھی ہے ماں باپ کی محبت نہ دیکھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ جانے والے چلے جاتے ہیں ان کی یادیں رہ جاتی ہیں ہم دعا گو ہیں ہم مرکز میں بھی اجتماعی دعا کرائیں گے۔ زندہ صدیاں، راحت صاحب نے آغاز تو دلچسپ کیا ہے دیکھتے ہیں رولو کا اور عشق ناگن کی طرح ڈر میں جگہ بنا پائے گی۔ امید ہے ڈر کے تمام ساتھی مجھ سمیت خوش آمدید کہیں گے سالگرہ نمبر کو سالگرہ کی تعریف میں بلقیس خان کی غزل کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

☆☆ شرف الدین صاحب: ہر ماہ آپ کا قلبی لگاؤ کو پڑھ کر دلی خوشی ہوتی ہے یہ حقیقت ہے کہ جانے والے چلے جاتے ہیں اور ان کی یادیں دل کو مسوستی رہتی ہیں۔ خیر جی اللہ ہم سب پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ آئندہ ماہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

محمد قاسم رحمان ہری پور سے، السلام علیکم! ڈر کی سالگرہ آئی اور چلی گئی۔ ڈر نے سولہ بہاریں دیکھ لیں بہت مبارک ہو۔ میرا خط بہت کاٹ چھانٹ کر شائع کیا گیا تھا۔ نئے آنے والے دوستوں کو تہہ دل سے ویلکم ان ڈر۔ آپی

ساجدہ آپ کے چاچو کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا۔ ناصر بھائی آپ پر جو المناک حادثہ گزر چکا ہے۔ اس کا بہت دکھ ہے۔ بلاشبہ زندگی میں والدین کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ ایم اے راحت کی نئی تحریر زندہ صدیاں اچھی ہے۔ لیکن سنہری تابوت جیسی کہانی نہیں، انوکھی ہمدردی اور لفٹ بہت زبردست تھی۔ ساحل دعا بخاری نے جب بھی لکھا زبردست لکھا۔ رولو کا از دی بیسٹ، شہزادہ چاندزیب عباسی اس مرتبہ آپ کی کہانی اچھی تھی۔ عشق ناگن ٹھیک نہیں ہے باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔ نئی کہانی بہت جلد ارسال کردوں گا۔ اب اجازت شب وروز ڈر کی ترقی کے لیے دعاگو۔

☆☆ قاسم صاحب: دل کی گہرائیوں سے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تھینکس آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ نوازش نامے کا آئندہ ماہ بھی انتظار رہے گا۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے، السلام علیکم امید ہے کہ ڈر سے وابستہ تمام افراد پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہوگا اور اللہ تعالیٰ پورے پاکستان کو اپنے امان میں رکھے (آمین) اکتوبر کے شمارے کے لئے اب کی بار مجھے پیدل نہیں آنا پڑا کیونکہ ہم شاپنگ کرنے کے لئے ٹھینگ موڑ گئے تھے اور وہیں سے ڈر خرید لیا سرورق پر قاتل حسینہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی عطیہ زاہرہ پہلے کی طرح اب بھی بیسٹ رہیں ساجدہ راجہ میرے خیال میں آپ واقعی کوئی بھٹکی ہوئی آتما ہو تبھی تو اتنا اچھا لکھتی ہو ساحل صاحبہ یہ کیا آپ کے ساتھ سچ مچ لفٹ والا واقع ہوا تھا۔ پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو گئے، عینی کے لئے شگفتہ ارم درانی نے کمال کردیا۔ زندہ صدیاں پہلی قسط تو Best تھی آگے پتہ چلے گا اور باقی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں خط شائع کرنے کے لئے Thanks

☆☆ محسن عزیز صاحب: قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ امید ہے ہر ماہ ڈر ڈائجسٹ سے قلبی لگاؤ کا ثبوت خط لکھ کر دیتے رہیں گے اور اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔

فلک فیضان رحیم یار خان سے، ڈر ڈائجسٹ اور تمام پیارے قارئین کو نیک تمنائیں اور ڈھیروں آداب، اکتوبر کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ سرورق اچھا لگا۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملا۔ کہانیوں میں بالترتیب۔ آخری اچھا، سب سے پہلے پڑھی ایک اچھوتی تحریر تھی۔ لفٹ، دعا سسٹرز، کی ہمیشہ کی طرح ایک منفرد کہانی تھی۔ شہزادہ چاندزیب عباسی کی کہانی کالی چڑیل اچھی تھی۔ ایس امتیاز احمد ہمارے ڈر کی شان ہیں، ان کی کہانیاں ایک الگ ٹاپک پر ہوتی ہیں۔ قبر کی چوری بھی دلچسپ تحریر تھی۔ اس کے علاوہ رولو کا، عشق ناگن، سفید حویلی، روح کا راز، جادوئی چکر، سب کہانیاں اچھی لگیں خدائے بزرگ و برتر ہمارے وطن کی حفاظت فرمائے اور ڈر کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین

☆☆ فلک صاحب: ہر ماہ آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوتی ہے امید ہے کہ ہر ماہ آپ اسی طرح نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیتے رہیں گے۔

طاہر اسلم بلوچ سرگودھا سے، السلام وعلیکم سب سے پہلے میری طرف سے ڈر ڈائجسٹ کے تمام اسٹاف ڈر کے لکھاری نئے اور پرانے قارئین کو مسکراہٹوں بھرا محبتوں بھرا اسلام۔ میر طرف سے میری کہانی سچا عاشق پسند کرنے والوں کو میری طرف سے بہت بہت شکریہ میں کچھ کامیڈین شاعری بھی بھیج رہا ہوں پلیز نومبر والے شمارے میں ضرور شائع کریں باقی آج مورخہ 29-09-2014 کو میری شادی ہے آج شام کو میری بارات ہے گھر میں مہمانوں کا خوب رش ہے۔ کافی ہلہ گلہ ہے لیکن میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنے پیارے ڈر ڈائجسٹ کے لیے تحریریں لکھ رہا ہوں آپ پھر دیکھ لیں میں اپنی قیمتی مصروفیات چھوڑ کر اپنے ڈر ڈائجسٹ کی لیے پیاری پیاری کاوشیں لکھ رہا ہوں۔ پھر آپ کو بھی چاہیے کہ میری تحریریں ضرور شائع کریں Thanks میری طرف سے تما ڈر اسٹاف اور تمام پڑھنے والے قارئین کو میری طرف سے سلام قبول ہو۔

☆☆ طاہر صاحب: سب سے پہلے تو ادارے اور تمام قارئین کی طرف سے شادی مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام خوشیوں سے نوازے۔ آپ کی محبت ڈر ڈائجسٹ سے قابل دید ہے کہ شادی کے دن بھی آپ نے خط تحریر کیے اس کے لئے ویری ویری تھینکس۔

☆☆☆

محبت کی بازی

محمد خالد شاہان۔ صادق آباد

عامل نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر جب کمرے میں ایک طرف پھونک ماری تو چشم زدن میں ایک خوفناک بپھرا ہوا جن نمودار ہوا اور آتے ہی آناً فاناً عامل کو گردن سے پکڑ کر اوپر کو اٹھالیا اور پھر......

دل کے ہاتھوں بے سکون، بے چین اور بے قرار ایک جن کی روداد عشق۔ پر اسرار کہانی

رات بڑی تاریک تھی اور ایک ایک پل کر کے گزر رہی تھی، وقفے وقفے سے چوکیدار کی ”جاگتے رہو جاگتے رہو“ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور پھر بادل کا آوارہ ٹکڑا آتا اور دھیمی رفتار سے گزرتا چلا جاتا۔

اچانک کمرے میں گونجنے والی شامین کی چیخ اس قدر دہشت ناک تھی کہ اگر کوئی سن لیتا تو ایک لمحے کو سہم کر لرزہ براندام ہو کر جھٹکے سے زمین پر گر جاتا۔

شامین کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں وہ بستر پر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا اور جسم پر کپکپی طاری تھی۔

اچانک اس کی نگاہ اپنے پاؤں کے انگوٹھوں پر پڑی جو خون میں لتھڑے ہوئے تھے، خون کی پتلی سی دھار اپیروں کے تلووں سے ہوتی ہوئی بستر کی چادر اور گدے میں جذب ہو رہی تھی کمرے میں نائٹ بلب کی مدہم روشنی اتنی تھی کہ پیروں سے بہنے والے خون کی رنگت سرخ کی بجائے سیاہ لگ رہی تھی۔

اس وقت اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے دل اس کے سینے کی بجائے کنپٹیوں میں دھڑک رہا ہو اس نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی اور کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہو گئی کہ اچانک اسے کھنکھناتی ہوئی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ عام حالات میں شاید اس قدر مسحور کن ہنسی کی آواز اسے بے اختیار اپنی طرف متوجہ کر لیتی یا شاید وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتی۔

مگر اس وقت وہ خوف اور حیرانگی کی ملی جلی کیفیات میں مبتلا تھی اس نے خوف زدہ ہو کر آواز کی سمت نظر دوڑائی مگر کیا؟ وہاں تو صرف دیوار تھی اس کے اپنے کمرے کی دیوار جس پر ایک سایہ تھا، جس نے اس کی زندگی کو عذاب مسلسل میں مبتلا کر دیا تھا۔

ہنسی کی آواز بدستور جاری تھی۔ اور اسی سائے سے آرہی تھی اس دشمن جاں کا سایہ آہستہ آہستہ دیوار پر پھیل رہا تھا، شامین کی نگاہ بھی اس کے تعاقب میں تھی اچانک وہ سایہ کھڑکی کے راستے باہر نکلا اور پھر غائب ہو گیا۔

شامین نڈھال ہو کر بستر پر گر گئی۔ اپنے اعصاب پر قابو پانے کے لیے اس نے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیئے۔ اس کی آنکھوں سے اب آنسو رواں تھے مگر یہ آنسو بزدلی کے نہیں تھے بلکہ اس کی بے بسی کے تھے کیو ں کہ اس کا مدمقابل کوئی انسان نہیں بلکہ وہ ایک ایسی مخلوق تھی جو صنف نازک ہو کر بھی اسے دکھوں کے چرکے لگا رہی تھی اس نامعلوم بلا سے پیچھا چھڑانا اس کے بس میں نہ تھا، ”وہ کون تھا کیا چاہتے تھا؟“ یہ سب اسے

کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑا ہے، وہ یہ سب جاننے کی خواہش بھی نہیں رکھتی تھی، اس کی خواہش تھی تو فقط اتنی کہ اس سایہ سے اس کا پیچھا چھوٹ جائے۔ وہ بستر پر چت لیٹی چھت کو گھورے جا رہی تھی پچھلے ایک ہفتہ سے ہونے والے اس عجیب وغریب واقعات کی فلم اس کے دماغ میں چل رہی تھی

ابھی ایک ہفتہ قبل ہی تو اس نے اس سحر آفریں کو خواب میں دیکھا تھا وہ اسے اپنی جانب توجہ کرنے کے لیے کوشاں تھا مگر وہ تھی کہ اس پر سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی گریزاں تھی۔

آخر اس سایہ نے اپنے تذلیل کا بدلہ اس طرح لیا کہ اپنی انگلی کا رخ اس کی دائیں ٹانگ کی جانب کیا پھر ایسا لگا جیسے اس کی پنڈلی میں آگ لگ گئی ہو، درد کی شدت سے اس کی آنکھ کھل گئی، اسے اپنی ٹانگ سے آگ کی حدت نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ جب اس نے اپنی ٹانگ کی جانب دیکھا تو اسے حیرت کا ایسا جھٹکا لگا کہ اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس کی شلوار کا دایاں پائینچہ گھٹنے تک جل چکا تھا اور پھر اسے وہی سایہ اپنے کمرے کی دیوار پر منڈلاتا ہوا نظر آیا، اس کے بعد سے اس منحوس سائے نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور آج ایسا پانچویں بار ہو رہا تھا۔ ہر بار وہ ایک نئے انداز میں نمودار ہوتا اور شاہین کے لیے تکلیف کا ایسا سامان کر جاتا جس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا

گزرتے واقعات اور آنے والے خطرات نے شاہین کے دماغ میں عجیب وغریب جال بنا دیا تھا۔ انہیں خیالوں میں نہ جانے کب وہ نیند کی خوبصورت وادی میں جا پہنچی۔

اس کی آنکھ تب کھلی جب ٹیبل پر رکھی گھڑی نے زور زور سے چھ بجنے کا اعلان کرنا شروع کیا۔ رات کے واقعات نے اس کے دماغ کو ابھی تک ماؤف کر رکھا تھا اس نے اتنا لکھنے کے بعد قلم بند کیا، کاغذ سمیٹ کر ایک جانب رکھے اور آرام کی خاطر بستر پر دراز ہو گیا اور سوچا کہ اب سہ پہر کے بعد ہی اٹھے گا اور شام کی چائے پی کر حیدر صاحب کے گھر کی راہ لے گا جو کہ اس کے پڑوس میں رہتے تھے۔

یہاں میں آپ کو اپنے بارے میں بتاتا چلوں میرا نام شاہان ہے میں ایک ریٹائرڈ فوجی ہوں اور اس وقت اپنی عمر کے پچاسویں برس میں داخل ہو چکا ہوں میں ایک خوشحال زندگی بسر کر رہا ہوں میرے کل کائنات میں دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے جبکہ شریک زندگی مجھے زندگی کی راہوں میں تنہا چھوڑ کر راہئ عدم ہو چکی ہے اور گزشتہ دس برس سے میں زندگی کی خارزار میں تنہا گامزن سفر ہوں۔ مجھے آج بھی اس نیک بخت کی کمی محسوس ہوتی ہے جو ہمیشہ میری راہوں سے خار چنتی رہی تھی۔

اللہ کے فضل سے اولاد سعادت مند ہے بیٹی کی شادی ہو چکی ہے اور اس کی بھی ایک پیاری سی بیٹی ہے بیٹے بھی شادہ شدہ ہیں بہوویں اس قدر نیک اور فرمانبردار ہیں کہ کبھی بیٹی کی کمی محسوس نہیں ہوئی اگرچہ بیٹوں نے فوج کا شعبہ اختیار نہیں کیا لیکن مجھے اطمینان ہے کہ ان کا کاروبار مستحکم ہے اور دونوں بھائی مل کر اسے چلا رہے ہیں۔

بڑے بیٹے کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے جو بالترتیب دسویں اور آٹھویں جماعت میں پڑھتے ہیں چھوٹے بیٹے کا بس ایک بیٹا ہے جو نویں جماعت میں پڑھتا ہے اس لحاظ سے میں ایک خوش قسمت انسان ہوں اگر کوئی کمی ہے تو اپنی نیک بخت بیوی کی۔ فوجی اور ناول نگاری اگرچہ عجیب لگتا ہے مگر شوق کے آگے سب کچھ ممکن ہے اب تو مجھے ناول نگاری کے حوالے سے کافی شہرت بھی مل چکی ہے اور اکثر پڑھنے والوں کو تو میرے آئندہ ناول کا شدت سے انتظار بھی رہتا ہے

میرا شعبہ تحریر خوفناک اور مافوق الفطرت ناول لکھنا ہے اور یہی حوالہ میری شناخت ہے، مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ میں ڈراؤنے ناول کیوں لکھتا ہوں، شاید کوئی غیر مرئی قوت ہے جو مجھے ایسا لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

یہ تھیں میرے بارے میں چند خاص خاص باتیں جو میں نے بتا دیں۔

خیر میں وقت پر حیدر صاحب کے پاس گیا اور حسب روایت شطرنج کی بازی لگ گئی۔ ساتھ ہی ساتھ حالات حاضرہ پر بحث بھی ہوتی رہی شطرنج کے بعد میں ان سے رخصت ہوا اور گھر کی راہ لی حسب عادت کچھ وقت اپنے بچوں اور پوتے پوتیوں کے ساتھ گزار کر اپنے کمرے میں آیا اور ادھورا ناول مکمل کرنے بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

شامین رات والے واقعے سے پہلے ہی بہت پریشان تھی اس پر ایک اور پریشانی اس کی منتظر تھی صائم جو اس کی کلاس فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا منگیتر اور محبت بھی تھا اس نے کئی بار اس کی پریشانی کا سبب پوچھ چکا تھا مگر شامین تھی کہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے پا رہی تھی۔

اس وقت بھی شامین اور صائم لائبریری میں بیٹھے ہوئے تھے جب ایک اور مصیبت آن پہنچی یہ مصیبت شاہد تھا جو یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس یونین کا سرگرم رکن تھا۔ شامین کو اس سے خدا واسطے کا بیر تھا اس کی ان حرکتوں سے شامین بھی عاجز آئی ہوئی تھی مگر وہ کمینے پن کا جواب شرافت سے دینے کا قائل تھا دو دن قبل انجم نے بدتمیزی کی انتہا کر دی تھی مگر شامین نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور بات آگے بڑھنے نہ دیا۔ اس روز تو شاہد سنگین نتائج کی دھمکیاں دیتا ہوا چلا گیا تھا مگر آج وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ اسی کی طرح کے دو غنڈہ نما ساتھی تھے، اس نے آتے ہی پینٹ میں اڑسا ہوا ریوالور نکالا اور شامین کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

شامین خاموش تھی لیکن ان سے ڈر نہیں رہی تھی۔ شامین بھی یونیورسٹی ویمن کراٹے ٹیم کی لیڈر تھی اس نے ایک نگاہ میز پر رکھی ریوالور پر ڈالی اور پھر غور سے شاہد کے چہرے کو دیکھا۔

شاہد حقارت آمیز لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

''کیوں جی کچھ اثر ہوا میری باتوں کا۔''

شامین نے کوئی جواب نہ دیا۔

شامین کی خاموشی شاہد کو مزید اشتعال دلا رہی تھی اس نے مٹھیاں بھینچ لیں اور بولا۔ ''تمہاری خاموشی میں ہی تمہاری بھلائی ہے یاد رکھو جس دن زبان چلانے کی کوشش کی تو اس دن تمہاری زبان کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی ہتھیلی کی طرف اشارہ کیا اور میز پر زور سے ہاتھ مار کر واپس چل دیا اس کے ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی۔

شامین واپس جاتے ہوئے ان تینوں کو گھور رہی تھی صائم نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔''

شامین خاموش رہی اور کہا۔ ''صبر کرو۔''

''صبر کس بات کا، صبر وبر مجھ سے نہیں ہوتا۔''

اچانک صائم نے کرسی پر ایک سائے کو دیکھا پھر وہ سرکتا ہوا زمین پر اترا اور انتہائی جارحانہ انداز سے شاہد اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے لپکا۔ سائے کی رفتار اور شاہد کی طرف رخ تینوں اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ آج شاہد کی خیر نہیں۔

سایہ شاہد سے ٹکرایا مگر وہ محسوس نہ کر سکا شاہد ہر طرح سے محفوظ تھا۔

وہ حیرت سے شامین کو دیکھ رہا تھا بلکہ لائبریری میں موجود ہر شخص شامین کو حیرت سے دیکھ رہا تھا اور شامین اپنی جگہ پر کھڑی جیسے لرز رہی تھی اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا، اس کے وجود کی کپکپاہٹ واضح طور پر نظر آ رہی تھی کچھ دیر یہی حالت رہی پھر آہستہ آہستہ شامین کی حالت سنبھل گئی اور وہ کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

شاہد جانے کیا سوچ رہا تھا اور پھر مسکراتے ہوئے واپس مڑا اور لائبریری سے نکل گیا۔

شامین بے بسی سے سر پکڑے ہوئے تھی اس کے ساتھ پریشان حال صائم بیٹھا تھا جسے کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا۔

اس کے حسین چہرے پر پریشانی کے آثار اس کے حسن کو اور بھی زیادہ سحر انگیز بنا رہے تھے۔

صائم کا چہرہ اس کے لیے ایک ایسا سوالیہ نشان تھا جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا وہ انجانی سوچوں

میں گم تھی۔

شاہد نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا اور کھلکھلا کر ہنس دیا اس وقت وہ یونین آفس میں براجمان تھے، ان کی تعداد شاہد سمیت بیس کے لگ بھگ تھی، شاہد باقی لڑکوں کو شامین کے بارے میں شاید کچھ بتا رہا تھا کہ اچانک ایک انجانی مگر پراسرار آواز سنائی دی۔ "اب تمہاری باری ہے چیخنے کی" اور پھر واقعی شاہد کے منہ سے اس قدر زوردار چیخ نکلی کہ سب ہکا بکا رہ گئے

شاہد سے چند قدم کے فاصلے پر ایک خوفناک بلا کھڑی تھی، وہ بلا کوئی اور نہیں بلکہ وہی جن تھا جو کہ شامین کے خواب میں آیا تھا، اس کا سیاہ لباس اس طرح لہرا رہا تھا جیسے تیز آندھی میں ہو، اس کا رنگ گورا تھے مگر اس کے سفید ہاتھوں پر نوکیلے سیاہ ناخن دہشت کا منہ بولتا ثبوت تھے اچانک اس نے منہ کھولا اور پھر دل ہلا دینے والا وہ منظر سامنے آیا جس نے شاہد کے ہوش اڑا دیے اس کے منہ سے نوکیلے دانت نمودار ہورہے تھے جو دیکھتے ہی دیکھتے ہونٹوں کے کناروں سے باہر آگئے۔

اس خون آشام منظر کو دیکھ کر تو مضبوط دل کا انسان بھی ہوش سے بے گانہ ہو جاتا بے چارہ شاہد کیا چیز تھا۔

شاہد ڈرتے ہوئے بولا۔ "کک......کون...... کون ہوتم؟" جواب ملنے سے پہلے ہی شاہد کے ساتھی حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگے اور پھر ایک پوچھ ہی بیٹھا ۔"یار کون ہے کس سے بات کررہے ہوتم۔"

شاہد نے اس کی طرف دیکھے بغیر انگلی سے اشارہ کیا۔

"یہ لڑکا سیاہ لباس والا۔" اس کی اٹھی ہوئی انگلی مسلسل لرز رہی تھی۔

"مگر یہاں تو کوئی نہیں۔" اس کے دوستوں نے جواب دیا کہ شاہد کی نگاہ ایک لمحہ کے لیے دوستوں کی جانب اٹھی اور پھر دوسری طرف مڑگئی۔

صورت حال کافی حد تک اس پر عیاں ہو چکی تھی اگلے لمحے منظر بدل چکا تھا سایہ نے ایک ہاتھ کرسے لگایا اور پھر جھٹکے سے شاہد کی جانب سیدھا کیا۔

تو شاہد کو ایک جھٹکا سا لگا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ ہوا میں اچھلتا ہوا میزوں کے پیچھے جا گرا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی پہلوان نے اسے اٹھا کر پٹخ دیا ہو۔

شاہد میز پر چت گرا ہوا تھا اور اس کے دوست اس کے گرد جمع تھے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا، ایسے میں ایک لڑکے نے شاہد کا بازو پکڑ کر ہلانا چاہا، بازو کا پکڑنا تھا کہ شاہد کو درد کا شدید جھٹکا لگا اور اس کے ساتھ ہی اسے چھونے والا لڑکا دور جا گرا اور بے ہوش گیا۔

آفس میں بیٹھے بھی لڑکے سہمے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ شاہد کی مدد تو دور کی بات کسی میں اتنا حوصلہ بھی نہ تھا کہ کمرے سے باہر نکل جائے، خوف کے مارے ان کی زبانوں سے کلمے اور آیت الکرسی کا ورد جاری ہو گیا تھا۔

شاہد میز پر چت گرا ہوا تھا اور وہ سایہ بالکل اس کے اوپر ہوا میں معلق تھا اس کی دہشت سے شاہد کو اپنا دل اپنی کنپٹیوں میں دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سایہ نے اپنے ہاتھ اس کے چہرے کی طرف کر کے واپس موڑا ۔شاہد کی زبان منہ سے خود بخود باہر نکل پڑی اس کی لاکھ کوشش کے باوجود زبان منہ میں نہیں جا رہی تھی، ہوا میں معلق سایہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنا شروع کیا تو شاہد کے جبڑے خود بخود بھنچنے لگے، یہاں تک کہ اس کے دانت اس کے جبڑے بھی مضبوطی سے ملتے گئے یہاں تک اس کی زبان کٹ کر زمین پر جا گری، زبان سے بہنے والا خون گردن کے دائیں بائیں سے گرتا ہوا زمین پر جمع ہونے لگا۔

اس پر بھی اکتفا نہ ہوا اب انجم کی آنکھیں حلقوں سے باہر آرہی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے کوئی زور سے اس کا گلا دبا رہا ہو، اس نے اپنے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی مگر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی زور سے اس کا گا دبا رہا ہو اس نے اپنے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی مگر ایسا لگتا تھا جیسے اس کے ہاتھ میز سے چپک گئے ہوں۔

اسی لمحے سایہ نے اپنا منہ کھولا تو ایک عجیب سی

غراہٹ کی آواز سنائی دی۔

شاہد کا دل شاید تشدد برداشت نہ کرسکتا تھا اس لیے اس لمحے حرکت کرنا بھول گیا اس کی دہشت سے کھلی آنکھیں بے نور ہوکر پتھرا گئیں اور گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی، اس کے چار ساتھی اس خوفناک منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے دھڑام دھڑام گرے اور بے ہوش ہوگئے، جو ہوش میں تھے سر پر پیر رکھ کر بھاگے اسی لمحے سایہ کا خوفناک قہقہہ بلند ہوا۔

اگلے لمحے اس کی شکل بدل چکی تھی وہ سنہرا لباس زیب تن کیے ہوئے ایک جن کے روپ میں تھا اس کا متناسب بدن بجلیوں کا خرمن معلوم ہوتا تھا۔

مگر اس کا چہرہ دیکھنے والا وہاں کون تھا۔ ایک لاش جو بدصورتی کی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور چار بے ہوش افراد جن کے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہ تھا، وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"میں حسن ہوں آنکھوں کو روشنی بخشنے والا۔ دل پر بجلی گرادینے والا۔"

میں طویل سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ قلم بند کیا اور نامکمل ناول کے اوراق اکٹھے کیے، رات کافی بیت چکی تھی چنانچہ میں نے لائٹ آف کی اور سونے کی نیت سے لیٹ گیا۔

☆......☆......☆

کسی قوم کی ترقی کی رفتار جانچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس قوم کے نوجوانوں کی سرگرمیوں کا مطالعہ کیا جائے، میں جب بھی اخبار پڑھتا، تو نوجوانوں کے بگڑے ہوئے اخلاق کا حال پڑھ کر میرا دل اندر ہی کڑھتا اپنے ناولوں کے ذریعے میں نے نوجوانوں کی اصلاح کی کوشش کررہا تھا۔

آج صبح جب میں نے حسب معمول اخبار کا مطالعہ کیا تو ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔

یونیورسٹی کی طلبہ تنظیم کے اہم اور سرگرم رکن کی ہلاکت کی خبر نمایاں تھی جس کے بارے میں لکھا گیا تھا کہ مرنے والے کا نام شاہد تھا اور شک یہ تھا کہ مخالف تنظیم کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔

اس خبر نے صبح ہی صبح مجھے افسردہ کردیا تھا میں اس خیال کو بھلانے کے لیے حیدر صاحب کی طرف چل دیا، حیدر صاحب نے حیرت سے مجھے دیکھا اور خیریت دریافت کی، میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"بس حیدر صاحب آج کل کی نوجوان نسل جس راہ پر چل نکلی ہے اس کی پریشانی نے جی متلا دیا ہے، آج صبح کی خبر پڑھی آپ نے۔" حیدر صاحب چونک کر بولے۔

"کیسی خبر کس کی خبر۔"

"شاہد کی بات کررہے ہیں ناں انکل آپ۔" یہ آواز شامین کی تھی جو میرے عقبی جانب موجود دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی تھی، اس کے پیچھے اس کا چھوٹا بھائی ندیم اور ساتھ ہی صائم بھی تھا۔

صائم حیدر صاحب کے پڑوس میں رہتا تھا۔ اس کے والد رانا صاحب بہت نیک آدمی تھے انہیں کی خواہش پر شامین اور صائم کی شادی طے پائی تھی مگر موت کب انتظار کرتی ہے اور رانا صاحب دل کے ایک ہی دورے میں جان دے بیٹھے۔

شامین اور صائم کو دیکھ کر میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی، ایک وجہ تو یہ تھی کہ مجھے ان بچوں سے بہت محبت تھی دوسری وجہ یہ کہ یہ میرے زیر تکمیل ناول کے مرکزی کردار تھے۔ ناول کے کردار پر تراشتے ہوئے یہی میری سوچ کا مرکز تھے مگر میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرے قلم کا لکھا ہوا ایک ایک لفظ ان کی زندگی کے لئے اہم ہوسکتا ہے، یہی وجہ تھی کہ جب بھی میں انہیں دیکھتا تو بے اختیار میرے منہ سے ان کے لیے دعائیہ کلمات نکل جاتے خیر میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا میں اسی کی بات کررہا ہوں۔" شامین افسردگی سے بولی۔ "جی انکل اس کے ساتھ بہت برا ہوا بلکہ وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔" یہ جملہ کمرے میں موجود کسی شخص نے نہ سنا سوائے شامین کے۔

اس نے آواز کی سمت جھٹکے سے دیکھا تو اس کے

منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”بکومت۔“ اس جملے پر سب لوگ حیرت سے اس کی جانب تکنے لگے مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

”یہ تم کس سے مخاطب ہو؟“

”کسی سے بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

”کمال ہے۔“ حیدر صاحب نے کہا ندیم تو دوسری جانب ہے؟“

میں نے شاہین کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرتے دیکھیں۔

ادھر صائم بھی کہہ رہا تھا۔ ”آج کل انہیں جانے کیا ہوگیا ہے کہ عجیب وغریب حرکتیں کرنے لگی ہیں۔“

”کیوں بھئی۔“ حیدر صاحب گویا ہوئے، پھر شاہین ہنس کر بولی، کچھ نہیں پاپا ویسے ہی یہ تو پریشان ہو جاتے ہیں۔“

حیدر صاحب ہنس کر بولے ”دیکھئے شاہان صاحب اب بچے بھی ہم سے مزاق کرنے لگے ہیں۔“

وہ تو سلام کر کے باہر چل دیئے میں اور حیدر صاحب ادھر ادھر کی باتوں میں مشغول ہوگئے کچھ دیر بعد میں نے واپسی کا قصد کیا مگر حیدر صاحب اب شطرنج کھیلنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر میں شام کا وعدہ کر کے گھر لوٹ آیا۔

شاید ناول کا نامکمل مسودہ مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا، میں بے اختیار رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا اور اپنے خیالات کو قلم کے سپرد کرنے لگا۔

شاہد کی موت نے شاہین کے اعصاب کو مزید بوجھ تلے دبا دیا تھا اس کی چڑچڑی طبیعت نے صائم کو بھی پریشان کر دیا تھا۔

ایک الجھن تھی جو خود بخود وجود میں آ گئی تھی شاہین کوئی کم حوصلہ یا بزدل لڑکی نہیں تھی مگر مدمقابل اس کے سامنے ہوتے ہوئے بھی سامنے نہ تھا اس کا دماغ کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا اب تو بات اس قدر بڑھ چکی تھی کہ ایک انسانی جان ضائع ہو چکی تھی اور تین چار جانیں مزید زندگی اور موت کے درمیان معلق تھیں۔

شاہد کی موت اس قدر عجیب وغریب حالت میں ہوئی کہ دل دماغ یقین نہیں کر رہا تھا مگر یہ سچ تھا! کسی ہلاکت ایسے قاتل کے ہاتھوں ہوئی جو نگاہوں کے سامنے ہو کر بھی پوشیدہ تھا دوسری طرف لاشوں کی سیاست کرنے والے شاہد کی موت کو مخالفین کے سر تھوپ رہے تھے۔

شاہین کو حالات کسی بھی صورت میں بنتے نظر نہیں آ رہے تھے

شاہین سوچ رہی تھی کہ صائم کو سچ سچ بتا دے تاکہ ایک الجھن تو کم ہو، وہ یہ بھی جانتی تھی کہ صائم اس سے کس قدر محبت کرتا ہے اور یہ سب جان کر اس کی پریشانی اور بھی بڑھ جائے گی اور صائم کی موجودہ کیفیت بھی تو اس کے لیے باعث اذیت تھی۔

شاید ساری صورت حال جان لینے کے بعد وہ کوئی مفید مشورہ ہی دے دے یا کم از کم اس کی ڈھارس تو بندھ جائے گا لہٰذا اس امید کے ساتھ شاہین نے سب کچھ صائم پر واضح کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت وہ پائیں باغ میں اکیلی گھاس پر بیٹھی سوکھے تنکوں کو توڑ توڑ کر اپنی پریشانی کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اسی لمحے وہی منحوس آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”جھلانے سے کوئی فائدہ نہیں آخر تمہیں میرا ہونا ہی ہے۔“ شاہین نے چونکتے ہوئے پیچھے دیکھا تو وہی دشمن جاں حسن کی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ نظر آیا

شاہین نے دیکھا تو بس! ایک لمحہ کے لیے ایسے ایسا محسوس ہوا جیسے کائنات کا تمام حسن ایک بت میں سمٹ آیا ہو۔ اس کی بدحواسی اس کا سراپا حسن جذبات کی راہیں ہموار کر رہی تھیں، شاہین نے محسوس کیا کہ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا ہا اس کے جذبات اس جن پیکر کو قریب پا کر واقعی بے قابو ہو رہے تھے

اسے یوں لگا جیسے اس کا دل اسکے قرب کی خواہش میں دیوانہ وار اس کی طرف بھاگ رہا ہو شاید اس کے قدم بھی دل کا ساتھ دے رہے تھے ایک طلسم تھا جو اسے حسین دشمن کی جانب لے جا رہا تھا۔

شاید وہ بھی اس کی کیفیت کو سمجھ چکی تھی وہ جھکتے ہوئے بولی۔

میں تمہاری ہوں تمہارے قریب شاید سانسوں سے بھی زیادہ قریب اور تم یوں بے اعتنائی برت رہے ہو کیا تم مجھے اپنا بنالو گے۔'' اتنا کہہ کر اس نے اپنی خمار سے بوجھل پلکیں اٹھائیں۔

اس کی نگاہوں کا شامین سے ملنا تھا کہ شامین کے ہوش اڑ گئے وہ بے خودی کے عالم میں ایک معمول کی طرح اس طرح اس کی طرف بڑھتی جارہی تھی کہ آج وہ اپنا سب کچھ کھو کر اسے پالے گی، شامین بھی شاید اس سحر انگیز حسن کی روشنی میں صائم کی پاکیزہ محبت کو نظر انداز کیے دے رہی تھی۔

وہ اس جانب بڑھتا چلا گیا اس قدر کہ اسے ہوش نہ رہا اور سانسوں کی گرمی اسے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگے مگر شاید اس کی منزل ابھی بہت دور تھی۔ شامین نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا ہی تھا کہ عقب سے ندیم کی سکوت توڑتی ہوئی آواز آئی۔

بھائی جان اور وہ بے اختیار ر پیچھے کی جانب پلٹی جہاں ندیم کھڑا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

ندیم کو دیکھتے ہی شارق نے واپس اس جگہ دیکھا جہاں شاید صائم سے اس کی محبت رسوا ہونے کے قریب تھی۔

اب وہاں کچھ نہ تھا صرف ایک سایہ تھا اور وہ جو شاید شامین کو ہمیشہ کے لیے پالینے والا، شارق نے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا مگر اس کے پاس اگلے موقع کی تلاش کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

شامین نے ندیم سے پکارنے کی وجہ پوچھی تو شارق بولا۔ ''صائم بھائی آئے ہیں وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔''

شامین طویل سانس لے کر اٹھی اور اندرونی حصے کی جانب مڑ گئی۔

اچانک اسے اپنے عقب سے آواز سنائی دی۔

''کوئی بات نہیں پھر سہی چلو تم نے مجھے قبول تو کیا اب تم میری ہو اور میری ہی رہو گی۔''

شامین نے خاموشی سے سنا اور پھر اندر چلی گئی۔

وہ سایہ بھی دیوار پر سرکتا ہوا ایک سمت بڑھنے لگا شاید یہ بات تو اس سائے کو بھی معلوم نہ تھی کہ ندیم تو وہیں کھڑا ہے اور اسے دیوار سے سرکتے ہوئے دیکھ رہا ہے اس نے ایک طویل سانس لی وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا اور پھر اندر کی جانب چلا گیا اس کے چہرے پر مکمل سکون تھا وہی سکون جو ہمیشہ سے اس کے چہرے پر موجزن رہتا تھا۔ ندیم کوئی معمولی بچہ نہیں تھا اس کی عمر لگ بھگ پندرہ سال تھی وہ عام بچوں سے کافی مختلف تھا اس کے پیدا ہونے سے قبل اس کی ماں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک بزرگ نے ایک بچہ اس کی گود میں دے کر فرمایا۔ ''یہ بچہ ان کی طرف سے تحفہ ہے اور اس بچے کی تربیت اور پرورش وہ خود کریں گے۔'' پھر ایسا ہی ہوا ندیم تو بچپن سے ہی عجیب و غریب عادات کا مالک تھا اسی لیے وہ سب سے الگ تھلگ رہتا تھا، وہ عام بچوں کی طرح شریر بھی نہیں تھا اس کا رجحان اسلامی تعلیمات کی طرف تھا دس سال کی عمر میں وہ حافظ قرآن ہوگیا، اس کی کم گوئی کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی روز زبان نہ کھولتا البتہ صائم سے اس کی خوب بنتی تھی تاہم دینی امور پر اس کی معلومات اس قدر وسیع تھیں کہ اچھے اچھوں کا کان کاٹتا، حد تو یہ کہ بڑے بڑے اس کے دلائل سن کر دانتوں تلے انگلیاں دبا لیتے۔

یہ تھا ایک نیا کردار جسے میں نے ناول میں متعارف کروایا تھا۔

میں نے مسودہ سنبھال کر اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور حیدر صاحب کے بیٹے شارق کے بارے میں سوچنے لگا میرے ناول کا ندیم بھی بالکل حیدر صاحب کے شارق جیسا تھا فرق تھا تو صرف حالات کا وہ یہ کہ میرے ناول کے شامین اور شارق پر اسرا حالات سے گزر رہے تھے جبکہ حیدر صاحب کے شامین اور ندیم خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے اور میں اس اطمینان پر خود ہی مسکرا دیا اور لائٹ آف کر کے بستر پر لیٹ گیا میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں ناول نہیں بلکہ حیدر صاحب کے گھرانے کی تقدیر لکھ رہا ہوں

شامین نہ چاہتے ہوئے بھی صائم سے سب کچھ

کہہ ڈالا صائم کا ردعمل اس کی امیدوں سے مختلف نہ تھا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے شاہین اس کے ساتھ مذاق کررہی ہو مگر شارق کے چہرے کی سنجیدگی اور لہجے کی مضبوطی اسے اس بات پر مجبور کررہی تھی کہ وہ ایک ایک لفظ سچ کہہ رہی ہے۔

اگر چہ اس ترقی یافتہ دور میں یہ باتیں گھسے پٹے مذاق سے کچھ زیادہ نہ تھیں مگر آج یہ سب صائم کے سامنے حقیقت بن کر کھڑی تھیں صائم کی جذباتی حالت قابل دید تھی اس نے زندگی میں شاہین کے سوا کسی کو نہ چاہا تھا وہی تو تھا جو اس کی زندگی کا مرکز تھا اور اس کی زندگی ایک مخصوص مدار میں شاہین کے گرد گھوم رہی تھی مگر آج ایک طوفاں تھا جو اس کی چاہت کی راہ میں حائل ہونے کے لیے اس کی محبت کے حصار میں داخل ہونا چاہتا تھا یہ سوچ کر ہی اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

شاہین اس کی زندگی تھی مگر آج اسے اپنی زندگی کی جان خطرے میں نظر آرہی تھی وہ دیر تک دنیا و مافیا سے بے خبر اس خوفناک عذاب سے نجات کی راہ تلاش کرتے رہے اچانک صائم کے دماغ کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ اچھل پڑی اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اس نے نجات کی راہ تلاش کرلی ہے۔

یونیورسٹی میں شاہین اپنی ایک کلاس فیلو علی سے بہت زیادہ قریب تھی ایک مرتبہ علی نے باتوں باتوں میں اسے بتایا کہ اس کے چچا فرہاد علی سفلی و نوری علوم کے ماہر ہیں ایک دو مرتبہ صائم کی ان سے ملاقات بھی ہوئی شاہین کی معصوم صورت اور دل موہ لینے والی عادت نے انہیں اپنا گرویدہ کرلیا تھا، مگر فرہاد علی نے اسے پیش کش کی تھی کہ زندگی میں اگر اسے کوئی ایسا مسئلہ پیش آئے تو وہ ان سے ضرور رابطہ کرے، شاید وہ اسے عملی طور پر یقین دلانا چاہتے تھے اور آج صائم کو وہ موقع مل گیا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی، فرہاد علی آنکھیں ملتے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھے ریسیور کے دوسری جانب ایک نسوانی آواز نے انہیں چونکا دیا تھا ان کی زندگی میں نسوانی آوازوں کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا لیکن یہ آواز ان کے لیے اجنبی نہ تھی۔

''ہیلو! مجھے فرہاد علی صاحب سے بات کرنی ہے۔۔''

''جی فرمایئے میں فرہاد علی بول رہا ہوں۔'' انہوں نے بارعب آواز میں کہا۔

''انکل کیا آپ نے مجھے پہچانا میں صائم بول رہا ہوں۔'' صائم نے بے قراری سے بات مکمل کی۔

''اچھا یاد آیا! تم علی کے کلاس فیلو ہو۔'' وہ بولے۔ ''کہو آج انکل کی یاد کیسے آگئی۔''

''انکل یاد ہے ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا کہ زندگی میں اگر کوئی مافوق الفطرت بات ہو تو مجھے ضرور بتانا۔'' شاہین ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔

''ہاں مگر کیا ہوا ہے؟ خدانخواستہ کوئی مصیبت تو نہیں آن پڑی۔'' فرہاد علی تشویش ناک لہجے میں بولے۔

''جی انکل مصیبت سر پر کھڑی ہے آپ فوراً آجایئے یاد ہے آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا......''

''ہاں......مگر کچھ بتاؤ تو سہی آخر مسئلہ کیا ہے۔'' فرہاد علی نے پھر استفسار کیا۔

''بس انکل آپ فوراً آجائیں باقی باتیں یہیں ہوں گی بس دیر نہ کریں، ہمارے پاس وقت نہیں۔'' شاہین نے کہا۔

''اچھا سنو! تم حوصلہ رکھو میں ابھی نصف گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔'' شاہین نے ریسور رکھا، اگلے تیس منٹ اسے تیس سالوں پر محیط نظر آرہے تھے۔

شاہین خود بے چین تھی یہ جاننے کے لیے کہ آخر صائم نے کیا راہ نکالی ہے مگر اس میں حوصلہ نہ تھا کہ صائم سے کچھ پوچھ سکے۔

صائم اور شاہین مرکزی دروازے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے ان کے کان دروازے کی سمت لگے ہوئے تھے اچانک دروازے پر دستک محسوس ہوئی تو شاہین اور صائم تقریباً بھاگتے ہوئے دروازے تک پہنچے، دروازہ کھولتے ہی صائم کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

آنے والے فرہاد علی تھے جوان دونوں کی پھرتی دیکھ کر مزید پریشان ہوگئے البتہ صائم کے چہرے پر سکون دگنا ہوگیا تھا۔

نشست گاہ میں فرہاد علی۔ صائم اور شاہین گزشتہ پندرہ روز سے ہونے والے حالات پر تفصیلی غور کر رہے تھے اچانک فرہاد علی بول اٹھے۔ ’’بچو! میں نے اگرچہ شیطانی علوم چھوڑ دیے ہیں اور ہر روز اللہ سے اپنی کوتاہیوں پر گڑگڑا کر معافی مانگتا ہوں لیکن آپ لوگوں کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے آخری بار اس علم کو استعمال کروں گا شاید اللہ مجھے آپ لوگوں کی مدد کے طفیل معاف کردے، پس تم ایک رات صبر کرلو کل شام سے پہلے میں تمہارے پاس موجود ہوں گا۔‘‘ شاہین اس بلا کی قوت کو دیکھ چکی تھی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ فرہاد علی اسے بس میں نہیں کر پائیں گے لیکن صائم کے چہرے پر جھلکتا اطمینان اسے مایوسی کے اندھیرے سے نکالنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔

دونوں اپنی اپنی خواب گاہوں میں اگلے دن ہونے والے واقعات پر غور کر رہے تھے، شاہین کے چہرے پر یہ خوف تھا کہ کل کے بعد وہ سایہ کہیں خون خرابے پر نہ اتر آئے جبکہ صائم کے دل میں امید کی شمع روشن تھی کہ کل کے بعد اس کی محبت کے چاند کو گرہن لگانے والا سایہ ہمیشہ کے لیے اندھیرے کی چادر میں چھپ جائے گا یہی سوچتے سوچتے نہ جانے وہ کب نیند کی وادیوں میں جا پہنچے۔

دوسرے دن شام کے چار بج رہے تھے فرہاد علی شاہین اور صائم لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے ماحول پر مکمل سکوت طاری تھا فرہاد علی اپنے لائحہ عمل مرتب کر رہے تھے آنے والے خطرات سے کس طرح نمٹا جائے گا؟ مدمقابل کی طاقت کیا ہوگی؟ یہ سب وہ سوالات تھے جن کا کسی کے پاس جواب نہ تھا لیکن وہ سب یہ خطرہ مول لینے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے

فرہاد علی نے پورے گھر کا جائزہ لیا اور گھر کا وہ کمرہ جو شاہین کی خواب گاہ سے منسلک تھا اپنے عمل کے لیے پسند کرلیا۔

مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ تینوں مجوزہ کمرے میں موجود تھے، فرہاد علی نے شاہین اور صائم کو کمرے کے ایک کونے میں بیٹھنے کا مشورہ دیا۔ اور پھر ان کے گرد حصار کھینچ دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں کو اس بات سے آگاہ بھی کیا کہ حالات کچھ بھی ہوں وہ اس حصار سے باہر نہ نکلیں۔

اس کے بعد فرہاد علی نے کمرے کے مرکز میں ایک دائرہ کھینچا اور کچھ ضروری سامان اس دائرے میں رکھ کر خود دوزانوں ہو کر بیٹھ گئے۔

شاہین نے ان کی ہدایت کے مطابق کمرے میں پہلے ہی ایک شمع روشن کردی تھی کمرے کے گھپ اندھیرے میں موم بتی کی روشنی میں عجیب وغریب سائے تخلیق ہو رہے تھے۔

اچانک فرہاد علی نے منہ میں کچھ پڑھنا شروع کیا ان کے پڑھنے سے کمرے میں گھٹن کا احساس بڑھ رہا تھا ان کی آواز بلند ہونے کے ساتھ ساتھ کمرے میں گرمی اور گھٹن بھی بڑھتی گئی۔

اچانک کمرے میں ہوا کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی آہستہ آہستہ اس آواز میں بلیوں کے رونے کی آواز بھی شامل ہوگئی، شاہین اور صائم کا دل سینے کی بجائے کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔

ہوا کی سرسراہٹ میں خوفناک چیخیں اور جانوروں کی آوازیں بھی شامل ہوتی گئیں یوں لگتا تھا جیسے بدروحیں نوحہ کناں ہوں

شاہین اور صائم کہ اعصاب شل ہوتے جارہے تھے ان کا جی چاہ رہا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائیں مگر پاؤں ان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے

فرہاد علی صاحب اطمینان سے اپنے عمل میں مصروف تھے دنیا و مافیا سے بے خبر انہوں نے شاہین اور صائم کو سختی سے منع کیا تھا کہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھے رہیں۔ یہ اور بات تھی کہ وہ دونوں اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی شاید زمین سے چپک گئے تھے۔

پھر اچانک چیخوں کا سلسلہ تھم گیا ہر طرف ایک

سکوت چھا گیا بالکل ایسے جیسے طوفان سے پہلے سمندر پر سکون ہوتا ہے۔

یہ خاموشی بہت پر اسرار تھی ایسا لگتا تھا جیسے زمین و آسمان نجم وقمر کی گردش رک گئی ہو جیسے وقت کو کسی کا بے چینی سے انتظار ہو پھر وہ آ گیا جس کا انتظار تھا موم بتی کا شعلہ تھر تھرا رہا تھا موم بتی سے نکلنے والا دھواں ایک مرغولے کی شکل اختیار کرتا گیا جیسے جیسے دھواں چھٹا اس سے وہی حسین چہرہ نمودار ہونے لگا جو دو دن قبل شامین کے ایمان کو ڈگمگا چکا تھا وہ مجسم حسن اپنی تمام تر دل آویزیوں اور رعنائیوں کے ساتھ آن موجود تھا۔

ایک لمحے کے لیے شامین احساس کمتری کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا شاید وہ بھی صائم کی سوچ پڑھ چکا تھا اس نے ایک نظر صائم کو دیکھا پھر صائم پر حقارت آمیز نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''نادان اور حقیر۔''

فرہاد علی ایک دم کھڑے ہو گئے وہ بولے۔ ''تو خود کو کیا سمجھتا ہے کم ذات ابھی میں تجھے بتاتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں دیکھتا ہوں تو کیسے اس کی زندگی سے کھیل سکتا ہے۔''

''تو مجھ سے ہم کلام ہونے کی کوشش کر رہا ہے مگر نہیں میں تیری بات کا برا نہیں مناؤں گا مگر میں تجھے تیری اوقات ضرور یاد دلاؤں گا تا کہ آئندہ کبھی کوئی شامین کو بہکا نہ سکے۔''

فرہاد علی کے عضلات کھنچ گئے انہوں نے منہ میں کچھ بڑبڑایا اور ایک جھٹکے سے دونوں ہتھیلیوں کے جوڑ کر شمع کی جانب کر دیا ایسا کرنے کی دیر تھی کہ شمع سے آگ کی لپٹیں ابھرنے لگیں اور اس بلا کے خوبصورت جسم کو گھیرنے لگیں لیکن یہ کیا! اس کے چہرے پر تو سکون تھا مکمل سکون پھر وہ اسی ادائے دلربانی سے بولا۔

''بے وقوف انسان تو کیا سمجھتا تھا کہ تو مجھے جلا دے گا شاید تو مجھ سے واقف نہیں میں نار جن ہوں میں تو خود نار ہوں اور تو مجھے جلانے چلا ہے میں جو خود شعلوں سے غسل کرتا ہوں تجھ جیسے کم ذات میرا انگوے چاٹتے ہیں تو مجھے جلانے چلا ہے اپنی آگ کا انجام دیکھ بدبخت۔'' اتنا کہہ کر نار جن نے ہاتھ سے چھت کی طرف اشارہ کیا اور پھر فرہاد علی کے عین سر پر خون کی بارش برسنے لگی۔

خون فرہاد علی کے پورے جسم کو بھگو رہا تھا، خون سے اٹھنے والی بدبو نے شامین اور صائم کا سانس لینا محال کر دیا تھا، خود فرہاد علی کا یہ عالم تھا کہ جیسے ان پر تیزاب ڈالا جا رہا ہو اور ان کی ہڈیوں تک میں حرارت محسوس ہو رہی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ شعلے سرد پڑنے لگے فرہاد علی کا جسم فالج زدہ ہونے لگا جن کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ پھیل گئی وہ بولا۔ ''تیرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ تیرا اپنا کیا دھرا ہے اب ایک وار میرا بھی دیکھ۔''

پھر نا جانے کیا ہوا؟ فرہاد علی کے پشت پر ایک سیاہ ہاتھ نمودار ہوا جس نے اسے گردن سے پکڑ کر ہوا میں بلند کیا اور پھر شمع پر پٹخ ڈالا فرہاد علی کا ماتھا شمع کے شعلے سے ٹکرایا اور شمع بجھ گئی اس کے ساتھ ہی وہاں چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جن کھلکھلا رہا تھا پھر وہ اچانک صائم کی جانب مڑا اور بولا۔ ''سن لڑکے جسے تو اپنا بنانا چاہتا ہے وہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ اس کی آرزو چھوڑ دے کہیں ایسا نہ ہو کہ تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔'' اتنا کہہ کر جن شامین کی جانب متوجہ ہوا اور بولا۔ ''شامین تم صرف میری ہو، دنیا کے کسی عالم میں اتنی طاقت نہیں کہ مجھے زیر کر سکے صرف تم ہو جو مجھے زیر کر سکتی ہو لیکن طاقت سے نہیں محبت سے۔

اور ہاں مجھ سے بچ نکلنے کا خیال دل سے نکال دو میں آسمان کی وسعتوں میں بھی تمہیں تلاش کرنے کی قوت رکھتا ہوں تم تک رسائی کے لیے مجھے زمان و مکان کا پابند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اتنا کہہ کر نار جن کھڑکی کی جانب بڑھا آخری مرتبہ مڑ کر شامین کی طرف دیکھا اور پھر فرہاد علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اسے دیکھ لو یہ ساری زندگی اپاہجوں کی طرح گزارے گا اس کے اختیار میں صرف زبان ہے باقی جسم گوشت کا ایک ڈھیر ہے یہ جب تک زندہ رہے گا لوگوں کو مجھ سے

الجھنے سے منع کرتا رہے گا اور اس کا یہ حال سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے مجھے امید ہے کہ اب تم کسی کی زندگی کو خطرہ میں نہیں ڈالو گی۔" پھر نارجن ہوا میں تحلیل ہو کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے میں عجیب دھینگا مشتی کا عالم تھا اب کمرے میں نارجن تھا نا فرہاد علی پر گرنے والا خون تھا بس فرہاد علی تھے جن کا تمام جسم اکڑا ہوا تھا یا وہ دائرہ تھا جس میں وہ دونوں اپنے آپ کو محفوظ خیال کر رہے تھے۔

شاہین اور صائم نے فرہاد علی کو بہ مشکل چارپائی پر لٹایا ان کی حالت عجیب تھی ان کا سارا جسم بے حرکت تھا۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے ادھر صائم کی وجہ سے فرہاد علی کی یہ حالت ہوئی فرہاد علی نے صائم کی اندرونی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! اداس مت ہو مجھے اپنی اس حالت کا قطعی افسوس نہیں افسوس تو یہ ہے کہ میں تمہیں مصیبت سے نجات نہ دلا سکا وہ واقعی طاقت میں میری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔"

شاہین جواب تک خاموش تھی تڑپ کر بولی۔

"انکل آخر آپ کو صحیح حالت میں لانے کا کوئی تو طریقہ ہوگا۔" فرہاد علی خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"نہیں بیٹی یہ نارجن کا وار ہے اسے کوئی نہیں کاٹ سکتا ہاں نارجن ہی اسے واپس لے سکتا ہے مگر وہ ایسا کبھی نہیں کرے گا، اب تو شاید بقیہ عمر چارپائی پر ہی گزرے۔"

شاہین اور صائم کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ندیم کا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ اس نے بہن اور انکل کو سلام کیا پھر حالت کی نزاکت دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے بھابھی انکل کی طبیعت خراب ہے کیا۔؟"

اس سوال کا جواب وہ دونوں کیا دیتے۔

شاہین نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے اس سے کہا۔ "نہیں کوئی بات نہیں اچانک انکل کی طبیعت خراب ہو گئی ہے ابھی ٹھیک ہو جائے گی تم اپنا کام کرو۔"

شارق نے ایک لمحہ کے لیے شاہین کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر معنی خیز انداز میں بولا۔ "آپ کی آنکھوں میں آنسو، اچھا تو اب بھابھی دیور سے جھوٹ بھی بولنے لگی ہیں۔"

پھر شارق فرہاد علی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "کیوں انکل کیا ہوا آپ کی طبیعت کو؟"

فرہاد علی بولے۔ "کچھ نہیں بیٹا جسم میں کچھ اکڑاہٹ ہے۔"

بہت برا ہوا ندیم چہک کر بولا۔ آپ کی طبیعت ٹھیک کرنا ہی پڑے گی۔

شارق کے اس معصومانہ ادا پر سبھی مسکرا اٹھے صائم جو کہ ندیم سے حقیقتاً بہت محبت کرتا تھا اسے شارق پر بہت پیار آیا۔

شارق ایک دم اٹھا اور تپائی پر پڑے ہوئے گلاس میں کچھ پڑھا اور پانی میں پھونک مار کر سارا پانی فرہاد علی کے جسم پر انڈیل دیا، فرہاد علی کے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی اور انہیں تمام جسم میں آگ سی لگی ہوئی محسوس ہوئی وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر خود ہی حیران رہ گئے وہ اٹھ سکتے تھے انہوں نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلا جلا کر دیکھے ان کے تمام بدن میں حرکت موجود تھی وہ ہر طرح سے حرکت کر سکتے تھے۔

انہوں نے حیرت سے شاہین اور صائم کو دیکھا پھر ان کی نگاہیں ندیم تو پر جم گئیں جو سکون سے بیٹھا مسکرا رہا تھا اب بھی اس کی نگاہوں میں وہی ابدی سکون تھا جو اس کی سب سے بڑی خوبی تھی۔

شاہین صائم اور فرہاد علی بے چین تھے یہ جاننے کے لیے کہ شارق کے پاس ایسی کونسی قوت تھی؟ شارق ان کے چہرے پڑھ چکا تھا وہ ان سے پہلے ہی بول اٹھا۔

"کائنات کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اندھیرا روشنی پر غالب نہیں آسکتا، روشنی بھی اندھیرے میں چھپ نہیں سکتی پس روشنی سے عشق کرو تمام کائنات کا نور تم میں خود بخود دسمٹ آئے گا یہی زندگی ہے یہی بندگی ہے اور یہی

ہے۔ طاہرہ مجھے وہاں چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ سائرہ کے چہرے پر پریشانی کے اثرات مسلط تھے، اور اس کا چہرہ کسی خزاں رسیدہ پھول کی طرح مرجھایا ہوا تھا۔ اس سائرہ اور جو سالگرہ میں سائرہ تھی۔ اس میں بہت فرق تھا۔ یہ سائرہ برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔

"کیا بات ہے، سائرہ......! تم ٹھیک تو ہو، تمہارا یہ چہرہ اترا اترا سا کیوں ہے۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"وہ میں...... وہ کچھ نہیں بس ہلکا سا بخار ہے۔" اس نے بات کو ٹالنا چاہا۔

"دیکھو سائرہ بات کو چھپاؤ مت۔ تمہارا چہرہ کوئی بھی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ تم کسی کشمکش میں مبتلا ہو، بتاؤ، بات کیا ہے؟"

"مزمل۔ میں نے کہا نا کوئی بات نہیں ہے۔ تم ایسے ہی بات کو بڑھا رہے ہو۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ "چلو کوئی اور بات شروع کرو۔" اس نے بے جان سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

"تو پھر مجھے اس طرح یہاں بلوایا کیوں؟ وہ کونسی ضروری بات ہے۔ جو تم چھپا رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"مزمل، خدا کے لئے مجھے بھول جاؤ، میں تمہارے کے قابل نہیں ہوں، ویسے بھی میں یہاں صرف چند دنوں کی مہمان ہوں۔ کیا پتہ موت مجھے کب اپنی آغوش میں لے لے۔" وہ رو پڑی۔

"یہ کیا بکواس ہے۔ وہ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں۔ کیا وہ سب جھوٹی تھیں۔ جو اصل بات ہے مجھے وہ بتاؤ۔"

مجھے باقاعدہ اس پر غصہ آ رہا تھا۔ "تم اگر مجھے اپنا کچھ بھی نہیں سمجھتی ہو تو نہ بتاؤ۔ میں بھی تم سے نہیں پوچھوں گا۔" میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

"مزمل اگر تم جاننا ہی چاہتے ہو تو سنو۔ گزشتہ ایک ماہ سے مجھے مسلسل ایک ہی خواب نظر آ رہا ہے۔ ایک لمبا تڑنگا خوفناک آدمی مجھے آ کر کہتا ہے۔" اس مہینے کا جیسے ہی چاند ڈوب جائے گا۔ وہ مجھے اٹھا کر ان سامنے نظر آنے والے پہاڑوں میں لے جائے گا۔ پھر میرے خون سے خود بھی غسل کرے گا اور اپنے شیطان آقا کے بت کو بھی غسل دے گا۔ اس سے اس کو اپنے شیطان آقا کی مزید خوشنودی حاصل ہوگی۔ وہ دنیا میں بدی کو پھیلنے میں اہم کام کرے گا اور زبردستی لوگوں کو اپنا غلام بنا کر مذہب سے ورغلائے گا۔ اس خوفناک آدمی کا مزید کہنا ہے کہ میں پورن ماشی کی خاص رات کو پیدا ہوئی ہوں۔ تمہاری قربانی سے میرا آقا بہت خوش ہوگا۔"

پھر منظر بدل جاتا ہے مزمل۔ ایک خوبصورت سی لڑکی جس کا سفید لباس اور سنہرے بال ہوتے ہیں۔ وہ مجھے تسلی دیتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ شیطان کبھی اپنے مطلب میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ تجھے مارنا چاہتا ہے تو اس دنیا میں وہ بھی پیدا ہو چکا ہے جس کے ہاتھوں اس کی موت لکھی ہوئی ہے۔"

پھر مجھے بار بار تم نظر آتے ہو۔ میں مرنا نہیں چاہتی مزمل، خدا کے لئے مجھے اس ڈراؤنے آدمی سے بچالو۔ میں صرف تمہاری محبت میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو کے ساتھ ڈر کی لہریں بھی دوڑنے لگیں، اور میں کانپ کر رہ گیا۔

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ سائرہ! یہ میں کہہ رہا ہوں۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ کوئی بھی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ میں خود بھی تذبذب کا شکار تھا کہ اس نے محض ایک خواب کو یوں اتنا اہم بنایا ہے۔ پھر ہم وہاں سے گھر آ گئے۔ گھر آ کر میری سوچ ایک ہی سوئی پر اٹکی ہوئی تھی۔ چاند ڈوبنے میں صرف دو دن ہی رہ گئے تھے۔ اور یہ بات میں ایک بہت بڑے عالم سے سنی تھی کہ جو خواب مسلسل آئے وہ سچا ہوتا ہے۔ اس کی تعبیر حقیقت میں بدل جاتی ہے۔

دو دن پلک جھپکتے ہوئے گزر گئے۔ میں سائرہ کو تسلیاں دیتا رہا کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا یہ خواب خیال ہوتے ہیں بس اور گھر میں کسی کو بتانا مت، مگر اس کی بے

چینی اور پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ کیونکہ خواب کا ڈرو خوف اس پر حاوی ہو چکا تھا۔

پھر وہ رات آگئی وہ واقعی بہت تاریک سیاہ رات تھی۔ چاند کہیں جا کر چھپ گیا تھا۔ تاروں کی چمک بھی غائب تھی۔ میں نے سائرہ سے کہا۔ ''وہ بے فکر ہو کر سو جائے۔ میں تمہارے گھر کے سامنے پہرہ دوں گا۔''

پہلے تو وہ نہ مانی۔ کہنے لگی۔ ''مزمل! جو میری قسمت میں ہوگا دیکھا جائے گا اور پھر جو نصیب میں ہوتا ہے وہ بھلا کہاں ٹلتا ہے۔ تم اپنی جان میری خاطر خطرے میں مت ڈالو۔''

مگر یہ کم بخت پیار بہت ظالم ہوتا ہے بھلا کسی کی کب مانتا ہے۔ سو میں نے بھی پیار کی قسمیں دے کر گھر میں اسے بھیج دیا اور خاص طور پر یہ تاکید کہ یہ بات کسی کو مت بتائے۔ میں نے اپنی امی سے کسی دوست سے ملنے کا جھوٹ بول دیا تھا۔

سائرہ کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر ایک کافی بڑا درخت تھا۔ موسم خزاں کی وجہ سے پتے تو اس کے گر چکے تھے۔ مگر ٹہنیاں بہت مضبوط تھیں۔ میں نے خالہ کے گھر سے ایک کلہاڑی لے لی تھی۔ اطراف میں نظریں گھما کر میں درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ چونکہ یہ علاقہ پہاڑی تھا۔ اس لئے یہاں آج پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی خاموشی چھائی تھی۔ تاریکی چادر ہر طرف تن چکی تھی۔ صرف سائرہ اور اس کے ساتھ ساتھ گھروں کی مدھم سی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دور پہاڑوں پر کئی جنگلی جانور چیخ چیخ کر ماحول پر ڈراؤنا اثر چھوڑ رہے تھے۔ جانوروں کی خوفناک آوازوں نے میرے وجود پر سکتے کی کیفیت طاری کردی تھی۔ قریبی درخت پر جب الو کی ہولناک آواز سنائی دی تو میرے اعصاب پر جیسے بجلی گر پڑی۔ میرے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔ ڈرو خوف میرے اطراف رقص کناں تھا اور میں خود کو سنبھالے بڑی مشکل سے درخت پر بیٹھا ہوا تھا۔

اچانک ایک بھیڑیا کی بلند بازگشت سنائی دی۔ جو خاموش ماحول کا سینہ چیرتی ہوئی بجلی سی بن کر مجھ پر گری۔ کلہاڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جاگری اور میں خود بڑی مشکل سے ٹہنی پر براجمان تھا۔

درخت سے کچھ ہی فاصلے پر ایک قد آور بھیڑیا کھڑا تھا۔ چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا ہو کر وہ اپنی لال لال آنکھوں سے اطراف میں دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے منہ اوپر کو اٹھا کر بلند آواز میں چیخ ماری، جیسے کسی کو آنے کو کہا ہو۔ پھر میری طرف بڑھنے لگا۔ بھیڑیا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں تھر تھر کانپنے لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ درخت کے نیچے آ کر بھیڑیا نے جیسے مٹی سونگھی پھر سائرہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ یک لخت کسی کے بھاری بھرکم قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ میں نے بھیڑیے کو چھوڑ کر مخالف سمت دیکھا۔ جہاں سے کچھ دیر پہلے بھیڑیا آیا تھا۔ میں نظریں پھاڑ کر اس طرف دیکھنے لگا گو کہ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ قدموں کی آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ جیسے چلنے والا قریب ہی ہو۔

ڈر کی وجہ سے میری سٹی گم ہوگئی۔ اور میں دم سادھے نیچے دیکھنے لگا۔ پھر اچانک ایک دراز قد شخص درخت کے نیچے سے گزرا۔ غور سے دیکھنے پر مجھے اتنا معلوم ہوگیا کہ اس شخص نے سیاہ لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ البتہ تاریکی کی وجہ سے اس کی شکل نہ دیکھ سکا۔ وہ شخص بھی چلتا ہوا سائرہ کے گھر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ بھیڑیا نہ جانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔

سامنے کا منظر دیکھ کر میں حیرت سے اچھل پڑا۔ وہ شخص سائرہ کے گھر کی دیوار سے ایسے اندر چلا گیا۔ جیسے دروازے سے گزرا ہو۔

میں نے تھوڑی سی ہمت یکجا کی اور سوچا اس شخص کا پیچھا کرنا چاہئے۔ ابھی میں نیچے اترنے کے لئے پر تول رہا تھا کہ دوسرے ہی لمحے مجھے اندر سے سائرہ کی

کربناک چیخ سنائی دی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں نیچے اترتا۔ وہ شخص ہاتھوں میں بے ہوش سائرہ کو اٹھائے اسے دیوار سے گزرا جیسے خلا ہو۔ اب بھیڑیا اس کے آگے آگے ایسے چل رہا تھا جیسے پالتو کتا ہو۔ آنکھ جھپکتے ہی وہ میرے پاس سے ایسے گزر گیا جیسے ہوا کا جھونکا ہو۔

میں نے جلدی سے نیچے چھلانگ لگائی اور اس کے پیچھے بھاگا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سامنے والی پہاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

میں ٹیلے پر کھڑا متلاشی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ میری چھٹی حس نے ایک تنگ راستے کی نشاندہی کی اور اس طرف قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ دائیں طرف سے آنے والی ایک نسوانی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میرے قدم وہیں رک گئے۔

میں نے اس طرف دیکھا تو وہ ایک نوجوان خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے ہاتھ میں لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ اس کے سنہرے بال اس کے کندھوں پر ایستادہ تھے۔ دودھ جیسی گوری رنگت اور سفید لباس نے اس کے نسوانی حسن میں قدرے اضافہ کر رکھا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ لڑکی کون ہے اور اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے۔ پھر وہ لڑکی میرے قریب آ گئی۔ اس نے کھڑے کھڑے مجھ پر گہری نظر ڈالی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''آپ سائرہ کو بچانا چاہتے ہیں ناں۔'' اس کی آواز میں مٹھاس کے ساتھ ہلکا سا رعب بھی تھا۔

''ہاں! مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس بات کو چھوڑیئے۔ ایسی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ مگر اس وقت سوال سائرہ کی زندگی کا ہے۔'' وہ بولی۔

''لیکن مجھے معلوم نہیں۔ وہ سائرہ کو کہاں لے گیا ہے۔'' میں نے پریشانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ کوئی انسان نہیں بلکہ شیطان ہے۔'' وہ لڑکی گویا ہوئی۔

''میں اسے جانتی ہوں کہ وہ سائرہ کو لے کر کہاں گیا ہے، آپ میرے ساتھ آیئے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں، وہ میرے آگے چل پڑی۔ میں نے اس کے پیچھے قدم بڑھا دیئے۔ میں نے ذہن پر بہت زور دیا کہ یہ لڑکی کون ہے اور میری اس طرح مدد کرنے کا مقصد......! معاً خیال آیا کہ یہ وہی لڑکی تو نہیں جو سائرہ کو خواب میں نظر آتی تھی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اندھیرا گو کہ کم ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اتنی روشنی ہرگز نہیں تھی کہ مجھے راستے کا ٹھیک طرح سے تعین ہو سکے۔ وہ لڑکی بڑے آرام سے آگے بڑھ رہی تھی۔ میرے اٹھتے قدم اس کے تعاقب میں تھے۔ آدھے گھنٹے کی تگ و دو کے بعد ہم پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی بنی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔ جلد ہی ہم ایک پہاڑی کے اوپر پہنچ گئے۔ وہاں پر ایک کافی بڑا پرانا سا کھنڈر نما مکان دکھائی دے رہا تھا۔ مکان کی چھت پر ایک لال روشنی کا دائرہ گھوم رہا تھا اور ایک بے جان بھیڑیئے کا مجسمہ عین منڈیر پر نصب تھا۔ مجسمے کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس کے جبڑے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''ایک منٹ۔'' لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر میرے قدم روک لئے۔ ''اسی کھنڈر میں وہ شیطان سائرہ کو لے کر گیا ہے۔ وہ لال روشنی کا چکر نظر آ رہا ہے ناں۔'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ جواب میں، میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اس شیطان نے اپنی حفاظت کے لئے محافظ چکر بنا رکھا ہے۔ پہلے مجھے اسے توڑنا ہوگا۔ پھر تم اندر جا سکو گے۔ تم یہ لالٹین پکڑو۔'' لالٹین اس نے میرے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ اوپر اٹھا کر پنجہ بنایا اور ہاتھ کو یوں جھٹکا دیا جیسے کسی نادیدہ وجود کو دھکا دیا ہو۔ ایک فلک شگاف دھماکہ ہوا۔ اگر وہ لڑکی مجھے بروقت نہ تھام لیتی تو میں کئی فٹ دور جا گرتا۔ چھت پر بنے بھیڑیئے کے مجسمے کے کئی ٹکڑے ہو کر بکھر گئے۔ سرخ روشنی کا دائرہ بھی ایسے ٹوٹا جیسے موتیوں

کی کوئی مالا ٹوٹتی ہے۔

اچانک اگلے ہی لمحے میں بھیڑیا کی بھیانک چیخ سنائی دی۔ جسے سن کر میرا کلیجہ چھلنی ہونے ہوتے بچا۔ میں نے بھاگنے کے لئے لڑکی کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر اس کے ہاتھ کی گرفت کہیں زیادہ مضبوط تھی۔

''تمہیں ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ جب تک میں ساتھ ہوں۔ بھاگنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے تسلی دی۔

''اس کا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ اب تم بلا خوف اندر جاسکتے ہو۔ مگر ایک منٹ رکو۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر میرے سر پر رکھا۔ اس کے ہاتھ سے سبز رنگ کی روشنی نکل کر پورے وجود میں سرایت کرگئی اور میں خود میں ایک نئی تبدیلی اور طاقت محسوس کرنے لگا۔ ''تم اس قابل ہوگئے ہو کہ اس سے لڑسکو۔ اور وہ دیکھو کھنڈرات کے اندر جانے کا راستہ صاف نظر آرہا ہے۔'' اس لڑکی نے میرے ہاتھ سے لالٹین لے کر رخ اس طرف کیا تو ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔ جو غالباً اندر جانے کا راستہ تھا۔ ''یہ دروازہ کھول کر تم اندر چلے جاؤ۔ تمہیں سائرہ اور وہ شیطان نظر آئے گا۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے سائرہ کو اس کی گرفت سے بچالو۔ کیونکہ آج ہر صورت میں وہ شیطان اس کی قربانی دینا چاہے گا اور گھبرانا مت ڈٹ کر مقابلہ کرنا۔'' دوسرے ہی لمحے میں وہ لڑکی وہاں سے غائب ہوگئی۔

''میں نظریں گھما گھما کر اسے اردگرد تلاش کرنے لگا۔ مگر وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور میری مدد کیوں کررہی ہے۔

بہر حال یہ وقت ایسی باتوں کے سوچنے کا نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا۔ وہ عجیب طرح کی چرچراہٹ کے کھل گیا جیسے برسوں سے بند ہو۔ اندر ایک لمبی راہداری تھی۔ جس کے دونوں اطراف کمرے بنے ہوئے تھے۔ جو گہری تاریکی کی لپیٹ میں تھے۔

کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں دیواروں کا سہارا لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ جلد ہی میں ایک بڑے ہال نما کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے کا ماحول دیکھ کر ایک بار پھر میں ڈر سے دوچار ہوگیا۔ کمرے کے وسط میں ایک کافی بڑا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ایک ہیبت ناک بت نصب تھا۔ جس کے سر پر دو سینگ اور کان کافی لمبے تھے۔ چہرہ خوفناک اور جسامت عجیب طرح کی تھی۔ بت کے ایک ہاتھ میں ایک چمک دار تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ایک کافی بڑی جلتی ہوئی مشعل تھی۔ پورے کمرے میں بے شمار دیئے جل رہے تھے۔ دوسری طرف اسی طرح کے دو اور چھوٹے بت ایستادہ تھے۔ بڑے بت کے قدموں میں سائرہ کا بے ہوش وجود پڑا ہوا تھا اور وہ شیطان سیاہ لبادہ اوڑھے اس کے قریب ہی آلتی پالتی مارے بیٹھا آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہا تھا۔

میں دبے پاؤں سائرہ کی طرف بڑھا۔

اچانک اس شخص نے سر گھما کر میری طرف دیکھا۔ خوف کے مارے میری توسٹی گم ہوگئی۔ اس کے چہرے پر گوشت پوشت نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ صرف ہڈیاں ہی تھیں۔ پھر اس کے جسم سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

''اے لڑکے کون ہے تو، اور یہاں کیا کررہا ہے۔'' وہ کرخت آواز میں بولا۔

''میں کون ہوں اس بات کو چھوڑو۔ سائرہ کو لینے آیا ہوں۔ اسے میرے حوالے کردو۔'' میں نے ہمت یکجا کر کے کڑکتی آواز میں جواب دیا۔ جواب میں اس نے بلند قہقہہ لگایا۔ جس نے کمرے کی در و دیوار ہلا کر رکھ دیں۔

''پاگل ہے کیا تو! میں اس لڑکی کو تیرے حوالے کبھی نہیں کرسکتا۔ بھاگ جا یہاں سے ورنہ بے دردی سے ماردوں گا تجھے۔'' وہ اٹھ کر میری طرف بڑھا۔

''میں سائرہ کو یہاں سے لئے بغیر نہیں جاؤں گا، چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا اور اس کے حملے کے لئے تیار ہوگیا۔

''اگر تجھے مرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو لے پھر......'' اس نے ہاتھ اٹھا کر ان چھوٹے بتوں کی طرف کیا تو اس کے ہاتھ سے سرخ رنگ کی روشنی نکل کر ان بتوں پر پڑی، وہ متحرک ہوئے اور تلوار پر آتے ہوئے میری طرف بڑھنے لگے، میں نے خود کو چوکس کرلیا۔ ایک نے میرے سر پر پہنچ کر مجھ پر تلوار کا وار کردیا۔ میں جلدی سے ایک طرف ہوگیا اور ایک بھرپور گھونسہ اس کے ناک پر دے مارا وہ چند قدموں کے فاصلے پر پہلو کے بل گرا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ میں نے پھرتی دیکھائی اور لپک کر وہ تلوار اٹھالی۔ دوسرے نے آگے بڑھ کر مجھ پر تلوار کا وار کردیا۔ میں نے جلدی سے تلوار اس کے آگے کردی۔

ایک آسمانی بجلی کڑکی اور مجھے اپنے ہاتھوں میں درد محسوس ہونے لگا۔ اب ہم ایک دوسرے سے زور آزمائی کررہے تھے۔ اس بت کے منہ سے درندے جیسی غراہٹ نکل رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میں گر جاؤں گا۔ لہٰذا میں نے یکدم اپنی تلوار کو پیچھے کھینچا وہ آگے کو جھکا تو میں نے تلوار اس کی گردن پر دے ماری اور پھر لمحے میں اس کا سر کٹ کر دور جاگرا اور آگ نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

دوسرے نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے تین چار گھونسے میرے بائیں پہلو پر رسید کردیئے۔ تلوار میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ پھر اس نے جیسے ہی میری گردن کو اپنے آہنی شکنجے میں لینا چاہا۔ تو گلے میں لٹکا ہوا آیت الکرسی کا لاکٹ اس کے ہاتھ سے ٹکرا گیا تو اس کے وجود پر آگ مسلط ہوگئی۔ کچھ دیر بعد وہاں پر سیاہ راکھ پڑی ہوئی تھی۔

''میرے محافظوں کو مار کر تو نے اچھا نہیں کیا لڑکے......! اب میرے ہاتھ سے تو نہیں بچ پائے گا۔'' اور یہ کہہ کر اس نے مجھے پکڑ لیا اور اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مار دیا۔ ہوا میں اڑتا ہوا میرا سر دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور میں نیچے گر پڑا۔ میرے سر سے خون بہنے لگا اور درد نے مجھ پر حملہ بول دیا۔ میں نے ہمت دکھائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''شیطان نے قہقہہ لگایا اور آگے بڑھ کر میری گردن ایک ہی ہاتھ سے دبوچ لی، میرے حلق میں خراش سی پڑ گئی اور میں گردن چھڑانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ پھر اس نے مجھے اوپر کی طرف اچھال دیا۔ میں کافی دور جا کر کندھے کے بل گرا، اذیت سے میرا وجود جھٹکے کھانے لگا، پاس ہی تلوار پڑی تھی۔ میری نظر اس طرف اٹھ گئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر تلوار اٹھالی اور ساتھ ہی جمپ لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر دوڑتا ہوا شیطان کی طرف بڑھا اور سیدھی تلوار اس کے پیٹ میں گھسیڑ دی۔ ایک طرف گرا اور شیطان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا مگر اس کے بعد جو منظر میری آنکھوں نے دیکھا۔ حیرت وخوف سے اس نے مجھے جھنجھوڑ کر ہی رکھ دیا۔

شیطان نے تلوار اپنے وجود سے ایسے نکالی جیسے انسان اپنی جیب سے ہزار کا نوٹ نکالتا ہے۔ تلوار اس نے ایک طرف پھینکی اور قوی ہیکل قہقہے لگانے لگا۔ ساتھ ہی وہ اپنی چھاتی پر زور زور سے ہاتھ مار رہا تھا۔

''یہ ایسے ہی مارے گا یہ تلوار اٹھا کر اس بت کو دے مارو۔ یہ شیطان فوراً ہی مرجائے گا۔'' مجھے اس لڑکی کی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے دوسری طرف نظر اٹھائی تو کچھ ہی فاصلے پر دوسرے بت کی چمکدار تلوار زمین پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے وہیں سے جست لگائی اور تلوار کے اوپر جا کر گرا۔ پھر اسے اٹھا کر سیدھی بڑے بت کی طرف پھینک دی۔ تلوار تیر کی طرح سیدھی بت کی چھاتی میں جا گھسی۔ شیطان کے قہقہے یک دم بند ہوگئے اور اس کے منہ سے گاڑھا لال سیال نکل پڑا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھے تو وہاں سے بھی خون ابل پڑا۔ ساتھ ہی ایک بہت بڑا خوفناک دھماکہ ہوا۔ میرا سر چکرانے لگا پھر خود بخود میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ میں کہاں ہوں۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا۔ جب میں نے اٹھ کر دیکھا تو اسی درخت کے نیچے پڑا ہوا تھا اور قریب ہی سائرہ پڑی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے ہلایا جلایا مگر وہ ہوش میں نہیں تھی۔ میں نے جیسے ہی اٹھنا چاہا۔ میرے سر میں اس قدر شدید چکر آیا کہ مجھے زمین گھومتی محسوس ہوئی۔ بدن کے انگ انگ سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ سر میں چوٹ لگنے کے باعث خون کافی مقدار میں بہہ چکا تھا اور جب دھماکہ ہوا تھا تو میرا جسم دو تین بار دیوار کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ جس کی وجہ سے کمزوری کے ساتھ درد کی شدت بھی بڑھ رہی تھی۔ میرا سر بار بار چکرا رہا تھا۔

اچانک لالٹین کی زرد روشنی ہم پر پڑی۔ دیکھا تو وہی لڑکی تھی جو پہلے مجھے کھنڈرات تک لے گئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مجھے سہارا دیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ہم دونوں نے سائرہ کو اٹھا کر اس کے کمرے تک پہنچایا۔ سائرہ کے گھر والے تو بے خبری سے ایسے سو رہے تھے جیسے انہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ باہر کا دروازہ اس لڑکی نے اپنی غیر مرئی طاقت سے کھولا تھا۔ سائرہ کو اس کے کمرے میں چھوڑا، سائرہ بے سدھ تھی۔ پھر میں اور وہ لڑکی اسی درخت کے نیچے آ گئے۔

"یقیناً تمہارے دماغ میں میرے متعلق بہت سے سوالات اٹھ رہے ہوں گے۔" وہ لڑکی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کھنڈرات سے تمہیں اور سائرہ کو میں اٹھا کر لائی تھی۔ دوسری بات یہ کہ تمہارے گلے میں موجود آیت الکرسی کے لاکٹ نے مجھ سے زیادہ تمہاری حفاظت کی۔ تیسری بات یہ کہ بت کو تلوار لگنے سے اس شیطان کا سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ آخری اور خصوصی بات یہ کہ میں کون ہوں۔ اگر اس دنیا میں شیطانی طاقتیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اچھی طاقتیں بھی اس دنیا میں پیدا کر رکھی ہیں۔ جو انسانوں کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ تم مجھے بھی ان نیک طاقتوں میں شامل کرلو۔ میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ تمہیں اپنے ذہن پر زور دینے کی ضرورت نہیں،

اچھا اب میں چلتی ہوں۔" ساتھ ہی وہ وہاں سے چلتی ہوئی پہاڑوں میں کہیں غائب ہو گئی۔

میں وہاں سے خالہ کے گھر آ گیا۔ اور اپنے بیڈ پر سکون سے سو گیا۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ اس لئے کسی کو میرے بارے میں پتہ نہ چل سکا۔ اب میں مطمئن تھا کہ سائرہ کی زندگی بچ گئی۔

جب صبح گھر والوں نے میری حالت دیکھی تو حیران رہ گئے۔ ہر ایک نے سوالوں کی بوچھاڑ مجھ پر کردی۔ یہ سب کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ میں نے بھی جھوٹ کا سہارا لیا اور کہا۔

"رات کو پہاڑوں کی سیر کرنے چلا گیا تھا۔ میرا پاؤں پھسلا اور میں نیچے گر گیا۔"

اس کے بعد دوسرے ہی دن امی نے مجھے وہاں ٹکنے نہ دیا اور ہم واپس سیالکوٹ آ گئے۔ یہاں مجھے اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ مجھے تین خون کی بوتلیں چڑھیں۔ پھر ایک مہینہ اسپتال میں رہنے کے بعد ٹھیک ہو کر میں گھر واپس آ گیا۔

اس دوران سائرہ کا ایک بار بھی مجھے فون نہ آیا۔ اس نے میرا حال تک نہ پوچھا کہ میں زندہ بھی ہوں یا مر گیا۔ لیکن میری خالہ اور طاہرہ کا باقاعدہ فون آتا رہا۔ طاہرہ نے مجھے بتایا کہ "سائرہ تمہارا نام تک سننے کو تیار نہیں۔" پھر دوسری بات سن کر میرے دل کو شدید دھچکا لگا۔ وہ یہ کہ "سائرہ اب اپنے کزن سے پیار کرتی ہے اور سارا سارا دن اس کے ساتھ ہی فون پر باتیں کرتی رہتی ہے۔"

میں سائرہ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا، میرے ارمانوں کو کنارے سے درمیان غم کے سمندر میں بے رحم لہروں کے حوالے کر دیا۔ اس سے تو اچھی وہ انجان ہمدرد لڑکی تھی۔ جس نے میری مدد کی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ وہ لڑکی آخر کون تھی۔

دلہن

شگفتہ ارم درنی۔ پشاور

کمرے میں موجود روح کی کرخت اور دل دہلا دینے والی آواز سنائی دی، میں کسی صورت بھی اس خونی کو آزاد نہیں چھوڑ سکتی۔ اس آواز کو سنتے ہی اس جگہ موجود سارے لوگ دہل کر رہ گئے اور پھر......

دلکش، دلنشین اور من بھاتی کہانیاں پڑھنے والوں کے لئے بہت ہی دلفریب کہانی

حجلۂ عروسی میں ملبوس وہ دلہن آج بھی اسے انتہائی حسین لگ رہی تھی۔ سرخ یاقوتی لبوں پر ہلکا سا تبسم اس کے حسن میں مزید اضافہ کررہا تھا۔ چاند کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو ایک لمحے کے لئے راشد کو لگا جیسے وہ درحقیقت چاند کو ہی دیکھ رہا ہے۔ اس کی خوب صورت لمبی پلکوں نے آنکھوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ پلکوں کا اٹھنا...... جیسے ہر سو چکا چوند کرگیا...... انتہائی نشیلی آنکھوں میں شرم وحیا کا سمندر ٹھاٹھیں ماررہا تھا۔ بلاشبہ وہ قدرت کا حسین ترین شاہکار دکھائی دے رہی تھی۔

آج پھر اس کی پازیب کی جھنکار نے راشد کی نیند توڑ کر اسے لان کی طرف آنے پر مجبور کردیا تھا۔ حسب معمول وہ لان کے کونے میں پیڑوں کے گھنے جھنڈ کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ راشد کو آتا دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے

اٹھ کھڑی ہوئی۔ راشد ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔

''دیکھو...... میری مہندی کا رنگ پھیل گیا......''

ہاتھوں میں کانچ کی سرخ چوڑیاں پہنے اس نے اپنے ہاتھ راشد کی طرف بڑھائے۔ اس کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ واقعی پھیل چکا تھا۔ وہ بہت سادہ سی مہندی تھی جو اکثر عورتیں لگاتی ہیں۔ ہتھیلی کے بیچوں بیچ دائرے کی صورت میں...... لیکن دلہن کے ہاتھوں پر لگی مہندی کا دائرہ بگڑ چکا تھا۔ اور مہندی کا لال رنگ گہرا ہوگیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ رنگ مزید گہرا ہوتا گیا اور راشد کو لگا جیسے وہ مہندی کا نہیں خون کا رنگ ہے۔ وہ رنگ گہرا ہوتے ہوتے مزید پھیلنے لگا۔ دلہن کے چہرے پر آہستہ آہستہ کرب و اذیت کے تاثرات ابھرنے لگے۔ بڑھتے بڑھتے وہ داغ سارے ہاتھ پر پھیل گیا۔ اور پھر اس سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ خون ٹپک ٹپک کر گھاس میں جذب ہونے لگا۔ اور دلہن دھیمی آواز میں کراہنے لگی۔

لیکن راشد بت بنا سارا منظر دیکھتا رہا۔ مہندی کا وہ دائرہ جو اب ''خون کا دائرہ'' بن چکا تھا بڑھتے بڑھتے دلہن کی پوری کلائی اور پھر پورے جسم پر پھیل گیا۔ پورے جسم سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں...... خون بہت تیزی سے گھاس میں جذب ہو رہا تھا۔ اور پھر دلہن کا پورا وجود خون میں ڈوب گیا۔ اب راشد کے سامنے چاند کی چاندنی میں اندھیرے لان میں صرف اس دلہن کا لال وجود تھا...... خون میں ڈوبا وجود...... اور دلہن کی گھٹی گھٹی درد میں ڈوبی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ راشد فرط خوف سے تھرتھرا اٹھا آؤ دیکھا نہ تاؤ اس نے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

یہ سلسلہ کئی روز سے جاری تھا۔ راشد اس صورت حال سے بہت پریشان تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے، گزشتہ رات کے واقعے کا سوچ سوچ کر اس کے سر میں پھر سے درد ہونے لگا وہ ہوٹل کی ٹیبل پر اکیلا بیٹھے چائے کے 5 کپ پی چکا تھا۔ لیکن سکون پھر بھی میسر نہیں تھا۔

''آخر کون ہے وہ دلہن......؟ مجھے کیوں نظر آتی ہے؟ میرا کیا واسطہ ہے اس سے......؟ کہیں میں نے زندگی میں کسی دلہن کے ساتھ زیادتی تو......!'' اور پھر اس کا ذہن ماضی میں ڈوب گیا۔

لیکن اس کا کسی دلہن یا جوان لڑکی سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا...... تھک ہار کر اس نے دوبارہ ایک کپ چائے سے بھرا اور ہونٹوں سے لگالیا کہ سامنے دیکھا تو جیسے پلکیں جھپکانا ہی بھول گیا۔

ہوٹل کے باہر والی روڈ پر ایک انتہائی خوب صورت لڑکی اپنی کتابیں سڑک سے اٹھا رہی تھی۔ شاید اسے کسی کی ٹکر لگی تھی اور وہ اب اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹ رہی تھی۔

راشد کے دل سے رات والی ساری باتیں لمحہ بھر کے لئے نکل گئیں۔ اس کی عمر 27 سال تھی لیکن آج تک کسی لڑکی نے اس کے دل کے تاروں کو اس شدت سے نہیں جھنجھوڑا تھا۔ وہ مبہوت سا ہو کر اس حسین باکمال کو شیشے سے باہر تکتا رہا۔ اس کا دل تو جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ اور اسے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ کب اس کے کپ میں موجود چائے میز پر گرگئی۔

''......ایکسکیوزمی سر......! آپ ٹھیک ہیں......؟''

ویٹر کی آواز پر راشد ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آیا۔

''ہوں...... ہا...... ہاں...... اوہ...... یہ کیا ہوا......'' اور راشد جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا کیونکہ چائے میز سے ہوتی ہوئی اب اس کے کپڑوں پر گرنے لگی تھی۔ میز پر رکھا راشد کا سیل فون بھی پوری طرح گیلا ہو چکا تھا......

''اوہ...... سو...... سوری......'' راشد نے ہزار کا نوٹ ویٹر کی طرف بڑھایا اور سیل فون جسے پہلے ہی ویٹر کپڑے سے صاف کر چکا تھا اٹھا کر عجلت میں باہر کو دوڑا۔ وہ بس جاتے ہوئے ویٹر سے اتنا ہی کہہ پایا۔

''صاف کرلینا اور ٹپ تم رکھ لو......!'' اور ویٹر حیران ہو کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا جو صرف 50 روپے کی عوض 1000 کا کھڑکتا نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما چکا تھا۔

باہر آ کر راشد کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ

اپسرا باہر نہیں تھی۔ راشد کا منہ لٹک گیا۔ وہ سڑک پر اسی جگہ کھڑا تھا جہاں اس نے اب کچھ دیر پہلے اس شمع حسن کو اپنی تمام ترعنائیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔

''کیا بتادوں تمہیں کیا حسن فروزاں دیکھا
تیرہ آنگن کو بھی مانند گلستاں دیکھا
کاش مل جائے مجھے پھر سے وہ اس دنیا میں
جس رخ یار کو مانند چراغاں دیکھا......''

پھر پتہ نہیں کب اپنی لمبی کار میں بیٹھا وہ گھر پہنچا۔ اور کمرے میں آ کر بستر پر گر گیا۔ وہ تو بس جسمانی طور پر ہی گھر آیا تھا۔ اس کا سب کچھ تو جیسے وہیں سڑک پر بکھر گیا تھا...... نجانے کب رات ہوئی اور نیند نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔

آج وہ دوبارہ اسی ہوٹل میں اسی ٹیبل پر موجود تھا۔ اس کی نظریں بدستور شیشے سے باہر سڑک پر آنے جانے والے لوگوں پر مرکوز تھیں۔ آج چائے کا ایک بھی کپ اس نے نہ پیا تھا۔ بلکہ چائے خود بھی ایک پیالی میں انتظار کرتے کرتے ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ آج اس کے منگوائے بغیر ہی ویٹر نے اس کی فیورٹ سرونگ چائے اس کی ٹیبل پر پہنچادی تھی۔ اچانک اس کا انتظار ختم ہوا اور وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

تین چار کتابوں کو سینے سے لگائے گلابی قمیص شلوار میں ملبوس وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر ہوٹل کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے راشد پر بھی ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ اور راشد پھر سے دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا۔

ایک دو لمحے بعد جب وہ سامنے آئی...... اور پھر اس کا راشد کو دیکھنا...... راشد سکتے کی سی کیفیت میں بے خود سا اسی کو دیکھنے میں محو تھا۔ ہوش کی دنیا میں وہ اس وقت آیا جب وہ ماہتاب چہرہ...... نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''او...... ھ...... ہیلو......!'' راشد کل کی طرح بھاگتا ہوا باہر آیا لیکن کل کی طرح آج بھی اسے آنے میں دیر ہو چکی تھی۔

''جب سے ہے تجھ کو دیکھا
میرا دل نہیں ہے بس میں
جب سے نظر ملی ہے
آنکھیں نہیں بس میں
سوچوں پہ میری ہر دم ہے صرف تیرا چہرہ
اتنا ہی جانتا ہوں...... اور...... کچھ نہیں ہے بس میں......''

دن رات راشد اسی کے خیالوں میں گم رہنے لگا۔ ہر لمحہ ہر گھڑی اس کی محبت راشد کو ستاتی رہی۔ وہ پہلی نظر کے پیار میں بری طرح گرفتار ہو چکا تھا اور ایسا اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ زندگی میں جیسے بہار آ گئی تھی۔

یہ محبت بھی عجب جذبہ ہے جب ہوتی ہے تو نہ دن دیکھتی ہے نہ رات۔ نہ نام پتہ دیکھتی ہے نہ ذات پات...... بس ہو جائے تو چین سے نہیں رہنے دیتی۔ راشد نہ اس کا نام جانتا نہ اس کے گھر یا خاندان کا پتہ...... بس ایک جذبہ تھا جو اچانک شروع ہوا اور اب اس کے اندر جیسے آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ اس کا دل، اس کی آنکھیں اس کے جسم سے اس کے دماغ سے پل پل جھگڑا کر رہا تھا۔ کہ اٹھو اور اس سے جا کر بات کرو...... اٹھو اور جا کر کہہ دو اس سے کہ کتنا پیار کرنے لگے ہو تم اس سے...... اٹھو اور اسے اپنی یک طرفہ محبت کی شدت سے آگاہ کرو......''

آج راشد نے اس سے بات کرنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔ وہ سڑک کے سائیڈ پر اپنی مرسڈیز سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ یہ سڑک کافی گنجان آباد تھی۔ اس لئے کافی لوگ آ جا رہے تھے۔ اسے کھڑے کھڑے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ راشد کی نظریں اسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

''کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے
غم دنیا سے گھبرا کر تمہیں دل نے پکارا ہے......!''

راشد کے ذہن میں اس گیت کے بول گونجنے لگے۔

اس کے دل و دماغ سے ''دلہن'' والا خوف بالکل ختم ہو چکا تھا۔ گزشتہ دو تین دن سے اسے ''دلہن نظر نہ آئی

تھی...... وہ تو بس عشق کے لامحدود سمندر میں غوطہ زن تھا۔ اور پھر اس کا سارا انتظار ختم ہو گیا۔

شان بے نیازی سے چلتی وہ خوب صورت دوشیزہ اپنے اردگرد سے بے خبر کتابیں اٹھائے اس کی طرف چلی آرہی تھی۔ راشد کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

''ایکسکیوزمی......!'' وہ جیسے ہی راشد کے قریب سے گزرنے لگی راشد کو ہوش آ گیا اور اس نے بولنے کی ابتداء کر ہی دیا۔

وہ رک گئی اور ایک سوالیہ نظر راشد کے چہرے پر ڈالی۔ لیکن راشد اس پری وش کو اپنے اتنے قریب پا کر جیسے قوت گویائی ہی کھو بیٹھا۔ وہ اس کے حسن کے تاج محل میں کھو چکا تھا۔ لڑکی کی سوالیہ نظروں میں غصہ ابھر آیا۔ اور وہ راشد کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگی۔

''ایکسکیوزمی...... رکیے پلیز......!'' اس سے پہلے کہ وہ مزید آگے بڑھتی۔ راشد نے فوراً آگے بڑھ کر اسے روکا۔ ''د...... دیکھئے...... م...... مجھے...... آ...... آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ یہاں سڑک پر مناسب نہیں ہے۔ آ...... آ...... آپ کے صرف دو منٹ چاہئیں۔ یہ سامنے ٹیبل پر آ کر میری بات سن لیں پلیز......!'' راشد نے بے قراری سے کہا۔ پھول کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور وہ بولی۔

''مسٹر آپ جیسے لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہوں میں سمجھے...... یہ نیا طریقہ ڈھونڈا ہے لڑکیوں کو تنگ کرنے کا......؟'' اس کی چمکتی پیشانی پر غصے سے بل پڑ گئے۔ اور وہ آگے بڑھنے لگی کہ راشد نے التجائیہ انداز میں کہا۔ ''آپ کو خدا کا واسطہ...... یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے......''

اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ صرف دو دن پہلے دیکھی ایک لڑکی کے لئے وہ کس حد کو پہنچ گیا ہے۔ نجانے کیوں اسے اس لڑکی کے بنا اپنی زندگی بے معنی نظر آنے لگی تھی۔ جس کا ابھی تک وہ نام بھی نہیں جانتا تھا۔

بہرحال وہ حسن کی پرکالا رک گئی اور ایک لمحے کو کچھ سوچا اور پھر مڑی۔

''چلئے...... لیکن صرف دو منٹ اوکے......!'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ راشد کو تو جیسے دنیا جہان کی دولت مل گئی وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا......

''او...... اوکے......'' کہہ کر وہ دونوں اسی ٹیبل پر جا بیٹھے جس پر راشد روز بیٹھتا تھا۔ ''جی فرمایئے۔ کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ......؟'' لڑکی نے پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے محترمہ۔ سچ کہا تو آپ ناراض ہونگی اور جھوٹ کہا تو میرا آپ کو یہاں بلانا فضول...... آپ بتائیں کیا سنیں گی سچ یا جھوٹ......'' راشد نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھئے جو بھی کہنا ہے جلدی کہیے ورنہ میں جا رہی ہوں......!'' لڑکی نے دوٹوک جواب دیا۔

''چلئے آپ کو سچ اور جھوٹ دونوں بتائے دیتا ہوں۔ جھوٹ یہ ہے کہ میں نے آپ کو ویسے ہی یہاں بلایا ہے جسٹ چائے پینے کے لئے اور سچ......''

''سچ یہ ہے کہ میں آپ سے محبت کرنے لگا ہوں......!'' اور پھر راشد کے منہ میں جو کچھ آیا وہ اپنی محبت کی وکالت میں بولتا گیا۔ نجانے کیا کیا کہہ گیا کہ ایک ہی سانس میں...... اسے آس پاس کا بھی ہوش نہ رہا۔ وہ بس بولتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ لڑکی اٹھ کر بغیر کچھ کہے وہاں سے چلی گئی۔

راشد اسے بھیگی پلکوں سے جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔

راشد اب روز صبح اسی ہوٹل میں جا کر ٹیبل پر بیٹھ جاتا کہ شاید اسے اپنی محبوب ہستی کا دیدار نصیب ہو جائے لیکن دو دن تک اسے وہ لڑکی نظر نہ آئی۔ اور اس بات نے راشد کو مزید بے چین کر دیا۔

تیسرے دن راشد کی توقع کے برخلاف وہ لڑکی ہوٹل میں اندر آ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ راشد کو شدید حیرانی ہوئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی سوچوں کا محور وہ لڑکی خود اس کے سامنے آ کر بیٹھ جائے گی۔

''دیکھئے...... یہ محبت بہت بری چیز ہے۔ آپ میرے بارے میں سوچنا چھوڑ دیجئے، میں آپ کی باتوں کی وجہ سے کافی پریشان تھی اس وجہ سے دو دن ٹیوشن کے لئے بھی نہ جاسکی...... یہ وہ راستہ ہے جس کی کوئی منزل نہیں۔ آپ مجھے بھول جایئے......!'' وہ اٹھنے لگی۔

''میرا خود پر اختیار نہیں ہے۔ آپ جو کوئی بھی ہیں۔ بس اتنا جان لیجئے کہ میری زندگی میں اگر جینے کی کوئی وجہ ہے تو وہ صرف آپ ہیں......!'' راشد نے دو ٹوک کہہ دیا۔ سے اس بات کی قطعی پرواہ نہیں تھی کہ لڑکی کے چہرے پر کس طرح کے تاثرات ابھرے......اور وہ پہلے کی طرح کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔

اگلے دن سے راشد نے اس کے رویے میں واضح تبدیلی محسوس کی۔ وہ راشد کو ہر روز اسی ٹیبل پر بیٹھے دیکھتی اور کبھی کبھی ہلکا سا تبسم اس کے ہونٹوں کو مزید رونق بخش دیتا۔ راشد کو اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اور پھر وہ دونوں قریب آنے لگے۔ ان کے درمیان اسی ہوٹل میں ملاقاتیں شروع ہوئیں۔

اس لڑکی کا نام مائدہ تھا۔ مائدہ اس دنیا میں اپنی ماں کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ مائدہ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی اور اس کی ماں سلائی کڑھائی کر کے دو وقت کی روٹی کھالیتے تھے۔ مائدہ کے والد اس کے بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے۔ اور ماں نے اسے ممتا کے ساتھ ساتھ باپ کی شفقت بھی دی تھی۔ مائدہ راشد سے پیار تو کرنے لگی تھی لیکن راشد بہت امیر کبیر گھرانے اور اسٹیٹس کا مالک تھا جبکہ مائدہ ایک انتہائی غریب گھر میں پلی بڑھی تھی اور یہ اونچ نیچ کا فرق اسے پریشان کئے دے رہا تھا کہ آخر راشد کے آس پاس کے امیر کبیر دوست احباب کیونکر اس رشتے پر رضامند ہو جائیں گے۔ لیکن راشد نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ جینا مرنا میرا تمہارے ہی ساتھ ہے۔ اور اس کے لئے وہ سب کو چھوڑ سکتا ہے۔ اس لئے وہ قدرے مطمئن ہو گئی تھی۔

راشد کے دل سے دلہن کا واقعہ یکسر نکل چکا تھا۔ وہ زندگی کی رعنائیوں میں کھونے لگا تھا اپنی محبت کی کامیابی اسے دنیا کی سب سے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

اور پھر راشد کی نسبت مائدہ سے طے کر دی گئی، دونوں بے انتہا خوش تھے، مائدہ چونکہ غریب گھرانے سے تھی اس لئے فنکشن نہایت سادہ اور نفیس طریقے سے ترتیب دیا گیا۔ راشد کے دوست احباب وغیرہ نے شروع میں کافی باتیں بنائیں لیکن انہیں راشد کی ضد کا بخوبی علم تھا اس لئے وہ راشد کی خوشی میں خوش ہو گئے۔

شادی دو مہینے بعد ہونا طے پائی۔ مائدہ نے راشد کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ اس کی فیملی میں نسبت طے ہونے کے بعد سے شادی ہونے تک لڑکے لڑکی کا ایک دوسرے سے ملنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس نے اس وجہ سے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ اور دوسری طرف راشد بھی یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد وہ آخر کو اسے پا ہی لے گا۔

دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اور پھر ہر طرف خوشیاں رقص کرنے لگیں۔ لیکن کون جانتا تھا کہ اس خوشیوں بھری بہار کے پیچھے کتنا غمگین دکھ بھرا موسم آنے والا ہے۔

آنے والے سہانے دنوں کے سپنے دیکھتے دیکھتے راشد کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ بستر پر چت لیٹا مائدہ کے سپنوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ نیند کی وادیوں میں بسنے والوں کا ساتھی بن گیا......

''چھن...... چھن...... چھن...... چھن...... گھنگھرو کی مدھر سی آواز اس کے کانوں میں پڑتے ہی اس نے آنکھیں کھول دیں...... ہر طرف سناٹا اور خاموشی تھی۔

وال کلاک رات کے 2 بجا رہی تھی...... اس نے اپنا وہم سمجھ کر سائیڈ بدلا اور آنکھیں موند لیں......

''چھن...... چھن...... چھن......'' ایک مرتبہ پھر سے وہی چھن چھناتی آواز اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر گئی۔

چاند کی روشنی کھڑکی کے شیشوں سے اندر آ رہی تھی اور ماحول بڑا خوابناک ہو رہا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے

بھی اٹھ بیٹھا۔ آواز نیچے سے آرہی تھی۔ وہ اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر نیچے آگیا۔ لیکن وہاں ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ اور سب نوکر وغیرہ اپنے کوارٹر میں سو رہے تھے۔ دلہن کا واقعہ جو پہلے بھی اس کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ وہ اس کے ذہن میں گھومنے لگا۔ ''تو کیا پھر سے......!'' اور یہ سوچ کر اسے خوف سے جھرجھری آگئی۔ اور تصدیق کرنے کے لئے وہ کچھ اور سوچے بغیر باہر لان کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر وہی منظر راشد کے سامنے تھا۔ جس کا اسے ڈر تھا۔

''دلہن......! اپنی تمام تر رعنائیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ لان کے کونے میں اپنا لال لہنگا پہنے بیٹھی تھی۔ راشد کا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی سینے سے باہر آجائے گا...... خوف سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں...... چھن...... چھن...... چھن کرتی پازیب کے ساتھ وہ راشد کے قریب آئی اور پھر وہی منظر......

دلہن کا وجود خون میں نہلا دیا گیا اور راشد ایک چیخ مار کر خوف کے مارے وہیں لان میں گر کر بے ہوش ہوگیا......

''صاحب جی...... اٹھیں صاحب جی......'' صبح راشد کی آنکھ اس کے نوکر رفیق کی آواز پر کھلی وہ لان میں پڑے راشد کو دو نوکروں کی مدد سے اٹھا کر اندر کمرے میں لایا۔

''صاحب جی خیریت تو ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ آپ لان میں...... کیوں......؟''

''ہوں...... آں...... ہا...... ہاں...... کچھ نہیں۔ تم چائے بناؤ جا کر......'' اور راشد نے بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے ان سب کو بھیج دیا۔

ناشتے کی ٹیبل پر اسے رات کا واقعہ یاد آگیا۔ ''دلہن...... نجانے کون ہے وہ...... آخر میرا اس کا کیا تعلق ہے...... کیوں پڑگئی ہے میرے پیچھے......؟'' کئی سوالات اس کے ذہن میں ابھرے جن کے سامنے واضح طور پر بڑا سا سوالیہ نشان تھا......!

راشد کے ساتھ دلہن کا دل دہلا دینے والے واقعات ایک مرتبہ پھر سے شروع ہوچکے تھے۔ کبھی وہ راشد کو رات میں نظر آتی کبھی دن کے وقت...... اور ہر بار انتہائی دہشت ناک منظر دکھائی دیتا جسے راشد دیکھ بھی نہ پاتا...... اس کی صحت دن بہ دن خراب ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کا اثر اس کے بزنس پر پڑنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مہینے میں وہ بالکل کنگال ہوگیا...... ہر طرف مایوسی نے ڈیرے ڈال لئے۔ لیکن ان حالات کا ذکر کرتا بھی تو کس سے...... مائدہ سے ملنا ویسے ہی بند ہوچکا تھا۔ ایک دو بار وہاں جا کر اسے بتانے کی کوشش بھی کی لیکن بے سود......

مائدہ تک کسی نے اس کے پستہ حال ہونے کی خبر پہنچادی تھی اور اس نے جواب میں صرف اتنا پیغام بھجوایا......

''راشد تم سے تمہاری دولت کی وجہ سے رشتہ نہیں جوڑا تھا۔ بے فکر رہو چاہے کچھ بھی ہوجائے میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔''

مائدہ کے اس پیغام نے جیسے اس کے اندر کی رہی سہی زندگی میں پھول کھلا دیئے۔ لمحہ بھر کے لئے اسے اپنی قسمت پر رشک ہونے لگا کہ اسے ایسی محبت کرنے والا بھی کوئی تھا...... اس کا دل بے حد مطمئن ہوگیا تھا...... شادی کی تیاریاں جو اس کی طرف سے زور وشور سے جاری تھیں۔ وہ بری طرح متاثر ہوئی تھیں...... اس نے کیا کیا خواب سجائے تھے آنکھوں میں لیکن اب اس کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ وہ اپنی خواہشات پوری کر پاتا۔ اسے تو دن رات یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ آخر مائدہ کو اپنے ساتھ پیش آنے والے ناقابل یقین واقعات کیسے بتائے گا۔ ''اور کیا وہ تب بھی میرے ساتھ رہنا چاہے گی...... کیا وہ یقین کرلے گی...... اور کیا وہ دلہن مائدہ کو میرا ہونے دے گی؟'' عجیب عجیب سے وسوسے اسے دن رات پریشان کئے دے رہے تھے۔

وہ ہمت کر کے ایک دو بار دلہن سے پوچھ چکا تھا کہ ''آخر وہ کون ہے اور کیوں اسے پریشان کر رہی ہے آخر اس کا مقصد کیا ہے؟'' اور جواب میں وہ اتنا

بھی اٹھ بیٹھا۔ آواز نیچے سے آرہی تھی۔ وہ اٹھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر نیچے آ گیا۔ لیکن وہاں ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ اور سب نوکر وغیرہ اپنے کوارٹر میں سو رہے تھے۔ دلہن کا واقعہ جو پہلے بھی اس کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ وہ اس کے ذہن میں گھومنے لگا۔ ''تو کیا پھر سے......!'' اور یہ سوچ کر اسے خوف سے جھرجھری آ گئی۔ اور تصدیق کرنے کے لئے وہ کچھ اور سوچ بغیر باہر لان کی طرف بڑھ گیا۔ اور پھر وہی منظر راشد کے سامنے تھا۔ جس کا اسے ڈر تھا۔

''دلہن......! اپنی تمام تر رعنائیوں اور ہولناکیوں کے ساتھ لان کے کونے میں اپنا لال لہنگا پہنے بیٹھی تھی۔ راشد کا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا جیسے ابھی سینے سے باہر آجائے گا...... خوف سے اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں...... چھن...... چھن...... چھن کرتی پازیب کے ساتھ وہ راشد کے قریب آئی اور پھر وہی منظر......

دلہن کا وجود خون میں نہلا دیا گیا اور راشد ایک چیخ مار کر خوف کے مارے وہیں لان میں گر کر بے ہوش ہو گیا......

''صاحب جی...... اٹھیں صاحب جی......'' صبح راشد کی آنکھ اس کے نوکر رفیق کی آواز پر کھلی وہ لان میں پڑے راشد کو دو نوکروں کی مدد سے اٹھا کر اندر کمرے میں لایا۔

''صاحب جی خیریت تو ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔ آپ لان میں...... کیوں......؟''

''ہوں...... آں...... ہا...... ہاں...... کچھ نہیں۔ تم چائے بناؤ جا کر......'' اور راشد نے بوجھل آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے ان سب کو بھیج دیا۔

ناشتے کی ٹیبل پر اسے رات کا واقعہ یاد آ گیا۔

''دلہن...... نجانے کون ہے وہ...... آخر میرا اس کا کیا تعلق ہے...... کیوں پڑ گئی ہے میرے پیچھے......؟'' کئی سوالات اس کے ذہن میں ابھرے جن کے سامنے واضح طور پر بڑا سا سوالیہ نشان تھا......!

راشد کے ساتھ دلہن کا دل دہلا دینے والے واقعات ایک مرتبہ پھر سے شروع ہو چکے تھے۔ کبھی وہ راشد کو رات میں نظر آتی کبھی دن کے وقت...... اور ہر بار انتہائی دہشت ناک منظر دکھائی دیتا جسے راشد دیکھ بھی نہ پاتا...... اس کی صحت دن بہ دن خراب ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ اس کا اثر اس کے بزنس پر پڑنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مہینے میں وہ بالکل کنگال ہو گیا...... ہر طرف مایوسی نے ڈیرے ڈال لئے۔ لیکن ان حالات کا ذکر کرتا بھی تو کس سے...... مائدہ سے ملنا ویسے ہی بند ہو چکا تھا۔ ایک دو بار وہاں جا کر اسے بتانے کی کوشش بھی کی لیکن بے سود......

مائدہ تک کسی نے اس کے پستہ حال ہونے کی خبر پہنچا دی تھی اور اس نے جواب میں صرف اتنا پیغام بھجوایا......

''راشد تم سے تمہاری دولت کی وجہ سے رشتہ نہیں جوڑا تھا۔ بے فکر رہو چاہے کچھ بھی ہو جائے میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔''

مائدہ کے اس پیغام نے جیسے اس کے اندر کی رہی سہی زندگی میں پھول کھلا دیئے۔ لمحہ بھر کے لئے اسے اپنی قسمت پر رشک ہونے لگا کہ اسے ایسی محبت کرنے والا بھی کوئی تھا...... اس کا دل بے حد مطمئن ہو گیا تھا...... شادی کی تیاریاں جو اس کی طرف سے زور و شور سے جاری تھیں۔ وہ بری طرح متاثر ہوئی تھیں...... اس نے کیا کیا خواب سجائے تھے آنکھوں میں لیکن اب اس کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ وہ اپنی خواہشات پوری کر پاتا۔ اسے تو دن رات یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ آخر مائدہ کو اپنے ساتھ پیش آنے والے ناقابل یقین واقعات کیسے بتائے گا۔ ''اور کیا وہ تب بھی میرے ساتھ رہنا چاہے گی...... کیا وہ یقین کرلے گی...... اور کیا وہ دلہن مائدہ کو میرا ہونے دے گی؟'' عجیب عجیب وسوسے اسے دن رات پریشان کئے دے رہے تھے۔

وہ ہمت کر کے ایک دو بار دلہن سے پوچھ چکا تھا کہ ''آخر وہ کون ہے اور کیوں اسے پریشان کر رہی ہے آخر اس کا مقصد کیا ہے؟'' اور جواب میں وہ اتنا

ہی کہتی......

''تم نے......تم نے میری مہندی کا رنگ خراب کیا ہے، تم نے میری زندگی کے خواب چھین لئے۔'' اور پھر سے اس پر خون کی بارش ہو جاتی۔ راشد حیران و پریشان اپنے ماضی کے تانے بانے میں کھو جاتا کہ کہیں زندگی میں کبھی کسی جوان لڑکی سے اس نے انجانے میں کوئی زیادتی تو نہیں کی۔ لیکن ایسا کچھ بھی اس نے نہیں کیا تھا۔ ذہن پر بہت زور دینے کے بعد بھی اسے کچھ ایسی بات یاد نہ آئی۔ اس کا مائدہ کے علاوہ کسی لڑکی سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔

بہر حال راشد کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے اور وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ بالکل اس شعر کی طرح۔

حالات میرے مجھ سے نہ معلوم کیجئے
مدت ہوئی ہے خود سے میرا واسطہ نہیں

ابھی راشد ان بکھرے حالات میں الجھا ہوا ہی تھا کہ ایک خبر بجلی بن کر اس پر گری......

مائدہ کے گھر پر رات کے اندھیرے میں چوروں نے دھاوا بول دیا اور مزاحمت کرنے پر فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں مائدہ شدید زخمی جبکہ اس کی ماں موقع پر جاں بحق ہو گئی تھی......

راشد پر پہلے کم دکھ نہیں تھے کہ اب یہ خبر...... مائدہ......اس کی زندگی کا حاصل......اس کی خوشیوں کا محور...... اسپتال میں زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا تھی......

راشد دکھ اور پریشانی سے بے حال ہونے لگا......

راشد انتہائی دکھ اور پریشانی کے عالم میں گرتا پڑتا اسپتال اپنی مائدہ کو دیکھنے پہنچا۔

ایک گولی مائدہ کے کاندھے اور دوسری سر کو چھو کر گزری تھی۔ مگر وہ بہت بری حالت میں تھی۔ خون کی بوتلیں اسے چڑھائی جا رہی تھیں۔ نرس نے رجسٹر میں کچھ درج کیا اور انجکشنز کا ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اب وہاں صرف راشد تھا اور کی بے ہوش پڑی مائدہ......

شدت غم سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے وہ بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور چہرہ بیڈ سے لگا کر رونے لگا...... اچانک اسے محسوس ہوا جیسے بیڈ کی چادر تیزی سے سرکی ہو۔ اس نے فوراً مائدہ کی طرف دیکھا۔ جس نے اپنا ہاتھ تیزی سے پیچھے کھینچا تھا۔

وہ آنکھیں کھول کر راشد کی طرف دیکھ رہی تھی...... راشد کے چہرے پر خوشی کے آثار اُمڈ آئے لیکن یہ خوشی عارضی تھی۔

مائدہ اچانک ایک جھٹکے سے اٹھ کر سیدھی بیٹھ گئی۔

''کیوں راشد ڈارلنگ...... کیا ہوا...... درد ہو رہا ہے...... ہاہاہاہا......'' مائدہ کے منہ سے اس کے بجائے ''دلہن'' کی آواز سن کر راشد زناٹے میں آ گیا۔ ''مجھے بھی ہوا تھا......تم نے......تم نے میری مہندی کا رنگ خراب کر دیا تھا ناں......'' راشد خوف سے کانپ رہا تھا۔ ڈر کے مارے وہ پیچھے ہٹتا ہوا دیوار سے لگ گیا۔

''ہاہاہاہا...... میں اسے نہیں چھوڑوں گی...... اور تب تک اس کے جسم میں رہوں گی جب تک اس کی روح نہیں نکل جاتی......'' اور پھر ایک جھٹکے سے مائدہ کا جسم بیڈ پر گر گیا اور وہ پہلے کی طرح بے ہوش ہو گئی۔ لیکن راشد دہشت کے مارے کافی دیر وہیں کھڑا رہا۔ اپنی تمام تر ہمت اکٹھی کر کے راشد مائدہ کے جسم پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے باہر نکلنے لگا۔ کہ پیچھے سے اسے مائدہ کی آواز آئی۔

''را......راشد......!'' اس نے بے قراری سے مڑ کر دیکھا تو نیچے کی سانس نیچے اور اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ مائدہ کے بازو پر خون کا ایک چھوٹا سا دھبہ تھا جو دھیرے دھیرے بڑا ہو رہا تھا۔ اور اس سے خون کی بوندیں نکلنے لگیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے ''دلہن'' کی مہندی سے نکلتی تھیں۔

راشد دکھوں کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ کوئی سرا تلاش نہیں کر پا رہا تھا کہ آخر کس طرح اس مشکل سے مائدہ اور خود کو نکالے...... مائدہ کی حالت بھی بہت خراب تھی اور اسے مستقل طور پر طبی امداد دی جا رہی

تھی۔ نجانے کیوں راشد کو اپنا آپ مائدہ کا مجرم نظر آنے لگا۔ اس بچاری پر یہ مصیبت میری وجہ سے آئی ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ بہت خوش اور پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ نہ میں اس کی زندگی میں آتا اور نہ یہ سب کچھ ہوتا......'' راشد نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ''آخر کیا کروں......؟ کہاں جاؤں میں......؟ کون ہو تم......؟ کیوں میرے پیچھے پڑی ہو......؟ آخر کیوں......؟ کیا چاہتی ہو......؟''

''موت......! مائدہ کی موت...... تمہاری موت......'' کمرے میں دلہن کی بھیانک آواز گونجی۔ وہ سامنے کی دیوار کے پاس کھڑی قہر برساتی نظروں سے راشد کو گھور رہی تھی۔ اس کا لہجہ انتہائی غضبناک تھا۔ راشد کا دل دہل گیا۔

شان بے نیازی سے پازیب کو چھن چھناتی وہ راشد کے قریب آئی۔ وہ انتہائی حسین تھی۔ اتنی حسین دلہن راشد نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ لیکن آج اس کا حسن راشد کو بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ لال سرخ لہنگا اور چولی کے ساتھ میچنگ دوپٹہ جو دلہن کی طرح اس نے سر پر اوڑھ رکھا تھا اس پر بہت جچ رہا تھا۔ ہلکا سا زیور پہنے وہ انتہائی سادہ مگر خوب صورت لگ رہی تھی۔ سرخ یاقوتی ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔

''ہی ہی ہی......'' بہت ہلکی اور دلفریب ہنسی کے ساتھ وہ راشد کے قریب سے گزری اور پچھلی دیوار کے اندر گھستی چلی گئی۔

ہمیشہ کی طرح راشد خوف و دہشت کے آسیب میں جکڑا ہوا تھا۔ اس کی زبان خاموش تھی۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا...... لیکن مسئلہ بہرحال جوں کا توں موجود تھا۔ نہ راشد کی پریشانی ختم ہو رہی تھی۔ نہ مائدہ کی حالت سنبھل رہی تھی اور نہ ہی حالات بہتر ہو رہے تھے۔ اور دلہن کے سامنے ایک ایسا خوف اس پر طاری ہو جاتا کہ وہ کچھ بولنے سے قاصر ہو جاتا...... ورنہ وہ اس سے ضرور پوچھتا کہ ''آخر میں تمہارا بگاڑا کیا ہے......؟ تم ہو کون......؟''

لیکن اب راشد کو لگتا تھا کہ یہ معاملہ سلجھائے بغیر وہ نہ مائدہ کو حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کچھ سوچ کر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

''ہیلو عامر۔ کیسے ہو......؟'' راشد نے اپنے دوست عامر کا نمبر ڈائل کر کے بولنا شروع کیا۔

''ہاں راشد سناؤ کہاں ہو...... کیسے حالات ہیں......؟'' دوسری طرف سے عامر نے رسمی دعا سلام کے بعد حال چال پوچھا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں بس۔ تم سے ایک مدد چاہئے۔''

''ہاں ہاں بولو۔ کیا بات ہے؟'' عامر نے تشویش سے پوچھا۔

''یار وہ تمہارے محلے میں جو بابا جی رہتے ہیں کیا نام ہے ان کا......؟''

''کون۔ مولانا صاحب......؟''

''ہاں ہاں وہی یار ان سے ملنا ہے۔'' راشد نے کہا۔

''کیوں بھئی خیریت تو ہے......؟'' عامر نے پوچھا۔

''ہاں بس تم مجھے پک کرنے آ جاؤ۔ پھر تمہیں بتاتا ہوں......!'' ''اوکے۔ I am Coming'' عامر نے کہا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

''عامر راشد کا گہرا دوست تھا۔ دونوں کی دوستی کو زیادہ عرصہ تو نہیں گزرا تھا لیکن دونوں اتنے قریبی تھے جیسے جگری دوست...... لیکن راشد نے دلہن والی بات عامر سے پھر بھی Share نہیں کی تھی۔ عامر حسب وعدہ جلد ہی راشد کو لینے پہنچ آیا اور راشد نے ساری بات مختصراً اس کے گوش گزار کر دی جسے سن کر عامر بھی بہت پریشان ہو گیا۔

ان دونوں کا رخ مولانا صاحب کے آستانے کی طرف تھا۔ مولانا صاحب کا اصل نام سعید فخرالدین تھا

وہ محلے اور آس پاس کے حاجت مندوں کے مسائل سنتے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل بتاتے تھے اور یہ کام وہ فی سبیل اللہ کرتے تھے۔ کسی سے کوئی پیسہ نہ لیتے تھے۔ محلے میں انہیں انتہائی عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور انہیں ہر کوئی ''مولانا صاحب'' کے نام سے جانتا تھا۔

بہرحال راشد اور عامر ان کے آستانے پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔ لوگوں کا کافی رش تھا۔ وہ دونوں وقت گزاری کے لئے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے کہ ایک چھوٹا لڑکا آیا اور ان سے بولا۔

''مولانا صاحب نے آپ دونوں کو اندر بلایا ہے......! دونوں لمحہ بھر کو حیران ہوئے کہ ابھی تو ان کی باری میں کافی ٹائم ہے۔ اور کافی لوگ پہلے سے انتظار کر رہے ہیں......تو پھر مولانا صاحب نے انہیں خود اتنا پہلے کیسے بلالیا......؟ اور مولانا صاحب کو ان کے آنے کی اطلاع کس نے دی۔

خیر وہ دونوں مولانا صاحب کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ راشد کچھ کہتا مولانا صاحب خود بولے۔

''بیٹا مجھے اپنے پاس آنے والے لوگوں کی مشکل کے بارے میں پہلے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ کرم ہے اللہ کا مجھ پر......تمہارے مسئلے کا پوری طرح مجھے علم نہیں ہے ہاں بس اتنا جانتا ہوں کہ کوئی بے گناہ ہے جو زندگی اور موت کے بیچ ہماری مدد کا منتظر ہے اور وہ بہت ہی مشکل میں ہے۔''

مولانا صاحب کا اشارہ مائدہ کی طرف تھا اور پھر راشد نے انہیں سب کچھ بتا دیا جس کی وجہ سے وہ وہاں مدد کی درخواست لے کر آیا تھا۔ کچھ دیر بعد اسی لڑکے کو مولانا صاحب نے بلا کر کچھ سمجھایا تو وہ سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا اور خود راشد سے بولے۔

''چلو ہمیں ابھی اسپتال چلنا ہوگا......!''

اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ تینوں اسپتال میں مائدہ کے پاس موجود تھے۔ مولانا صاحب نے مائدہ کے

میری ذات

کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس دنیا میں بکھرے ہوئے لوگوں کے دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لوں۔ کسی کی پلکوں میں لرزتے ہوئے آنسو ایک ایک کر کے اپنے دل میں اتار لوں اور خود ایک سمندر کی طرح بن جاؤں، میرا ظرف اتنا اعلیٰ ہو جائے کہ میں بڑی سے بڑی خطا کو بھی معاف کر دوں، نظر انداز کر دوں۔ اپنی ذات کو مٹا دوں۔ اپنے آپ کو فنا کر دوں، میری ذات دوسروں کے لئے وقف ہو جائے، میں ایک شمع کی مانند بن جاؤں جو خود اندھیرے میں رہ کر دوسروں کو روشنی دیتی ہے۔

(محمد خالد شاہان۔ صادق آباد)

ماتھے پر ہاتھ رکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا۔ پھر آنکھیں کھول کر راشد کی طرف دیکھا۔

''بیٹا یہ وہی لڑکی ہے جس سے تمہاری شادی ہونے والی تھی کوئی بھوت پریت، جن یا روح اس کے جسم میں اس وقت موجود نہیں ہے......؟''

''تو پھر......؟'' راشد نے پریشان ہوتے ہوئے کہا......اور جیسے ہی اس کی نظریں دروازے پر پڑیں وہاں 'دلہن' کو دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ''و...... وہ...... وہ......مم...... مولانا صاحب۔ وہ وہاں ہے......!'' راشد نے دروازے کی طرف اشارہ کیا جہاں دلہن اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ لیکن عامر اور مولانا صاحب کو وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

''ہوں......چلو کوئی بات نہیں ہے۔ اسے بھی ابھی سامنے لے آتے ہیں۔ تم دونوں بس خاموشی سے بیٹھے رہے اور جو بھی نظر آئے ڈرنا مت۔ تم دونوں کو اس وقت کوئی غیبی طاقت نقصان نہیں پہنچا سکتی۔'' اور پھر وہیں زمین پر مولانا صاحب انگلی سے ایک دائرہ لگا کر بیٹھ گئے اور کچھ پڑھنے لگے۔

کمرے کا ماحول بدلنے لگا اور ہلکا ہلکا دھواں سا

کمرے میں بھر گیا۔ مولانا صاحب کی آنکھیں بند تھیں۔ اور وہ مسلسل کچھ پڑھے جارہے تھے۔ کمرے کا سارا دھواں دیکھتے ہی دیکھتے مولانا صاحب کے سامنے دائرے کے باہر اکٹھا ہونے لگا۔ اور پھر اس میں ''دلہن'' کا سراپا ابھرنے لگا۔ راشد نے دروازے پر نظر ڈالی لیکن اب وہ وہاں نہیں تھی۔

مولانا صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ دودھیا وجود میں نہائی وہ ''دلہن'' آج بھی بہت حسین لگ رہی تھی۔

''السلام علیکم...... حضرت...... آپ نے مجھے بلایا......'' جلترنگ بجاتی سریلی آواز میں دلہن نہایت ادب سے مولانا صاحب سے مخاطب ہوئی ''وعلیکم السلام...... کون ہو تم......؟ کیوں ان معصوموں کو پریشان کررہی ہو......؟'' مولانا صاحب نے سوال کیا ان کے لہجے میں غصہ نہیں شکایت تھی۔

''حضرت آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ کیونکہ میں بھی مسلمان ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔ میں ان دونوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اور اس کو تو قطعاً نہیں......!'' راشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دلہن نے ادب و احترام کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن بیٹی...... آخر کیوں......؟ تم جانتی ہو کہ یہ بے قصور ہے۔ پھر کیوں مارنا چاہتی ہو اسے......'' مولانا صاحب نے مائدہ کے بے سدھ پڑے وجود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''بے قصور......؟ مولانا صاحب اس سے پوچھیں کہ میری ماں بھی تو بے قصور تھی میں بھی تو بے قصور تھی......'' قہر برساتی نظروں سے دلہن نے راشد کو دیکھا۔

''مولانا صاحب بہتر ہوگا کہ آپ اس سے میرے بارے میں پوچھیں پھر بتائیں کہ میں کیا غلط ہوں......؟'' اور دکھ بھری آواز کے ساتھ وہ غائب ہوگئی۔

جبکہ مولانا صاحب راشد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ''تم نے کسی کے ساتھ زیادتی کی تھی......؟ یاد کرو...... کیونکہ تمہارے مسئلے کا حل اب تمہارے ہی پاس ہے۔ یاد کرو......!'' مولانا صاحب اس مرتبہ غصے سے راشد سے ہم کلام ہوئے۔

''میں نے کسی لڑکی کے ساتھ کبھی زیادتی نہیں کی کبھی کسی کی ماں...... ماں......'' اور راشد سوچ میں پڑ گیا......!

☆......☆......☆

اس کے والدین بچپن میں ہی ایک ایکسیڈنٹ میں دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ راشد کو 6 سال کی عمر سے دنیا کی بے رحم موجوں کا اکیلے ہی سامنا کرنا پڑا۔ بری صحبت میں رہ کر اس کا ذہن بھی انہی لوگوں کی طرح سوچنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ اس پر دولت کمانے کا بھوت سوار ہوگیا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس نے اپنے اوباش دوستوں کے ہمراہ چھوٹی موٹی چوریاں شروع کردیں۔ ان کے سربراہ نے اسے اپنی حفاظت اور کامیاب واردات کے لئے ایک پستول بھی دے دیا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک غریب بستی میں چوری کرنے کا منصوبہ بنایا......

راشد سمیت وہ کل تین لڑکے تھے وہ تیزی سے گھروں کی چھتیں عبور کررہے تھے کہ ان میں سے ایک کا پاؤں پھسلا اور وہ ایک گھر کی چھت پر ہی گر گیا۔

دوسرا اسے اٹھانے میں لگ گیا۔ ''چلو جلدی کرو...... اٹھو......'' راشد نے آگے سے کہا۔ ''نہیں یار میں اور نہیں چل سکتا۔ ہم کل یہ کام کریں گے مجھ سے چلا نہیں جارہا۔'' اس نے کہا کیونکہ اس کے پاؤں میں سائیڈ سے ایک بڑا کانچ گھس گیا تھا اور اس کا بہت خون بہہ رہا تھا۔

''ہاں یار چل چلتے ہیں کل آجائیں گے......!'' دوسرے نے بھی حمایت کی۔ لیکن راشد واپس جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ ''میں واپس نہیں جارہا۔ تم لوگوں کو جانا ہے تو جاؤ میں آج کا کام کل پر نہیں چھوڑتا...... جاؤ تم لوگ......!'' راشد انہیں اپنا فیصلہ سنا چکا تھا۔

اس کی آواز اتنی تیز تھی کہ اس گھر کے ایک مکین کی آنکھ کھل گئی اور وہ دھیرے دھیرے اوپر چڑھنے لگا۔

راشد کے دونوں ساتھی پہلے ہی واپس مڑ گئے تھے اور اب وہ گرتے پڑتے تیسرے گھر کی چھت پر پہنچ گئے تھے۔ جبکہ راشد وہیں کھڑے ہوئے انہیں جاتا دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اب وہ اکیلا کہاں اور کیسے چوری کرے۔

''چور چور چور......'' اس آدمی نے راشد کو دیکھتے ہی شور مچادیا جس پر راشد گھبرا گیا۔ فوراً ہی آس پاس کے لوگ جاگ گئے۔ راشد کے دوستوں کو تو پکڑ لیا گیا لیکن راشد جیسے چھلاوا سا بن کر ایک سے دوسرے گھر کو عبور کرتے ہوئے بہت دور نکل گیا۔ اور اب لوگوں کی آوازیں بھی اسے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ گھبراہٹ میں آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ تمام کچے پکے گھروں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ اور وہ بھاگتا چلا جارہا تھا۔ کبھی کوئی دیوار اونچی ہوتی کبھی نیچی تو وہ ہمت کرکے اسے عبور کرہی لیتا۔

اس کی سانسیں پھول چکی تھیں۔ ایک کچے سے گھر کی چھت پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ اور اپنی بے ترتیب سانسیں بحال کرنے لگا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھل بھی نہ پایا کہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے اندھیرے میں چھت پر اس کا سایہ دیکھتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''کون ہے اوپر......؟'' راشد نے گھبراہٹ کے عالم میں ایک چھلانگ لگائی لیکن اس کا پاؤں بری طرح مڑ چکا تھا۔ اور وہ ''آہ......'' اف کرتا چھت پر ہی گر گیا...... دوسری طرف وہ عورت جلدی جلدی اوپر آرہی تھی۔ آس پاس کے لوگ ابھی نہیں جاگے تھے۔ راشد نے پینٹ کی جیب میں اڑسا پستول نکالا اور مطمئن ہوگیا کیونکہ اس کے پستول کو وہ ہمیشہ کی طرح سائلنسر لگانا نہیں بھولا تھا۔ اس نے پستول کا رخ سیڑھیوں کی طرف کرکے نشانہ بنایا اور جیسے ہی عورت کا سر نظر آیا اس نے فائر کردیا...... خاموش فائر......

پھر کسی طرح خود کو گھسیٹتے ہوئے وہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا اور ایک پل کو بھی اس نے مڑ کر نہ دیکھا کہ پیچھے کیا ہوا۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ واقعہ اس کے دماغ سے نکل گیا اسے دولت ملی اور بے پناہ ملی اور پھر اس نے چوری بھی چھوڑ دی۔ اپنا بزنس اسٹیبلش کرکے خود شاہانہ زندگی گزارنے لگا۔

یہ ساری کہانی راشد نے مولانا صاحب کے گوش گزار کردی۔ ''تم نے بہت برا کیا۔ وہ عورت بھی کسی کی ماں تھی شاید...... اب جاؤ اور خود تلاش کرو کہ وہاں حقیقتاً ہوا کیا تھا......!'' مولانا صاحب نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''لیکن یاد رکھنا تمہارے پاس وقت بہت کم ہے......''

☆......☆......☆

''السلام علیکم......!'' راشد نے سلام کیا۔ ''وعلیکم السلام''

''جی آپ سے اس مکان کے بارے میں پوچھنا ہے اس کے مکین کہاں گئے۔ کیا آپ کچھ بتاسکتی ہیں......؟''

عورت نے ایک اچٹتی سی نظر راشد پر ڈالی اور بولی۔ ''پوچھو کیا پوچھنا ہے...... یہاں تو کوئی نہیں رہتا یہ بند پڑا ہے کافی عرصہ سے۔ لوگ اس گھر کے متعلق طرح طرح کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔''

''لیکن......؟ یہاں کون رہتا تھا......؟'' راشد نے پوچھا۔

''میاں...... تمہیں کچھ نہیں معلوم کیا......؟ وہ عورت بولی۔

''جی نہیں، پلیز، میری مدد کیجئے۔ مجھے بتایئے......'' راشد نے بے قراری سے کہا۔

''آؤ اندر آجاؤ......!'' عورت نے اسے اندر بلالیا اور وہ صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''یہاں جمیلہ آپا اپنی اکلوتی بیٹی فرزانہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ فرزانہ بہت خوب صورت تھی۔ وہ ایک لڑکے سہیل کو پسند کرتی تھی اور ان کی شادی بھی ہونے والی تھی۔ اس رات فرزانہ کی سکھیاں اسے مہندی لگا کر اپنے گھروں کو چلی گئیں اور فرزانہ دلہن بنی رات گئے اپنی مہندی کو دیکھ کر خوش ہورہی تھی کہ اچانک چھت سے مٹی

کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ پر گرا اور اس کی مہندی خراب کر گیا۔ وہ بہت غریب لوگ تھے اور اس کچے گھر میں بڑی مشکل سے گزارا کر رہے تھے۔ فرزانہ اپنی مہندی دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اور ہاتھ دھونے کے لئے باہر آئی بیٹا ہم لوگوں کا یہ ماننے ہے کہ دلہن کے ہاتھوں کی مہندی کا خراب ہونا برا شگون ہے جب فرزانہ باہر آئی تو ماں کو بستر پر موجود نہ پا کر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو جیسے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ خون میں لت پت اس کی ماں آخری سانسیں لے کر بے سدھ ہوگئی۔ فرزانہ کا دنیا میں واحد سہارا اس کی بوڑھی ماں جمیلہ آپا ہی تھیں۔

شادی کا گھر ماتم کدہ بن چکا تھا اور فرزانہ کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ پھیل چکا تھا......

پھر راتوں رات ہی مالک مکان نے آ کر فرزانہ کو اغوا کروالیا۔ وہ شروع سے ہی فرزانہ پر بری طرح نظر رکھتا تھا۔ فرزانہ سے زبردستی نکاح رچالیا اور ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ فرزانہ نے اسی رات کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے اپنی نبض کاٹ کر زندگی کا خاتمہ کرلیا۔‘‘

راشد ساری کہانی جان کر کانپ اٹھا۔ ’’اوہ...... میرے خدایا......‘‘ اس نے سر پکڑ لیا...... ’’یہ میں نے کیا کردیا......‘‘ اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کی وجہ سے کسی پر کتنی بڑی قیامت گزر چکی تھی۔

☆......☆......☆

’’یہ تو بہت برا ہوا......! مولانا صاحب نے تشویش آمیز اور دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ اس کا مطلب ہے فرزانہ نامراد ہی دنیا سے چلی گئی اور اس کی روح آج تک بھٹک رہی ہے۔ وہ بچی بے قصور تھی...... اس کی ماں بھی بے قصور تھی اور اب وہ تم سے اپنی بربادی کا حساب لینا چاہتی ہے......!‘‘

’’ہمیں اس کے گھر میں جا کر ہی اسے بلانا اور درخواست کرنا پڑے گی کہ وہ تم لوگوں کو معاف کردے۔‘‘

راشد مولانا صاحب کے ہمراہ فرزانہ کے گھر میں موجود تھا۔ رات کے 12 بجے کا وقت تھا۔ محلے کے لوگ سو چکے تھے۔ مولانا صاحب صحن کے بیچوں بیچ دائرہ بنا کر بیٹھ گئے جبکہ راشد سیڑھیوں کے ساتھ کھڑا ہوا کر آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنے لگا اسے مائدہ کی بہت زیادہ فکر تھی جسے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا......

اور راشد کی جان اس کی رہی سہی سانسوں میں اٹکی ہوئی تھی۔

مولانا صاحب کچھ پڑھنے لگے اور ماحول میں ہر طرف دھواں پھیل گیا۔

’’چھن۔ چھن...... چھن......‘‘ پازیب کی اسی دلفریب آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی خوب صورت دلکش دلہن دودھیا دھوئیں میں لپٹی مولانا کے سامنے آ کر دائرے سے باہر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ ’’السلام علیکم...... جی مولانا صاحب آپ نے بلایا......!‘‘

انتہائی ادب سے وہ مولانا صاحب سے بولی۔

’’وعلیکم السلام۔ ہاں میں نے ہی بلایا ہے۔ دیکھو بیٹی فرزانہ ہمیں تمہارے متعلق سب پتہ چل چکا ہے۔ جو ہوا وہ بہت برا ہوا۔ لیکن دیکھو یہ اپنے کیے پر شرمندہ ہے اور تم سے معافی کا خواستگار ہے۔ اسے معاف کردو......!‘‘ مولانا صاحب نے راشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جو خود بھی انتہائی شرمندہ و افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ دلہن نے ایک نظر راشد پر ڈالی اور مولانا صاحب کی طرف دیکھ کر بولی۔

’’مولانا صاحب۔ اپنا خون تو میں اسے معاف کرسکتی ہوں۔ لیکن میری بے قصور ماں...... میری ماں کا خون میں معاف نہیں کرسکتی......؟‘‘

’’لیکن بیٹا۔ مائدہ کی ماں بھی تو بے قصور تھی۔ دیکھو وہ بھی تو چوروں کے ہاتھوں بے گناہ مرگئی۔‘‘

’’انہیں میں نے نہیں مارا...... قدرت نے خود اپنا حساب برابر کردیا۔‘‘ دلہن نے اپنی صفائی میں کہا۔

’’لیکن کیا مائدہ اور راشد کو مار کر تمہیں سکون مل جائے گا......؟ کیا تمہیں تمہاری زندگی تمہاری خوشیاں...... تمہاری ماں...... دوبارہ مل جائے گی۔

دیکھو بیٹا سزا دینے والے سے معاف کردینے والے کا درجہ بہت بڑا ہے۔ تم سے درخواست ہے ان سے دور چلی جاؤ......!'' مولانا صاحب نے کہا۔

''نہیں مولانا صاحب۔ آپ مجھے مجبور مت کریں۔ میرے لئے یہ ناممکن ہے۔ قطعاً ناممکن میں کسی......!'' اور بولتے بولتے اچانک ہی وہ خاموش ہوگئی۔ مولانا صاحب اور راشد اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ اپنی جگہ بت سی بن گئی۔ اس کی لمبی سیاہ نشگی آنکھیں گھر کے دروازے پر مرکوز تھیں۔ جہاں ایک انجان شخص کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ شاید انجان نہ تھا...... حلیے سے وہ کوئی معمولی سا فقیر لگ رہا تھا۔ الجھے ہوئے بال اور میلے کچیلے کپڑوں کے ساتھ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے خبر اس کو دیکھنے میں محو تھا۔

اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ فرزانہ کو جانتا ہے۔ دوسری طرف فرزانہ کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی...... وہ تو جیسے پلکیں جھپکانا ہی بھول بیٹھی تھی۔

''فر...... فر...... فرزا...... نہ'' بمشکل اس شخص کے منہ سے فرزانہ کا نام نکلا۔ راشد اور مولانا صاحب اس صورت حال میں خاموشی سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں خود علم نہ تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اور وہ شخص کون ہے......؟

دلہن کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح بہنے لگے۔ وہ جب سے راشد کو نظر آئی تھی آج پہلی مرتبہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

''فرزانہ...... کہاں چلی گئی تم......'' اس شخص نے روتے ہوئے کہا۔

''سہیل...... آہ......''

میرے محبوب تو کس موڑ پر ملا مجھ کو
اب تو اپنے ہی مقدر سے ہے گلا مجھ کو
کیونکر آیا ہے یہ لمحہ میرے مقدر میں
اے خدا! عشق کا یہ کیا دیا صلہ مجھ کو......!

ٹپ ٹپ کرتے آنسو...... فرزانہ کے رخساروں سے ہوتے ہوئے نیچے گرنے لگے۔ جبکہ دوسری طرف راشد اور مولانا صاحب ''سہیل'' کا نام سن کر چونک پڑے تھے۔

''فرزانہ میں تم سے درخواست کرتا ہوں تم اسے معاف کردو۔ میری بات سے انکار کرکے تم ہماری محبت کا مان مت توڑنا...... تمہیں دنیا میں حاصل نہ کرسکا لیکن اب اس طرح بے سکون رہ کر مجھے مزید اذیت مت دو فرزانہ......'' بھیگی پلکوں اور بھرائی ہوئی آواز سے سہیل نے فرزانہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ فرزانہ نے اس کے ہاتھ دیکھ کر بے قراری سے کہا۔

''نہیں سہیل پلیز...... میرے سامنے ہاتھ مت جوڑو...... میں جا رہی ہوں۔ مگر تم وعدہ کرو کہ اُس جہان میں مجھے ملو گے...... تم آؤ گے ناں......!'' دلہن نے التجائیہ انداز میں کہا۔ اس کے لہجے میں اتنا درد تھا کہ مولانا صاحب اور راشد کی آنکھوں میں بھی آنسو اتر آئے۔

''ہاں ہم ہمیشہ کے لئے ملیں گے فرزانہ وعدہ ہے میرا......'' روتے ہوئے سہیل نے اپنا منہ ہاتھوں میں چھپالیا۔

ہر طرف چھایا دھواں چھٹنے لگا دلہن کا خوب صورت سراپا دھوئیں میں تحلیل ہونے لگا...... اور وہ ''الوداع...... میرے محبوب...... الوداع'' کہتی ہوا میں تحلیل ہوگئی۔

سہیل نے راشد کو بتایا کہ وہ کبھی کبھار فرزانہ کی یاد میں بے قرار ہوکر اس کے گھر کے پاس آجاتا تھا۔ کل اسے پڑوسن نے بتایا کہ ایک نوجوان بہت پریشان تھا اور فرزانہ کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اس بات نے مجھے بے قرار کردیا اور میں تب سے حقیقت جاننے کے لئے یہاں روز آنے لگا اور آج فرزانہ کو دیکھ ہی لیا......

دوسری طرف مائدہ نے اسپتال میں آنکھیں کھول دیں اور ڈاکٹروں کے چہروں پر خوشی اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی......

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 114

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

مانی کی بات سن کر دینو بابا بولے۔ ”ارے مانی بیٹا تم میری وجہ سے پریشان نہ ہو بلکہ اپنی ذات اور اپنی خوشیوں کے لئے کوشاں رہو، ارے میرا کیا ہے میں کہیں اور جا کر زندگی کے دن پورے کرلوں گا، میری تو خوشی اور خواہش ہے کہ تم خوش رہو، یہ سن کر مانی بولا۔ دینو بابا میرے نزدیک آپ کی زندگی بہت اہم ہے اور میں کسی صورت بھی آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا اور زالوشا بھی کیا یاد کرے گا۔ میں کل صبح ہی صبح دلی حکیم وقار کے مطب میں پہنچ جاؤں گا اور رولوکا صاحب کے گوش گزار ساری روداد کروں گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے اور پھر دوسری صبح مانی حکیم وقار کے مطب میں پہنچ گیا۔ رولوکا اپنے کمرے میں موجود تھا اور اس کے سامنے تین چار شخص بیٹھے تھے اور ایک نوجوان گردن جھکائے بیٹھا تھا۔ مانی کو دیکھ کر رولوکا بولا۔ آپ سامنے بیٹھ جائیں اور پھر رولوکا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا، چند لمحے ہی گزرے تھے کہ نوجوان کے منہ سے کھرکھراتی ہوئی آواز نکلی۔ میں کسی صورت بھی اس نوجوان کو نہیں چھوڑوں گا۔ اور پھر وہ نوجوان اپنے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا لیکن نوجوان پر سوار اس آسیب کی ایک نہ چلی اور آخر کار تنگ آ کر رولوکا نے اس آسیب کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر نوجوان بھلا چنگا ہو گیا اور پھر وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ رولوکا نے مانی کی ساری باتیں بغور سنیں اور پھر بولا۔ مانی صاحب آپ فکر نہ کریں میں اپنے تئیں ساری حقیقت معلوم کرلوں گا اور اگر زالوشا واقعی زیادتیوں سے باز نہ آیا تو اسے منہ کی کھانی پڑے گی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں اور اپنے دینو بابا عرف التمش سے کہہ دیجئے گا کہ وہ بھی فکر نہ کریں، میں کسی بھی وقت آ کر التمش سے مل کر مزید ساری حقیقت کا پتہ کروں گا اور مانی واپس آ گیا۔ دوسری صبح رولوکا مانی کے گھر آ گیا اور دینو بابا سے ملا۔ رولوکا کو دیکھ کر دینو بابا بہت خوش ہوئے اور دینو بابا نے زالوشا، اور اپنی ساری باتیں رولوکا کو بتا دیں، جسے سن کر رولوکا بولا۔ التمش آپ فکر نہ کریں زالوشا...... واقعی زیادتی کر رہا ہے اور وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تو نقصان اٹھائے گا۔ آپ فکر نہ کریں مانی کی حفاظت بھی میری ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں اور ہاں ایک بات یاد آئی کہ......“ اور رولوکا کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ کمرے میں اچانک ایک گرجدار آواز گونجی۔

(اب آگے پڑھیں)

”**التمش** ہوشیار ہو جا۔“

اس آواز کو سنتے ہی التمش عرف دینو بابا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور ان کے منہ سے نکلا ”زالوشا“ اور پھر ان کی نظریں کمرے میں چاروں طرف گردش کرنے لگیں۔

دینو بابا کی غیر ہوتی حالت کو دیکھ کر رولوکا بولا۔

”التمش گھبرائیں نہیں...... جب میں نے بول دیا کہ میرے ہوتے ہوئے زالوشا...... اب آپ کے قریب بھی نہیں آ سکتا...... دراصل یہ آپ کی نگرانی کر رہا ہے کہ کہیں آپ اس کے خلاف کوئی منصوبہ تو نہیں بنا رہے اور پھر مجھے یہاں پر دیکھ کر اسے پکا یقین ہو گیا ہے کہ اس کے خلاف آپ مجھ سے مدد لے رہے ہیں۔

اس نے صرف آپ کو پریشان کرنا ہے اس لئے یہ بولتے ہوئے فوراً یہاں سے بھاگ نکلا، اس کو معلوم تھا کہ اگر میں یہاں چند پل بھی رکا تو میری خیر نہیں۔“ اور یہ بول کر رولوکا دینو بابا کو گہری نظر سے دیکھنے لگا۔

دینو بابا رولوکا کی باتیں سن کر بولے۔ ”رولوکا صاحب مجھے تو اپنی فکر نہیں...... بس میرے دماغ میں یہ بات گردش کرنے لگی ہے کہ یہ زالوشا...... کہیں مانی بیٹا کو کوئی نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا...... میں نے مانی پر بھی نظر رکھنی ہے بلکہ میں ابھی سے اپنے کارندوں کو مانی کی

حفاظت پر لگا دوں گا۔ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ ہم دونوں کے علاوہ مانی ہی اس کی نظر میں کمزور ہے اور پھر وہ یقیناً مانی کی طرف جھپٹے گا۔ اور آپ کے قریب آنا تو مشکل ہے..... خیر آپ فکر نہ کریں، میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔" اور یہ بول کر رولوکا نے دینو بابا سے مصافحہ کیا اور بولا۔ "التمش اب میں چلتا ہوں..... کسی بات کی فکر نہ کریں..... حسب ضرورت میں پھر آؤں گا۔" اور کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

دینو بابا کے پاس سے اٹھ کر رولوکا اپنے کمرے میں پہنچا اور بستر پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا پھر چند لمحے بعد منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا کہ اچانک کمرے میں گوں..... گوں..... کی آواز گونجنے لگی۔ دراصل یہ آواز جاگتے الو کی تھی۔ جاگتا الو بھی رولوکا کے کارندوں میں بہت اہم تھا۔ رولوکا کسی انجان زبان میں بولنے لگا۔ دیگر باتیں تو سمجھ سے باہر تھیں لیکن صرف زالوشا..... کا لفظ سمجھ میں آ رہا تھا۔ غالباً رولوکا..... اب زالوشا..... کے متعلق کوئی اہم پروگرام جاگتے الو کو دے رہا تھا..... جب باتیں ختم ہوئیں تو رولوکا نے اپنی انگلی سے اوپر کو اشارہ کیا تو..... گوں..... گوں..... کی آواز ختم ہوگئی۔ ایسے بھی جاگتا الو پوشیدہ رہتا تھا اور کسی کی نظر میں نہیں آتا تھا۔

اس کے بعد رولوکا اپنے کمرے سے نکلا اور مطب میں آ گیا..... حکیم وقار پر نظر پڑتے ہی رولوکا آگے بڑھا اور حکیم وقار سے مصافحہ کیا۔

حکیم وقار نے رولوکا سے ہاتھ ملایا اور بولے۔

"حکیم صاحب خیریت تو ہے ناں..... آج صبح جب آپ پر نظر نہیں پڑی تو میں" اور حکیم وقار کی بات ادھوری رہ گئی۔

رولوکا فوراً بولا۔ "حکیم صاحب کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دراصل ایک مسئلہ تھا..... آپ کو یاد ہوگا کہ ایک صاحب آئے تھے آپ کے پاس اور آپ انہیں لے کر میرے پاس آئے تھے..... ان کا نام مانی تھا جو کہ مشہور و معروف پہلوان بھی ہیں۔"

"ہاں جی..... ہاں یاد آ گیا....." حکیم وقار بولے۔

"میں صبح کے وقت ان کے گھر گیا تھا۔ رات میں ہی سوچ لیا تھا کہ صبح کے وقت ان سے مل لوں اور اسی وجہ سے ان سے ملنے چلا گیا۔" رولوکا بولا۔

"خیریت تو ہے ناں۔" حکیم وقار بولے۔

"دراصل ایک ضدی اور سرکش جن ان لوگوں کے پیچھے پڑ گیا ہے اور خواہ مخواہ تنگ کر رہا ہے۔" رولوکا بولا۔

"مسئلہ کیا زیادہ الجھا ہوا ہے؟" حکیم وقار نے پوچھا۔

"ہاں ایسا ہی ہے..... مانی صاحب کے پاس ایک صاحب نام التمش ہے..... وہ رہائش پذیر ہیں اور ان کا تعلق بھی نادیدہ قوتوں سے ہے اور وہ اس ضدی جن کی راہ میں رکاوٹ ہیں..... لہٰذا وہ جن چاہتا ہے کہ کسی طور سے التمش کا خاتمہ کر دے اور چونکہ وہ مانی صاحب کے پاس ہیں اس لئے وہ مانی صاحب کا بھی دشمن بن بیٹھا ہے۔

اور اب اس جن نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ التمش کو زیر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مانی کو ہر طرح سے تنگ کرے..... اور یہ تو اچھا ہوا کہ مانی صاحب میرے پاس آ گئے ورنہ ان کا ناتلافی نقصان ہو جاتا..... یا پھر ہوسکتا تھا کہ وہ جن جس کا نام زالوشا ہے..... مانی صاحب کو جسمانی بلکہ جانی نقصان پہنچانے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔"

یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ "بات تو اچنبھے کی ہے کہ مانی ایک عام انسان اور التمش نادیدہ قوت..... اور پھر مانی کے ساتھ رہائش پذیر؟"

حکیم وقار کی بات سن کر رولوکا مسکرانے لگا پھر بولا۔ حکیم صاحب اس دنیا میں بے شمار نادیدہ قوتیں موجود ہیں جو کہ ایک عام آدمی انہیں نہیں دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی انہیں پہچان سکتا ہے۔

یہ سب ہستیاں بھی دنیا بنانے والے کی مخلوقات میں شامل ہیں اور یہ سب کی سب اس دنیا میں موجود

ہیں۔ دنیا میں ان کا رہنا سہنا کھانا پینا عام ہے۔ لیکن جو لوگ صاحب نظر ہیں انہیں یہ نظر آتے ہیں یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے کہ التمش عرف دینو بابا...... اپنی برادری اور اپنا قبیلہ چھوڑ کر انسانی آبادی میں انسان کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں......

زیادہ تر ان کی جناتی طاقتیں ان کے قبیلے کے سردار نے سلب کرلی ہیں...... تھوڑی بہت طاقتیں ان کے پاس موجود ہیں تاکہ اس طاقت سے وہ اپنی حفاظت کرسکیں یا پھر کسی انسان کی مدد بھی کرسکیں۔ ان کا تعلق دراصل کافر جنات سے ہے...... اور کافر جنات زیادہ تر سرکش ہوتے ہیں...... چھوٹی چھوٹی باتوں سے مشتعل ہو کر انسانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں یا پھر دین دار جنات سے لڑ پڑتے ہیں...... اور یہی باتیں التمش کو ناپسند تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کا دل اپنے قبیلہ والوں سے بھر گیا تھا...... لہٰذا انہوں نے اپنا قبیلہ چھوڑ کر انسانی بستی میں آن بسے۔"

یہ سن کر حکیم وقار مسکرانے لگے اور بولے۔ "حکیم صاحب یہ تو واقعی بہت اچنبھے والی بات ہے کہ ایک جن کسی انسان کے ساتھ رہائش اختیار کئے ہوئے ہے اور پھر سب سے بڑی بات کہ اس نے اپنا قبیلہ چھوڑ دیا اور مشقت اٹھاتے ہوئے زندگی گزار رہا ہے اور ہاں...... یاد آیا کہ جنات کی عمریں بھی تو ہزاروں سال ہوتی ہیں۔ تو اس صورت میں ایک جن کسی انسان کے ساتھ کب تک رہ سکتا ہے؟"

رولو کا بولا۔ "جی بالکل صحیح آپ کا کہنا بجا ہے۔ دراصل ایسی نادیدہ ہستیاں جب انسانی بستی میں آن موجود ہوتی ہیں یا پھر انسان کے ساتھ رہائش اختیار کرلیتی ہیں تو انسان پر خود کو ظاہر نہیں کرتی ہیں بلکہ حتیٰ الامکان ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی انسان اس کی حقیقت کو نہ جان سکے اور اس طرح وہ ایک عام انسان کی طرح بودوباش اختیار کرتے ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جنات ہستیاں بلا بلی کی شکل میں موجود ہوتی ہیں اور وہ آزادانہ گھروں میں پھرتی ہیں اور لوگ انہیں ایک عام بلا یا بلی سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی بلیاں کچھ زیادہ ہی دیکھنے میں خوب صورت ہوتی ہیں۔ اور ان کی خوب صورتی کی وجہ سے لوگ ان سے پیار کرتے ہیں اور اپنے گھروں میں رکھتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ تھوڑے وقت یا پھر کئی دن کے لئے غائب ہوجاتی ہیں اور گھر والے سمجھتے ہیں کہ نہ جانے ان کی بلی کہاں چلی گئی...... اور پھر ایک وقت مقررہ پر وہ آجاتی ہے۔

اس طرح کا ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں۔

ایک گھر میں والد والدہ اور ایک بہت ہی خوب صورت لڑکی تھی۔ تین لوگوں پر مشتمل وہ گھرانہ بہت ہی خوش وخرم اور خوشحال زندگی گزار رہا تھا۔ زراعت کا کام ان کا زوروں پر تھا...... دونوں میاں بیوی بہت ہی رحم دل اور خدا ترس تھے اور پھر لڑکی بھی اپنے والدین پر گئی تھی وہ بھی لوگوں سے بہت پیار محبت سے پیش آتی تھی۔ لڑکی اپنے گھر میں محلے کے بچوں کو قرآن پڑھاتی تھی۔ جس کا کوئی بھی معاوضہ نہ لیتی تھی۔ اور جہاں تک ہوسکتا تھا، غریب بچوں کی مدد بھی کرتی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ ایک بہت ہی خوب صورت بالکل سفید بلی کا بچہ نہ جانے ان کے گھر میں کہاں سے چلا آیا۔

اس وقت دالان میں بیٹھے چند بچے قرآن پڑھ رہے تھے۔ بلی کے بچے نے میاؤں...... میاؤں...... کی آواز نکالی تو سارے بچے اور وہ لڑکی جس کا نام فرزانہ تھا۔

اس بلی کے بچے کی طرف متوجہ ہوگئے اور سب کے منہ سے نکلا۔ "باجی...... کتنا خوب صورت بچہ ہے؟"

یہ سن کر فرزانہ بولی۔ "ارے واہ...... یہ تو واقعی بہت خوب صورت ہے۔" اور یہ بول کر فرزانہ اس بلی کے بچے پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگی۔ پھر وہ دوڑتی ہوئی باورچی خانے میں گئی اور ایک پیالے میں تھوڑا سا دودھ لے آئی اور پیالے کو اس بچہ کے آگے رکھ دیا۔ اور بغور بچے کو دیکھنے لگی۔

تمام پڑھنے والے بچے بھی خوشی خوشی اس بلی کے بچے کو دیکھ رہے تھے۔ بلی کے بچے نے اپنا سر اوپر کو اٹھا کر فرزانہ کو بغور دیکھنے لگا تو فرزانہ بولی۔ ''چلو جلدی سے دودھ پی لو...... تمہیں بھوک لگی ہوگی۔''

فرزانہ کی بات سن کر ایسا لگا کہ جیسے وہ فرزانہ کا شکریہ ادا کر رہا ہو...... اس کے بعد اس نے دودھ پینا شروع کر دیا۔ جب سارا دودھ ختم ہوگیا تو پھر سے اس نے فرزانہ کو بغور دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دالان کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا اور اپنی آنکھیں موند کر خاموش ہو رہا۔

اتنے میں فرزانہ کی امی آئیں تو فرزانہ نے اس بچے کی طرف اپنی امی کی توجہ دلائی تو اس بچے کو دیکھ کر اس کی امی بھی بہت خوش ہوئیں اور اس کی خوب صورتی کی تعریف کرنے لگیں۔

خیر اس بچے نے فرزانہ کے گھر میں رہائش اختیار کر لی۔ فرزانہ صبح دوپہر اور رات میں اسے دودھ پلاتی اور اس کے بعد رات میں وہ بچہ دالان کے کونے میں پڑ کر سو جاتا۔

کمال کی بات یہ تھی کہ وہ بچہ کسی بھی وقت پیشاب پاخانہ گھر میں نہ کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے فرزانہ کے والدین اور خود فرزانہ بھی اچنبھے میں رہتی تھی کہ آخر یہ بچہ کہاں جاتا ہے اور کہاں پیشاب پاخانہ کرتا ہے۔

مگر لاکھ کوشش کہ وہ کھوج نہ لگا سکے کہ وہ بچہ کس وقت اور کہاں اپنی ضرورت سے فارغ ہونے کے لئے جاتا ہے۔

اسی طرح چار ماہ گزر گئے اور اب وہ بچہ بڑا ہوگیا تھا۔ وہ بلی تھی۔

اور ایک روز فرزانہ کے ابو ہارٹ اٹیک سے انتقال کر گئے۔ گھر میں صف ماتم بچھ گئی، ماں بیٹی کی دنیا اجڑ گئی...... گھر کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ کوئی ڈیڑھ دو ماہ تک ماں بیٹی کو ہوش نہ رہا۔

خیر یہ نظام دنیا ہے کہ مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا اور پھر انسان کو آہستہ آہستہ صبر آجاتا ہے اور وہ دنیا کے جھمیلوں میں لگ جاتا ہے۔

ان کا ایک بہت ہی پرانا ملازم تھا۔ وہ عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ایماندار بھی تھا اس نے کھیت کھلیان کا کام سنبھال لیا اور اس طرح ذریعہ آمدنی کی گاڑی چلنے لگی۔

گھر میں وہ بلی ہی تھی جو کہ دونوں ماں بیٹی کے آگے پیچھے پھرتی رہتی تھی اور اس کے علاوہ محلے کے بچے تھے جو کہ دن میں فرزانہ کے پاس قرآن پڑھنے آتے تھے اور اس طرح گھر میں چہل پہل رہتی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ گاؤں کے ایک گھر میں شادی تھی۔ فرزانہ کی والدہ شادی میں شرکت کے لئے چلی گئیں۔ اس دن فرزانہ کی طبیعت زیادہ خراب تھی اسے سخت بخار اور سر درد تھا۔ لہٰذا وہ گھر میں ہی رہی۔ کوئی آدھی رات کے وقت گاؤں کے دو اوباش لڑکے گھر میں کود گئے اور فرزانہ سے دست درازی شروع کر دی۔

فرزانہ نازک کمزور کس طرح ان دونوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ ان دونوں کی نیت تھی کہ فرزانہ کو ہر حال میں بے عزت کر دیں۔ فرزانہ نے انہیں خدا کا واسطہ دینا شروع کیا۔

ان میں سے ایک بولا۔ ''ہماری بات مان لو۔ اور خود کو ہمارے حوالے کر دو...... ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ زور زبردستی کریں...... تم نے ہمارا چین سکون ختم کر کے رکھ دیا...... ہم نے تو بہت چاہا کہ تمہارے دل میں ہمارے لئے نرم گوشہ پیدا ہو مگر تم نے ہمیں گھاس نہیں ڈالی۔'' اور یہ بول کر فرزانہ کو دبوچ لیا۔

فرزانہ چیخنے لگی اور پھر اسی ہاتھا پائی میں فرزانہ کا کرتا پھٹ گیا۔

ویسے فرزانہ کا گھر الگ تھلگ تھا۔ قریب میں کوئی اور گھر نہ تھا اگر کوئی اور گھر قریب ہوتا تو یقیناً پاس پڑوس والے ان کی آوازیں سنتے۔

اور جب ناقابل برداشت حالت ہوگئی تو اتنے میں بلی کی کان پھاڑنے والی غراہٹ سنائی دی۔ بلی کی غراہٹ اور خونخوار حالت کو دیکھ کر وہ دونوں سہم گئے اور

پھر ان میں سے ایک بلی کی طرف لپکا۔ پاس ہی ایک لکڑی پڑی تھی۔ لکڑی کو لے کر جب بلی کی طرف بڑھا کہ چشم زدن میں بلی کا قد کتے کے برابر ہوگیا۔

اور پھر وہ بلی...... بلی نہ رہی...... اس کی شکل عجیب ڈراؤنی اور ہیبت ناک ہوگئی۔ اس کی غراہٹ سے ان دونوں پر لرزا طاری ہوگیا۔ اور پھر آناً فاناً اس بلی نے مزید روپ بدلا اور ایک خوفناک چڑیل کی شکل اختیار کرلی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی۔

اس اثنا میں فرزانہ ہوش سے بیگانہ ہوچکی تھی۔

ان دونوں کی آواز حلق سے کھرکھراتی ہوئی نکلی اور پھر چند لمحے میں ہی ان کی لاشیں زمین پر پڑی تھیں۔

اور جب فرزانہ کو ہوش آیا تو وہ اپنے بستر پر دراز تھی اور اس کے سامنے ایک بہت ہی حسین و جمیل مانند اپسرا ایک نوجوان دوشیزہ بیٹھی تھی۔ فرزانہ کو ہوش میں دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اور پھر اپنی دلکش آواز میں بولی۔ ''فرزانہ بہن تم بالکل بھی گھبراؤ نہیں...... جو کچھ ہونا تھا ہوگیا...... اور اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کرنا۔ وہ دونوں واصل جہنم ہوچکے ہیں۔''

یہ سنتے ہی فرزانہ پر جیسے لرزا طارہ ہوگیا وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ ''اب کیا ہوگا؟''

''اب کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم اپنا دل پریشان نہ کرو۔ لو یہ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پی لو۔ اس سے تمہاری طبیعت بحال ہوگی۔'' اور پھر اس نے اپنے قریب پڑا ہوا پانی کا گلاس اٹھا کر فرزانہ کے منہ سے لگادیا۔ فرزانہ سوچ میں پڑگئی کہ اتنا ٹھنڈا پانی اس وقت کہاں سے آگیا۔ فرزانہ کی سوچ پڑھ کر وہ بولی۔ ''فرزانہ تم پریشان نہ ہو۔

چلو میں اپنی اصلیت بتاتی ہوں۔ دراصل میرا تعلق مسلمان قوم جنات سے ہے۔ تمہارے گاؤں سے جو تھوڑے فاصلے پر پہاڑ ہیں۔ پہاڑ کے اسی میدانی علاقے میں ہمارا قبیلہ ہے۔

میں اکثر پوشیدہ حالت میں تمہارے گاؤں میں آتی رہتی تھی اور جب ایک دن میں تمہارے گھر میں آئی تو تمہارے گھر کا پاکیزہ ماحول اور صوم صلوٰۃ کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئی اور خاص طور پر تم مجھے بہت ہی اچھی لگی اور پھر میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں تمہارے قریب رہوں گی۔

اس کے بعد میں نے ایک بلی کے بچے کا روپ دھارا، اور تمہارے گھر میں آگئی، تم نے دیکھتے ہی مجھے بہت پیار کیا میرے جسم پر اپنا ہاتھ پھیرا اور مجھے دودھ پلایا اور پھر میں تمہارے اخلاق اور رحمدلی کو دیکھ کر تمہارے گھر میں رہنے لگی۔

جب تک تم گھر والے جاگتے رہتے تو میں اپنی مقررہ جگہ پر دبکی پڑی رہتی اور جب تم لوگ نیند کی وادی میں کھو جاتے تو پھر میں اپنی جگہ سے نکل کر اپنے قبیلہ میں چلی جاتی۔ اس کے بعد جب تمہارے جاگنے کا وقت ہوتا تو اس سے پہلے میں اپنی جگہ پر آجاتی۔

لیکن آج جب وہ دونوں خبیث اس گھر میں کود کر آئے اور تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہا اور تمہارے ساتھ زبردستی شروع کردی تو پھر مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور میں نے ان دونوں کو واصل جہنم کردیا۔

تم گھبراؤ نہیں میں نے ان دونوں کی لاش لے جا کر پہاڑ سے نیچے پھینک دی ہیں اور تمہارے گھر میں ان کے آنے کی کوئی بھی نشانی نہیں چھوڑی ہے۔ اور اس بات کا کسی کو علم بھی نہیں ہوگا۔

تمہاری امی اب شادی سے یہاں پہنچنے والی ہیں۔ اب میں تم سے اجازت چاہوں گی۔ آج میری تمہارے گھر میں آخری رات ہے۔ ویسے میں تم سے وقتاً فوقتاً ملنے ضرور آیا کروں گی تنہائی میں۔

تمہاری امی مجھے گھر میں نہ دیکھ کر یقیناً افسردہ ہوں گی اور اگر تم سے ذکر کریں تو بول دینا کہ، امی، میں بھی بلی مانو کے لئے پریشان ہوں، نہ جانے کہاں چلی گئی۔''

اور یہ بول کر اس نے فرزانہ کو گلے لگایا اور پھر اس کی نظروں سے غائب ہوگئی۔

''جی حکیم صاحب آپ نے صحیح فرمایا، مجھے بھی کئی واقعات سننے کو ملے ہیں لیکن میں اکثر سوچتا ہوں کہ......''

اور حکیم وقار کی بات ادھوری رہ گئی...... کیونکہ ایک صاحب ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے...... ان کی حالت بہت دیگر گوں تھی۔ بدحواس چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں...... ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ آنکھیں سرخ اور اپنے حلقوں سے باہر کو نکلتی ہوئی۔

ان صاحب کے منہ سے بڑی مشکل سے نکلا......

''ح...... حک...... حکیم صاحب۔''

ان کی بدحواسی دیکھ کر حکیم وقار نے فوراً ایک ملازم کو آواز دی اور ایک گلاس پانی لانے کے لئے کہا...... اور خود کھڑے ہو کر ان صاحب کو سامنے پڑی کرسی پر بیٹھایا۔

ملازم دوڑا ہوا گیا اور فوراً ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آیا۔

حکیم وقار نے گلاس اپنے ہاتھ میں لیا اور گلاس کو ان صاحب کے منہ سے لگا دیا۔'' گلاس کا منہ سے لگنا تھا کہ وہ صاحب ایک ہی سانس میں سارا پانی پی گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک بہت ہی لمبا سانس کھینچا۔

اس درمیان رولو کا اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا کبھی حکیم وقار کو اور کبھی ان صاحب کو دیکھتا رہا۔

حکیم وقار بولے۔ ''سنیل صاحب خیریت تو ہے ناں...... آپ اتنا پریشان کیوں ہیں...... بتائیں آخر مسئلہ کیا ہے؟''

یہ سن کر وہ صاحب جن کا نام سنیل تھا۔ بولے۔

''حکیم صاحب آپ کو تو میرے وقار اور عزت کے بارے میں معلوم ہے...... دیوالی کے بعد بیٹی کا لگن ہونے والا ہے...... دو مہینے رہتے ہیں جوان بیٹی ہے نہ جانے اچانک اسے کیا ہو گیا ہے۔ عزت کی خاطر اس مسئلے کو غیروں کے آگے لا بھی نہیں سکتے۔

عجیب طرح سے اول فول بکنے لگی ہے...... مردانی آواز میں۔

ہمارے گھرانے پر تو مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ عزت کی خاطر کسی اور کو نہیں بھیجا بلکہ میں خود دوڑا ہوا آ گیا...... کئی لوگوں سے سن رکھا ہے کہ آپ کے پاس ایک بہت ہی شکتی شالی مہاپرش...... حکیم کامل ہیں جو کہ بھوت پریت کا علاج کرتے ہیں...... گھر والوں کے کہنے سے میں نے مندر کے پجاری کو بلایا تھا...... مگر پجاری کے سامنے آتے ہی...... وہ جھپٹ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور پجاری کے گال پر اس زور کا تھپڑ مارا کہ پجاری تو چکرا کر زمین پر گر گیا......

پھر پتری کے منہ سے مردانی آواز نکلی......'' چل بھاگ یہاں سے...... بڑا پوتر بنا پھرتا ہے لوگوں کے سامنے...... چلا جا...... نہیں تو تیرے کالے کرتوت لوگوں کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔ چل بھاگ ترنت یہاں سے...... چل...... نہیں تو تیری گردن توڑ کے رکھ دوں گا۔''

اور پھر تو پجاری سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گیا۔

حکیم صاحب ہماری نسل پر آپ کا احسان ہوگا...... حکیم کامل کو میرے ساتھ بھیج دیں۔ میں گاڑی لے کر آیا ہوں...... اور آپ کی یہ مہربانی ہوگی کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں...... ابھی تک نہ جانے میرے پیچھے اس نے کیا کر دیا ہوگا۔

اس کا کہنا ہے کہ ''تو زیادہ بھاگ دوڑ نہ کر...... صرف چار دن کی بات ہے...... میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا...... اور اس کا شریر تو اپنے پاس رکھ کر چتا میں جلا دینا...... صرف چار دن کی بات...... چار دن کے بعد اس کی آتما میرے وش میں ہوگی۔ اور اس پر میری مرضی چلے گی۔''

یہ بول کر سنیل بابو نے حکیم وقار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زار و قطار رونے لگے۔ ان کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

حکیم وقار نے ان کی پیٹھ پر تھپکی دی اور بولے۔ ''سنیل صاحب آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ صبر کریں اللہ نے چاہا تو آپ کا کام ہو جائے گا۔

''حکیم کامل آپ کے سامنے ہیں۔''

یہ سنتے ہی سنیل صاحب بجلی کی تیزی سے رولو کا کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر رولو کا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں

لے کر بولے۔ ”حکیم صاحب میری پتری کو بچالیں۔“
اور پھر جلدی سے نیچے کو بیٹھ گئے تا کہ رولوکا کا پاؤں پکڑ کر التجا کریں کہ اتنے میں رولوکا نے ان کے ہاتھ پکڑ کر اوپر کو اٹھایا اور بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں میری کوشش ہوگی کہ آپ کی بچی ٹھیک ہوجائے......“
سنیل بابو بولے۔ ”حکیم صاحب ترنت میر ساتھ چلیں...... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دشٹ راکھشش میری پتری کو کوئی نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔“
حکیم وقار بولے۔ ”حکیم کامل...... برائے مہربانی تشریف لے چلیں...... سنیل بابو بہت پریشان ہیں...... بچی کا معاملہ ہے......“
رولوکا اور حکیم وقار کے آگے سنیل بابو گڑگڑانے لگے تو حکیم وقار بولے۔ ”حکیم کامل چلئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں...... سنیل بابو کی بے چینی دیکھی نہیں جارہی۔“
اور پھر سنیل بابو کی گاڑی میں رولوکا اور حکیم وقار بیٹھ گئے تو سنیل بابو نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر اپنی گاڑی سڑک پر دوڑانے لگے۔
حکیم وقار نے مطب میں ملازموں کو سمجھا دیا تھا کہ میں کوئی دو ڈھائی گھنٹے میں واپس آتا ہوں اور ویسے بھی آج مطب میں آؤٹ ڈور مریضوں کی چھٹی تھی۔
تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد سنیل بابو نے اپنی کار ایک حویلی کے آگے کھڑی کردی اور پھر جلدی سے گاڑی سے اترے اور کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا اور بولے۔
”حکیم صاحب باہر تشریف لائیں۔“
رولوکا اور حکیم وقار کار سے نیچے اترے اور سنیل بابو کے ساتھ آگے کو بڑھنے لگے اور پھر سنیل بابو کے ساتھ دونوں حویلی میں داخل ہوئے۔ آگے آگے سنیل بابو تھے۔ ایک کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر سنیل بابو رک گئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کمرے میں ان کی بیٹی موجود تھی۔
رولوکا نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر دروازے پر پھونک ماری اور پھر دروازے کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا تو دروازہ اندر کو کھلتا چلا گیا۔
سنیل بابو اور حکیم وقار کو بھی اپنے پیچھے آنے کا رولوکا نے اشارہ کیا۔
رولوکا نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا تو دیکھا کہ سامنے مسہری پر ایک جوان لڑکی سفید لباس میں لیٹی پڑی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔
اچانک اس لڑکی کے منہ سے غراہٹ سنائی دی اور وہ مجسم چند فٹ ہوا میں معلق ہوگئی۔ کسی نادیدہ قوت نے اسے ہوا میں معلق کردیا تھا۔
پھر وہ ہوا میں معلق مسہری کے اوپر گول گول گھومنے لگی...... پھر اس میں تیزی آگئی...... وہ لٹو کی مانند گھومنے لگی اور پھر اسی طرح گھومتے ہوئے سامنے دیوار کے پاس جاکر جیسے دیوار میں صلیب کی مانند چپک گئی۔
اور پھر اس نے سامنے دیوار کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں سے سرخ روشنی نکلی اور دیوار کے قریب موجود قدآدم آئینہ زبردست چھناکے سے کرچی کرچی ہوکر بکھر گیا۔
اس منظر کو دیکھ کر سنیل بابو اور حکیم وقار تو جیسے سہم کر رہ گئے۔
اس کے بعد وہ دیوار پر سے ہٹی اور چاروشانے چت ہوا میں معلق اپنی مسہری کی جانب آئی اور مسہری پر چاروشانے پڑ گئی۔
رولوکا مسہری کی طرف بڑھا کہ اتنے میں جلدی سے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مسہری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور پھر اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ”اوئے تو یہاں کیا لینے آگیا...... ترنت یہاں سے بھاگ جا ورنہ جو حال کروں گا کہ سارا سنسار دانت تلے انگلی داب لے گا...... چل بھاگ یہاں سے، لگتا ہے تو نے ڈھونگی پجاری کا حال نہیں دیکھا۔“
یہ سن کر رولوکا مسکرایا اور بولا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟ اور تو نے اس بچی کو پریشان کیوں کر رکھا ہے...... تیری بڑی مہربانی ہوگی کہ تو اس بچی کو چھوڑ کر جہاں سے آیا ہے چلا

جا۔ کسی کو ناحق پریشان کرنا اچھی بات نہیں...... اچھے لوگ کسی کو اپنی ذات سے دکھ نہیں پہنچاتے۔‘‘ اور یہ بول کر رولوکا بغور اس کی جانب دیکھنے لگا۔

رولوکا کی بات سن کر لڑکی کے منہ سے آواز نکلی۔ ’’تو میرا مشورہ مان اور یہاں سے ترنت چلا جا...... اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دے...... بس چار دن کی بات ہے...... اور ان چار دنوں میں سے آج ایک دن ختم ہونے کو ہے...... پھر رہ جائیں گے تین دن...... تیسرے دن میں اس کی آتما کو لے کر چلا جاؤں گا اور اس کا شریر اسی جگہ رہ جائے گا۔

اب تو ترنت یہاں سے چلا جا...... میں نہیں چاہتا کہ تیرا حشر نشر ہو جائے اور پھر تجھے پچھتانے کا بھی سے نہ ملے...... اور تو ہاتھ ملتا رہ جائے۔ چل بھاگ یہاں سے۔‘‘

رولوکا بولا۔ ’’میں نے پوچھا تھا تیرا نام کیا ہے؟ اور تو اس بچی کے پیچھے کیوں لگا ہے؟‘‘

رولوکا کی بات سن کر وہ بولا۔ ’’چل میں تجھے اپنا نام بتائے دیتا ہوں۔ میرا نام تلسی داس ہے اور میں فلانے آم کی بگھیا میں سائے تلے آرام کر رہا تھا کہ یہ اپنی سکھیوں کے ساتھ آم توڑنے آئی تھی اور پھر اس نے اپنے پاؤں تلے مجھے کچل ڈالا۔

اب میں نے اسے نہیں چھوڑنا ہے...... میں ہر حال میں اس کی آتما کو اپنے وش میں کر کے لے جاؤں گا۔ تو میری شکتی کو نہیں جانتا...... میں اس گرو کا چیلا ہوں کہ اگر میرا گرو اپنی انگلی کا اشارہ کردے تو سارے سنسار میں آگ لگ جائے...... ویسے میں تیرے لئے اکیلا ہی کافی ہوں۔ تو اپنا بھلا چاہتا ہے تو یہاں سے چلا جا......‘‘

اور پھر اس لڑکی جس کا نام رجنی تھا۔ اس کی دونوں آنکھوں سے سرخ روشنی نکلنے لگی۔ اور پھر وہ روشنی سارے کمرے میں چکرانے لگی کہ اتنے میں اس روشنی کا رخ رولوکا کی جانب ہو گیا...... وہ روشنی آہستہ آہستہ رولوکا کے قریب آنے لگی۔

رولوکا نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے سنیل بابو اور حکیم وقار کو تھوڑا پیچھے ہٹنے کو کہا۔

اتنے میں رجنی کی آنکھوں سے نکلتی ہوئی روشنی رولوکا کے اور قریب آگئی اور پھر رولوکا کے اور قریب آنے لگی کہ اتنے میں ایک دلخراش منظر رونما ہوا۔

رولوکا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی سیدھی انگلی کا رخ اس سرخ روشنی کی جانب کردیا تو روشنی تیزی سے پیچھے کی جانب مڑی اور بہت تیزی سے رجنی کی آنکھوں میں سما گئی۔

روشنی کا آنکھوں میں سمانا تھا کہ زوردار آواز اس کے منہ سے نکلی۔ ’’اوہ...... اوہ...... پاپی تو نے میرے ساتھ چھل کردیا...... اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔‘‘

اور یہ بولتے ہی رجنی کی بالشت بھر زبان منہ سے باہر کولپ لپ کرتی ہوئی نکلی اور پھر پوری زبان سے نیلی نیلی شعاعیں پھوٹنے لگیں۔

اب رولوکا مسہری کے سامنے پڑی ہوئی ایک چوکی پر بیٹھ چکا تھا۔ سنیل بابو اور حکیم وقار دونوں کرسیوں پر براجمان تھے۔ رولوکا نے اپنی جیب میں اپنا سیدھا ہاتھ ڈالا اور جب اس کا ہاتھ جیب سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کچی مٹی کی گولی تھی۔

رولوکلا نے جھٹ اس گولی پر پھونک مار کر رجنی کی مسہری کی جانب پھینک دی۔ وہ گولی مسہری کے قریب جاتے ہی مسہری کے چاروں طرف گھوم گئی اور پھر ایک ہلکی روشنی مسہری کے گرد چاروں طرف نظر آنے لگی۔

اس روشنی کو دیکھ کر رجنی کے منہ سے آواز نکلی۔ ’’تو نے مسہری کے گرد کنڈل قائم کردیا۔ تو کیا سمجھتا ہے کہ تیرا یہ کنڈل مجھے مجبور کردے گا اور میری شکتیاں اس جگہ سٹ کر رہ جائیں گی۔ تیری یہ بھول ہے اور اگر تو مجھے زیادہ پریشان کرے گا تو میں اسی وقت مزید تین دن انتظار کئے بغیر رجنی کی آتما کو اپنے ساتھ لے کر چلا جاؤں گا۔ دیکھ ابھی بھی وقت ہے تو میری بات مان لے...... اور مجھے اکیلا چھوڑ کر یہاں سے چلا جا...... نہیں تو تو اپنے ساتھ ساتھ اس گھر کے سارے پریوار کا

نقصان کرے گا۔ تو کسی بھی حال میں اس پتری کی آتما کو میرے وش سے آزاد نہیں کرا سکے گا۔"

رولو کا بولا۔ "تلسی داس! میں نے تیری باتیں سن لیں اور اب تو میری بات کان کھول کر سن۔ تیری شکتی اپنی جگہ اور اگر تجھ میں واقعی شکتی ہے اور تیرا گرو اپنی انگلی کے اشارے سے سارے سنسار میں آگ لگا سکتا ہے تو میں تجھے چیلنج کرتا ہوں کہ میں نے جو حصار اس مسہری کے گرد کیا ہے اسے توڑ کے دکھلا یا پھر تو اپنے گرو کو آواز دے اگر تیرا گرو کچھ کر سکتا ہے تو اس سے بھی کچھ کرالے۔

ایک اور میری بات سن کہ میں تیرے ساتھ یہ رعایت کر سکتا ہوں کہ تو سکون سے یہاں سے چلا جا۔ اگر اپنی خیر چاہتا ہے تو...... ورنہ...... تنگ آمد بجنگ آمد۔

تو میری بات نہیں مانے گا تو پھر یہاں سے تیرا نکلنا ممکن ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا، اور اگر تو نے اپنی ضد نہ چھوڑی تو پھر تیرا خاتمہ یقیناً ہو جائے گا۔"

یہ سن کر رجنی کے منہ سے آواز نکلی۔ "اوئے مٹی پر رینگنے والے حقیر کیڑے...... تیری اس گیدڑ بھبکی سے میں ڈرنے والا نہیں...... اب دیکھ میں تیرا کنڈل توڑ رہا ہوں۔" اور یہ بول کر رجنی نے اپنا ہاتھ اوپر کیا تو اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ آیا بلکہ اس پر سوار تلسی داس اپنی مٹھیاں بھینچنے لگا۔ اب اس کا طیش دیکھنے کے قابل تھا۔ اس کے منہ سے غراہٹ نکلنے لگی۔ پھر اس کی غراہٹ پھنکار میں بدل گئی...... اس کے منہ سے ایک فٹ لمبا ایک سیاہ بہت ہی خوفناک سانپ نکلا جس کی پھنکار نے سارے کمرے کو جیسے لرزا کر رکھ دیا۔

اور کمرے میں موجود سنیل بابو اور حکیم وقار پر تو جیسے کپکپی طاری ہو گئی۔ مگر اتنے میں رولو کا کی آواز سنائی دی۔ "آپ لوگ گھبرائیں نہیں...... یہ اس کی گیدڑ بھبکی ہے...... میں نے اس کو حصار کر کے مسہری تک مقید کر دیا ہے...... اب یہ کسی بھی صورت حصار کو نہیں توڑ سکتا اور نہ ہی یہاں سے بھاگ سکتا ہے۔"

پھر رولو کا تلسی داس سے بولا۔ "تلسی داس اب بھی وقت ہے اپنی شکست مان لے اور رجنی کا جسم چھوڑ کر چلا جا...... اس صورت میں تو تو بچ جائے گا...... دیکھ ضد اچھی نہیں میں اب تیرے ساتھ رعایت کر سکتا ہوں۔ تو کس قدر طاقتور ہے میرا حصار تر تو توڑ نہیں سکتا...... اور جب یہ حصار توڑ نہیں سکتا تو بغیر میری اجازت کے تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ بہر حال میری بات مان لے اور اپنا بچاؤ کر لے...... ورنہ تیرا خاتمہ عنقریب ہے۔ سوچ لے اب بھی وقت ہے۔"

رولو کا کی باتیں سن کر وہ مزید طیش میں آ گیا۔ اس کے منہ سے جو سانپ نکلا تھا وہ یک بیک دھواں بن کر غائب ہو گیا۔ سانپ کو غائب ہوتا دیکھ کر وہ اچنبھے میں پڑ گیا اسی سمت جیسے اس کی آنکھیں گڑ کر رہ گئیں۔ اور وہ پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس کی غراہٹ مزید تیز ہو گئی۔ اس کی غراہٹ سے لگتا تھا کہ جیسے کوئی لحیم شحیم بھیڑیا غرا رہا ہو۔

پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "او ڈھونگی مجھے سکون سے اپنا کام کرنے دے، میں نہیں چاہتا کہ یہ دو افراد جو تیرے قریب بیٹھے ہیں ان کے سامنے تیری بے عزتی ہو جائے، تو میری بات مان لے اور دم دبا کر یہاں سے بھاگ جا...... میں تجھے چند منٹ دیتا ہوں...... اگر یہاں سے نہیں گیا تو پھر......

اس لڑکی کی آتما میرے وش میں ہو گی...... اس کا جینا محال ہو جائے گا......" اور اس کے ساتھ ہی رجنی کے منہ سے عجیب و غریب کربناک آوازیں نکلنے لگیں...... رجنی نے اپنی گردن پکڑ لی اور اس کی آنکھیں جیسے باہر کو ابل پڑیں۔

یہ دیکھ کر رولو کا نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جب اس کا ہاتھ جیب سے باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں تین تین انچ کی تین اگر بتیاں تھیں۔ پھر رولو کا سنیل بابو سے مخاطب ہوا۔ "سنیل بابو ذرا جلدی سے ماچس لے آئیں۔"

رولو کا کی بات سنتے ہی سنیل بابو بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور کمرے سے نکلتے چلے گئے اور پھر

چند لمحے میں ہی ماچس لے آئے اور رولو کا کو دے دی۔

رولو کا نے تیلی جلا کر تینوں اگربتیوں کو سلگا دیا۔

اب اگربتیوں سے سفید سفید دھواں اوپر کو اٹھنے لگا۔ جب کافی دھواں اوپر کو جمع ہو گیا تو رولو کا نے اس دھوئیں پر پھونک ماری تو وہ دھواں لکیر کی شکل اختیار کر کے رجنی کی طرف بڑھنے لگا۔ رجنی کی مسہری کے قریب پہنچ کر وہ دھواں ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اور پھر اس کے بعد سارا دھواں مسہری کے چاروں سمت آہستہ آہستہ چکرانے لگا۔

یہ دیکھ کر رولو کا نے کچھ پڑھ کر اپنے ہاتھ کی انگلی پر پھونک ماری تو انگلی سے روشنی کی ایک لکیر نکلی اور پھر وہ لکیر بھی مسہری کی طرف بڑھنے لگی اور پھر مسہری کے قریب پہنچ کر حصار سے ٹکرائی تو ایک ہلکا شعلہ سا نکلا اور پھر چشم زدن میں۔

وہ دھواں جو کہ پہلے اگربتیوں سے پیدا ہو کر مسہری کے گرد چکر لگا رہا تھا فوراً سے پیشتر آناً فاناً رجنی کی ناک میں گھستا چلا گیا۔

دھواں کا ناک میں گھسنا تھا کہ رجنی کے منہ سے کربناک آواز نکلی جیسے کہ کسی جانور کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ ''اوہ! میں مرا...... ارے مجھے چھوڑ دے...... گرو جی...... گرو جی جلدی سے میری سہائتا کرو...... گرو مہاراج مجھے بچالو...... او پاپی مجھے چھوڑ دے...... ارے جلدی کر...... نہیں تو میرا وجود ختم ہو جائے گا...... مجھے چھوڑ دے...... مجھے جانے دے...... میں اس پتری کی جان چھوڑ رہا ہوں...... مجھے جانے دے۔'' اور نہ جانے وہ اور کیا کیا الاپ شلاپ بکتا رہا...... بلکہ رولو کا کو گالیاں بھی دیتا رہا۔

چند منٹ ایسا ہی ہوتا رہا...... کہ اچانک وہ دھواں جو کہ رجنی کی ناک میں داخل ہوا تھا وہ باہر کو نکلنا شروع ہوا، پھر وہ دھواں ایک جگہ جمع ہو گیا۔ پھر اس دھوئیں نے ایک ہیولہ کی شکل اختیار کر لی۔ کالے رنگ کا وہ ہیولہ تھا۔ ہیولہ کی آنکھیں غضبناک حالت میں سرخ تھیں۔

پھر اس دھوئیں کی ہیبت بدلنے لگی...... سارا دھواں ہیولہ سمیت سرخ ہو گیا، اس کے بعد اس دھوئیں نے ایک لکیر کی شکل اختیار کر لی اور روشن دان کی طرف بڑھنے لگا۔ روشن دان کے قریب پہنچ کر روشن دان سے باہر نکل گیا۔

ادھر رجنی اپنی مسہری پر بے سدھ ہو کر گر پڑی۔ پھر رولو کا کی آواز سنائی دی۔ ''سنیل بابو...... آپ کی بچی اب بالکل ٹھیک ہے...... بے فکر رہیں، اب اس کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوگا...... اور ہاں ایک بات یاد رکھنا اور اس پر مضبوطی سے عمل بھی کرنا ہے۔''

سنیل بابو بولے۔ ''جی حکیم صاحب! آپ بتائیں کیا کرنا ہے؟''

رولو کا بولا۔ ''تین ہفتے تک آپ کی بچی گھر سے باہر قدم نہ رکھے...... بلکہ یہ خیال کریں کہ اس کو گھر میں قید کر دیں...... تین ہفتے کے بعد کوئی بات نہیں۔ ویسے گھبرانے والی بات تو نہیں ہے، میں نے اس کے گرد نادیدہ حصار قائم کر دیا ہے جو کہ اس کے گرد تین ہفتہ تک قائم رہے گا۔

یہ احتیاط یوں ضروری ہے کہ یہ کسی اور جھپیٹے میں نہ آ جائے۔ ویسے جو چیز اس پر حاوی تھی اس کا تو خاتمہ ہو چکا ہے...... میں نے تو بہت چاہا کہ وہ میری بات مان لے اور رجنی کا جسم چھوڑ دے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا...... اور اس طرح اس کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

جس طرح ہم انسان عام زندگی میں ایک دوسرے کو جانتے ہیں راہ و رسم رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں بلکہ انسان کی رشتہ داریاں ہوتی ہیں اسی طرح نادیدہ دنیا میں بھی جو قوتیں ہیں ان کا حال بھی ہم انسانوں جیسا ہی ہے۔ وہ بھی ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ایک دوسرے سے راہ و رسم استوار رکھتی ہیں بلکہ ان کی بھی رشتہ داریاں، خاندان اور قبیلے ہوتے ہیں۔ اور جب کسی نادیدہ وجود کو اذیت دی جاتی ہے یا پھر اسے قید کر دیا جاتا ہے یا پھر جب کسی ضدی سرکش وجود کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو اس کے جاننے والے یا اس کے لواحقین یا پھر اس کے قبیلے والے اشتعال میں آ کر ان

کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسا کرنے والے کو تنگ کریں۔
لہٰذا اس کے پیش نظر بعض اوقات احتیاط ضروری ہوتا ہے۔ اور عامل حضرات جو ضروری ہوتا ہے اس پر خود اور دوسروں سے بھی عمل کراتے ہیں۔ ویسے آپ لوگ ذرہ برابر بھی کوئی سوچ اپنے دماغ میں نہ لانا...... میں نے ہر طرح کی مضبوطی کر دی ہے۔ اور پھر میں نے آپ کی بچی کے دماغ سے بھی اس واقعے کو نکال دیا ہے۔ اسے کسی قسم کا بھی واقعہ یاد نہیں رہے گا اور آپ لوگ بھی کوشش کرنا کہ اس واقعے کو کوٹ کوٹ کر اس کے دماغ میں نہیں ڈالنا۔
اب آپ سارا پریوار آرام وسکون سے رہیں اور اب ہمیں اجازت دیں۔'' رولوکا بولا۔
رولوکا کی بات سن کر سنیل بابو فوراً اپنی کرسی سے اٹھے اور پاس کی الماری کھول کر ایک کالا بیگ نکال کر لائے اور اس بیگ کو رولوکا کے سامنے رکھ دیا اور بولے۔ ''حکیم صاحب اسے قبول کرلیں...... آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ یہ میری خوشی کی خاطر رکھ لیں...... اور ہمارا پریوار زندگی بھر آپ کا احسان مانتا رہے گا اور ہم آپ کے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرتے رہیں گے۔''
سنیل بابو کی بات سن کر رولوکا بولا۔ ''سنیل بابو آپ کا بہت بہت شکریہ...... میں جو بھی کرتا ہوں بغیر کسی لالچ اور معاوضہ کے، یہ بہت ہے کہ آپ ہمارے لئے دعا کرتے رہیں اور اگر ہو سکے تو اس رقم کو غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیجئے گا، اس سے بڑھ کر کوئی اور نیکی نہیں۔ میری دعا ہے کہ اوپر والا آپ کو اور زیادہ دے تاکہ آپ آئندہ بھی بلکہ تاحیات غریبوں اور ضرورت مندوں کو دیتے رہیں۔ اور ہاں ایک بات کہ بچی کو اٹھانا نہیں...... اس وقت یہ گہری نیند میں ہے، جب یہ خود سے اٹھے تو سب سے پہلے گرم پانی سے نہلا دینا پھر اس کے بعد ایک گلاس گرم گرم دودھ پلانا۔ اچھا اب اجازت دیں کافی وقت ہوگیا...... مطب میں جلدی جانا بھی ضروری ہے۔''

''ٹھیک ہے حکیم صاحب! چلئے میں آپ لوگوں کو چھوڑ آتا ہوں۔'' سنیل بابو بولے۔
سنیل بابو کی بات سن کر رولوکا بولا۔ سنیل بابو آپ پریشان نہ ہوں...... ہم کسی اور گاڑی پر چلے جائیں گے۔''
سنیل بابو بولے۔ ''حکیم صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ لوگ کسی اور گاڑی پر جائیں...... چلیں آپ لوگوں کو میں چھوڑ دیتا ہوں...... یہ میری خوشی اور میرے لئے باعث عزت ہے۔''
''خیر چلئے آپ کی خوشی ہے تو ایسا ہی صحیح۔'' رولوکا بولا۔
اس کے بعد رولوکا، حکیم وقار اور سنیل بابو کار میں بیٹھے اور سنیل بابو نے کار اسٹارٹ کی اور کار فراٹے سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد سنیل بابو نے حکیم وقار کے مطب کے سامنے کار روک دی اور پھر جلدی سے کار سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا تو اندر سے رولوکا اور حکیم وقار باہر نکلے۔
حکیم وقار بولے۔ ''سنیل بابو...... آپ مطب میں تشریف لے چلیں...... لمبا سفر طے کرکے آئے ہیں۔ چند منٹ آرام سے بیٹھیں اور ٹھنڈا پانی پئیں...... کیونکہ ابھی آپ نے ایک گھنٹہ کے سفر پر واپس جانا بھی ہے۔''
''ٹھیک ہے حکیم صاحب جیسے آپ کی خوشی۔'' سنیل بابو بولے۔ اور حکیم وقار اور رولوکا کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔
مطب میں آکر حکیم وقار نے ملازم کو آواز دی اور بولے۔ ''اسحاق جلدی سے تین گلاس ٹھنڈا شربت بنا کر لاؤ۔'' اور پھر تینوں کرسی پر بیٹھ گئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔
چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اسحاق تین گلاس شربت بنا کر لے آیا اور شربت میز پر رکھ کر بولا۔ ''حکیم صاحب کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بتائیں۔''
حکیم وقار بولے۔ ''نہیں کسی اور چیز کی ضرورت

نہیں اور اگر ضرورت ہوئی تو میں آواز دوں گا۔" اور یہ سنتے ہی اسحاق واپس چلا گیا۔

حکیم وقار بولے۔ "حکیم صاحب شربت پئیں اور سنیل بابو آپ بھی گلاس اٹھائیں۔"

"جی بہت بہت شکریہ۔" سنیل بابو بولے اور اپنا شربت کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگالیا۔ شربت پینے کے بعد سنیل بابو بولے۔ "حکیم صاحب آپ دونوں کا بہت بہت دھنے واد...... اگر آج آپ نہ ہوتے تو ہماری پتری ہم سے بہت دور چلی جاتی...... ہماری پتری کو اس راکھشش سے چھٹکارا دلایا...... اچھا اب میں چلتا ہوں۔" یہ بول کر سنیل بابو نے اپنی کرسی سے اٹھ کر مصافحہ کیا۔

حکیم وقار بولے۔ "سنیل بابو آپ بے فکر ہو کر جائیں...... کسی قسم کا کوئی اندیشہ دل میں نہ لائیں اور ویسے ایک دوسرے کے کام آنا چاہئے...... اور ہر پل انسان کو حقوق العباد کا خیال رکھنا چاہئے۔ اور اپنی ذات سے کسی کو تکلیف دینے کا سوچنا بھی گناہ سمجھیں۔"

اور پھر سنیل بابو نے ایک بار پھر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر رولوکا اور حکیم وقار کا شکریہ ادا کیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر کے لئے روانہ ہوگئے۔

سنیل بابو کے جانے کے بعد حکیم وقار نے ملازم کو آواز دے کر کہا۔ "اسحاق اب جلدی سے کھانا لگاؤ، زور کی بھوک لگی ہے۔" یہ سن کر اسحاق واپس چلا گیا اور پھر کوئی دس پندرہ منٹ بعد آیا اور بولا۔ "حکیم صاحب کھانا لگ چکا ہے۔"

رولوکا سے حکیم وقار بولے۔ "حکیم صاحب تشریف لے چلئے کھانا کھاتے ہیں۔" اور پھر دونوں کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔

کھانے سے فراغت کے بعد حکیم وقار بولے۔ "حکیم صاحب آپ کے مانی پہلوان کے کیس کا کیا بنا؟"

رولوکا نے جواب دیا۔ "حکیم صاحب میں نے کچھ احتیاطی تدابیر تو کردی ہیں اور آج رات میں تفصیل سے معلوم کرتا ہوں کہ حقیقت میں زالوشا...... کیا چاہتا ہے اور اس کی پہنچ کہاں تک ہے...... اور میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر اس معاملے میں زیادہ دیر ہوئی تو کم بخت زالوشا...... مانی کی ذات کو نقصان نہ پہنچادے۔"

حکیم وقار یہ سن کر بولے۔ "پرسوں آپ موجود نہیں تھے، مانی صاحب میرے پاس آئے تھے...... اندرونی طور پر بہت پریشان لگ رہے تھے...... کچھ زیادہ ہی التجا کر رہے تھے کہ آپ برائے مہربانی رولوکا صاحب سے سفارش کریں کہ وہ اس مسئلے کا بغور جائزہ لیں...... کیونکہ میں اپنے استاد دینو بابا کی طرف سے بہت فکر مند ہوں کہ کہیں زالوشا...... دینو بابا کو زیادہ تنگ نہ کرے اور اگر اس کام کے لئے کچھ خرچ ہوتا ہے تو میں وہ بھی دینے کو تیار ہوں۔"

یہ سن کر میں نے جواب دیا۔ "مانی صاحب آپ بالکل بھی فکر نہ کریں...... حکیم کامل ہر کام کو سیریس لیتے ہیں۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ آج تک کسی بھی کام کو انہوں نے سرسری نہیں لیا...... اور ہر کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر دم لیا...... اور آنے والے پریشان حال ضرورت مند لوگ خوش ہو کر گئے...... یہ ضرور ہے کہ کام کی نوعیت کے لحاظ سے چند دن لگتے ہیں اور چونکہ نادیدہ ہستیاں کبھی کبھی زیادہ باقوت ٹکرا جاتی ہیں جس کے پیش نظر ان کے لئے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔ اور خرچ وغیرہ کی قطعی ضرورت نہیں۔

مانی صاحب میں آپ کے لئے ضرور سفارش کروں گا، آپ فکر نہ کریں۔" میری بات سن کر بے چارے خوش ہوئے اور پھر چند منٹ بیٹھ کر چلے گئے۔

رولوکا بولا۔ "حکیم صاحب دراصل یہ زالوشا...... جنات سے تعلق رکھتا ہے اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ کم بخت ضدی اور بہت سرکش ہے...... یہی نہیں بلکہ دھوکے باز اور شاطر بھی ہے...... یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے قبیلے میں بغاوت کی...... قبیلے کے قائدے قانون کو ماننے سے انکار کیا تو مجبوراً قبیلہ والوں نے اسے اپنے قبیلہ سے باہمی مشورہ کے بعد قبیلہ بدر کردیا۔

اور چونکہ اس قبیلہ کی ایک اہم بات ہے کہ قبیلہ کا

جو زور آور دیوتا ہے شابولا...... جو بھی شابولا کو حاصل کرنے کے لئے اگر جاپ کرتا ہے تو ایک مقررہ وقت پر شابولا اس کے زیر اثر آجاتا ہے...... شابولا ویسے بھی چونکہ بہت طاقتور ہے اس لئے اس کا عمل زیادہ شکتی والا ہوجاتا ہے اور خود زالوشا بھی جنتر منتر عمل عملیات میں کافی طاقتور ہے۔ اور جب شابولا کی طاقت اس کی طاقت میں مل جاتی ہے تو زالوشا بے انتہا طاقتور ہوجاتا ہے۔

اور پھر اس کے مدمقابل کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑتا ہے...... ذرا بھی لغزش مدمقابل کو ناتلافی نقصان سے دوچار کرسکتی ہے۔

ویسے تو میں نے آتش اور مانی کی حفاظت پر اپنے کارندے لگادیئے ہیں مگر پھر بھی میں بہت چوکنا ہوں کہ موقع ملتے ہی زالوشا کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

حکیم وقار بولے۔ "حکیم صاحب میں عام زندگی اور پھر جب تاریخ پر نظر ڈالتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ جب کوئی قانون سے بغاوت کرتا ہے چاہے وہ بغاوت حکومت سے ہو یا پھر کسی بھی قبیلے کا ہو تو اس صورت میں باغی کو اذیت ناک حالات سے دوچار کردیا جاتا ہے اور پھر بھی جب وہ راہ راست پر نہیں آتا تو اس باغی کا سر کچل دیا جاتا ہے اور اس طرح اس باغی کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

تو یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زالوشا نے جب اپنے قبیلہ کے قاعدہ قانون کو ماننے سے انکار کیا۔ تو قبیلہ والوں نے اس کے ساتھ نرمی کیوں برتی...... قانون تو یہی کہتا ہے کہ بغاوت کے جرم میں اس کا خاتمہ کردیتے نا کہ اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ وہ انسانی آبادی میں ظلم کا بازار گرم رکھے اور عام معصوم بے قصور لوگوں کو اپنے ظلم کا شکار بنائے۔ یہ تو سراسر اس قبیلہ کی ناانصافی ہے۔"

"حکیم صاحب آپ کا کہنا بجا ہے، لیکن اس میں ایک راز بھی پوشیدہ ہے۔ زالوشا کے قبیلہ والوں نے اسے آزاد یوں چھوڑا کہ وہ انسانی آبادی میں جائے اور پھر در بدر بھٹکتا پھرے...... کہیں بھی اس کے لئے جائے پناہ نہ ملے، کہیں بھی آرام وسکون کے لئے ایک جگہ ٹھہر نہ سکے۔ انسان کے ہاتھوں وہ اذیت اٹھائے اور چونکہ اپنی فطرت سے مجبور ہے لہٰذا وہ انسان دوست بن کر رہ نہیں سکتا، وہ آرام سکون کے لئے سرگرداں رہے گا۔

اور جب کوئی اس کے مدمقابل کھڑا ہوگا تو بار بار اپنی طاقتیں زائل کرکے ناقابل فراموش اذیت سے دوچار ہوکر تڑپتا رہے گا بلکہ بار بار مخفی قوت شابولا سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

کسی کو ماردینا بہت آسان ہوتا ہے اور پھر مرنے یا ختم ہونے والا بار بار کی اذیت سے فارغ ہوجاتا ہے۔ لیکن ایک طاقتور جب بار بار ناقابل شکست طاقت سے محروم ہوتا رہتا ہے تو اس پر جو گزرتی ہے صرف وہی جان سکتا ہے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اس کا مدمقابل اسے اذیت سے دوچار کرکے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کردیتا ہے۔" یہاں تک بول کر رولو کا خاموش ہوگیا۔

حکیم وقار بولے۔ "حکیم صاحب اب اصل بات میرے دماغ میں آئی کہ اس کے قبیلہ کے سردار نے واقعی اس کو بار بار اذیت اٹھانے کے لئے اپنے قبیلہ سے نکال دیا۔"

"کم بخت زالوشا...... ہے تو بہت شاطر اور اس وجہ سے مجھے احتیاط سے کام لینا پڑے گا اور ہاں یاد آیا...... اس سلسلے میں میری آپ سے اگر چند دن ملاقات نہ ہوسکے تو آپ گھبرایئے گا مت، پوشیدہ طور پر میں ادھر ہی رہوں گا......

حکیم صاحب اب میں چلتا ہوں اپنے کمرے میں...... چند ضروری کام کرنے ہیں...... اور ہوسکتا ہے ہماری معمول کے مطابق روزانہ ملاقات بھی ہو...... یہ حالات پر منحصر ہے کہ میں کتنا مصروف رہوں گا۔" اور یہ بول کر رولو کا اپنی کرسی سے اٹھا اور حکیم وقار سے مصافحہ کرنے کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا اور پھر رولو کا کے جانے کے بعد حکیم وقار مطب کے دیگر کاموں میں

مصروف ہوگئے۔

ادھر مانی اپنے گھر کے بڑے کمرے میں دینو بابا کے سامنے بیٹھا تھا اور دونوں ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ پھر دینو بابا بولے۔ ''مانی بیٹا تمہارے جانے کے بعد حکیم کامل میرے پاس آئے تھے...... ان سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ بہت ہی ہمدرد، ملنسار اور شفیق انسان ہیں...... انہوں نے مجھے بہت تسلی دی اور ہر طرح کی گارنٹی دی کہ آپ یا مانی بالکل فکر نہ کریں۔

اب آپ دونوں کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ انسانی آبادی میں، میں نے آج تک کسی انسان کو اتنا ہمدرد اور شفیق نہیں دیکھا۔ اب مجھے سو فیصد امید ہے کہ وہ یقیناً ہر طرح کی ہماری مدد کریں گے اور زالوشا کو انجام تک پہنچائیں گے۔

مانی بیٹا وہ یہ بھی بول رہے تھے کہ آپ بغیر میری اجازت کے زالوشا سے کسی قسم کی بھی زور آزمائی نہیں کرنا...... ورنہ اس صورت میں کسی بھی نقصان کا احتمال ہوسکتا ہے...... اور ہاں یہ بھی بول رہے تھے کہ میں نے اپنے خفیہ کارندوں کو آپ دونوں کی حفاظت پر مقرر کردیا ہے۔''

یہ سن کر مانی بولا۔ ''دینو بابا میں ناں کہتا تھا کہ وہ بہت ہی انسان دوست اور دوسروں کی مدد کرنے والے ہیں...... کوئی بھی ضرورت مند ان کے پاس سے مایوس نہیں جاتا۔ ہر آنے والا خوش وخرم واپس جاتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات کہ کسی سے پائی پیسہ نہیں لیتے۔ میری نظر میں تو آج تک کوئی ایسا نظر نہیں آیا جو کہ اس طرح لگن اور دل جمعی سے کسی کا جان جوکھوں کا کام کرتا ہو...... بس یہ صرف دعاؤں کے لئے کہتے ہیں کہ آپ لوگ میرے حق میں صرف دعا کریں۔''

پھر مانی بولا۔ ''دینو بابا۔ یہ تو بتائیں کہ زالوشا کا آخر کوئی نہ کوئی تو ٹھکانہ ہوگا جہاں کہ مستقل رہتا ہو، کیونکہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں دنیا میں یا دنیا سے باہر اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی مخلوقات ہیں ان سب کا کہیں ناں کہیں اور کسی نا کسی شکل میں کوئی ٹھکانہ ہے۔''

دینو بابا بولے۔ ''ہاں بیٹا تمہاری بات درست ہے تمام مخلوقات کا یقیناً کہیں ناں کہیں ٹھکانہ ہوتا ہے ضرور...... اور زالوشا کا بھی ٹھکانہ کہیں ناں کہیں ہوتا ہے مگر صرف اور صرف چند دن کے لئے یا پھر زیادہ سے زیادہ اکتالیس دن کا۔''

''دینو بابا صرف چند دن کا ٹھکانہ یا اکتالیس دن کا کیا مطلب؟'' مانی نے پوچھا۔

دینو بابا بولے۔ ''مانی بیٹا چند دن کا ٹھکانہ کا مطلب ہے کہ یہ اپنی فطرت سے مجبور ہے، یعنی اس کی فطرت میں شامل ہے کہ زیادہ دنوں تک یہ ایک جگہ ٹھہر نہیں سکتا کیونکہ اس کا کوئی بھی سنگی ساتھی نہیں بنتا اور نہ ہی کسی کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اور جس مخلوق سے یہ تعلق رکھتا ہے وہ مخلوق اسے بخوبی جان جاتی ہے اور اسے پتہ چل جاتا ہے کہ اپنے قبیلے کا باغی قانون شکن ہے اور اسی بنا پر قبیلہ والوں نے اسے قبیلہ بدر کردیا ہے۔ لٰہذا وہ سب کے سب اس سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کا ملنا جلنا کوئی رنگ نہ اختیار کرجائے یعنی ایسا نہ ہو کہ اس کی خبر قبیلہ کے سردار یا پھر کسی اور کو ہوجائے تو پھر وہ سزا کا حقدار ہوجائے۔

اور میں نے اکتالیس دن کا کہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب زالوشا...... کسی وقت اپنی مخفی قوتوں میں کمزور ہوجاتا ہے یا پھر جب شابولا کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے تو دوبارہ سے شابولا کو حاصل کرنے کے لئے کسی خفیہ جگہ پر بیٹھ کر اکتالیس دن رات کا عمل کرتا ہے۔''

یہ سن کر مانی بولا۔ ''دینو بابا یہ خاص اکتالیس دن رات ہی عملیات میں کیوں مقرر ہے؟''

دینو بابا بولے۔ ''مانی بیٹا دراصل یہ اوپر والے کا ایک خاص راز ہے جو کہ جاپ یا عمل کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے اور جب کوئی جاپ کرتا ہے تو اکتالیسویں دن مطلوبہ طاقت اس کے پاس آجاتی ہے یا پھر وہ وجود جس کے لئے کہ وہ جاپ کررہا ہے وہ وجود عامل کے زیر اثر ہوجاتا ہے چند شرائط اور قول قرار کے

بعد اور پھر وہ عامل طے شدہ مدت تک اس طاقت کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے اور اس وجود کو قبضے میں رکھنے کے لئے عامل ہر مقررہ وقت پر اس جنتر منتر یا عمل کو ایک مخصوص تعداد میں اس عمل کے الفاظ پڑھتا ہے تو وہ وجود اس کے قابو میں رہتا ہے۔"

"جی دینو بابا اللہ خیر کرے، میں ہر نماز میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ تو دینو بابا اور مجھ پر اپنا فضل وکرم کر اور ہمیں ہر آفات و بلیات سے بچائے رکھ۔" مانی بولا۔

"بیٹا بہت اچھی بات ہے، ہمیشہ اوپر والے سے دعا کرنا چاہئے کہ وہ اپنا فضل وکرم رکھے۔"

یہ باتیں ہورہی تھیں کہ کمرے میں رکھا ہوا پانی کا گھڑا اچانک ہوا میں معلق ہوا اور پھر کافی اوپر جاکر دھڑام سے نیچے فرش پر گرا اور چکنا چور ہوا تو سارا پانی پورے فرش پر پھیل گیا۔

یہ دیکھ کر دینو بابا اور مانی خوفزدہ ہوکر سہم گئے۔ دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ یہ ہوا تو کیسے ہوا کہ اتنے میں ایک کرخت غراہٹ بھری آواز سنائی دی۔ "التمش تیری سوچ غلط ہے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا...... تونے اپنے حمایتی کو میرے پیچھے لگانے کا جو پروگرام بنارہا ہے یہ اچھا نہیں ہوگا...... میں تجھے اور تیرے حمایتی کو بھی دیکھ لوں گا۔ اگر میں نے تم لوگوں کو ننگی کا ناچ نہیں نچایا تو میرا بھی نام زالوشا نہیں...... اب میں دوبارہ شابولا کو حاصل کرنے کے لئے جاپ شروع کررہا ہوں...... التمش اب تو اپنی خیر منا۔ اب کی بار تو کسی بھی حال میں میرے ہاتھوں نہیں بچے گا اور یہ تیرا پہلوان پدی اور پدی کا شوربہ اسے تو میں مسل کر پھینک دوں گا اور عنقریب......"

اور آواز آنا یک بیک بند ہوگئی، اتنے میں ایک بڑا سا چوہا دھڑام سے دروازے پر گرا اور چیں چیں کرکے چیخنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس چوہے کو کسی نے پکڑ کر دروازے پر پٹخ دیا ہو، لیکن اچانک اتنا بڑا وہ چوہا آیا تو کہاں سے کیونکہ کمرے میں کوئی ایسی جگہ اور نہیں تھی کہ

اس جگہ سے وہ چوہا نمودار ہوا تھا...... اور پھر اتنی زور سے دروازے پر گرنا اور باعث تکلیف زوردار آواز میں چیخنا...... عجیب اور اچنبھے والی بات تھی۔

چوہا چیختا اور تڑپتا ہوا تیزی سے دروازے سے باہر نکلا اور چشم زدن میں غائب ہوگیا۔ چوہا کے غائب ہوتے ہی مانی اور دینو بابا کو جیسے ہوش آگیا۔

مانی بولا۔ "دینو بابا یہ سب کیا ہے؟ اور یہ آواز کس زبان کی تھی؟ اور پھر اوپر سے چوہے کا گر کر چیخنا میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔

آواز سے تو میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ آواز یقیناً زالوشا کی تھی جو کہ ہمیں دھمکی دے کر گیا ہے اور وہ چوہا؟" اور مانی خاموش ہوگیا۔

دینو بابا بولے۔ "ہاں مانی بیٹا تم نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے وہ آواز زالوشا کی تھی جو کہ خاص طور پر مجھے دھمکی دینے آیا تھا۔ اور وہ چوہا کوئی اور نہیں بلکہ چوہے کی شکل میں زالوشا خود تھا۔ اس کا نیچے گرنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ رولوکا صاحب کا کوئی پوشیدہ کارندہ تھا جو کہ زالوشا...... پر جھپٹا اور اسے پکڑ کر دروازے پر دے مارا...... اس کی گرفت کی طاقت اتنی تھی کہ زالوشا برداشت نہ کرسکا اور زیادہ چوٹ کی وجہ سے اس کی چیخ نکل گئی...... اور وہ فوراً بھاگ نکلا...... اگر وہ بھاگتا نہیں تو اس کا زیادہ جسمانی نقصان ہوجاتا۔

اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ رولوکا صاحب کا کہا بالکل ٹھیک ہے کہ انہوں نے اپنے کارندے ہماری حفاظت کے لئے مامور کردیئے ہیں۔

خیر مانی بیٹا تم بالکل بھی فکر نہ کرو...... زالوشا...... اپنے کسی بھی منصوبے میں کامیاب نہ ہوگا بلکہ قدم قدم پر منہ کی کھائے گا، اب یہ سمجھ لو کہ شکست اس کا مقدر بن چکا ہے۔"

ادھر رولوکا اپنے کمرے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا اور کچھ آوازیں بھی کسی انجان زبان کی سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر وہ اپنی گردن کبھی اوپر نیچے اور کبھی

دائیں بائیں بھی حرکت دے رہا تھا۔ گردن کے ہلانے سے ایسا لگتا تھا کہ وہ ان باتوں کو بخوبی سمجھ رہا ہے اور پھر اپنی رائے کا اظہار بھی کر رہا ہے۔

پھر رولوکا کے منہ سے نکلا۔ ”زالوشا تیری یہ حرکت ٹھیک نہیں......تو پچھتائے گا۔“ پھر رولوکا کے منہ سے نکلا ”جاگتے الو......“ اس کے بعد جو زبان رولوکا نے استعمال کی وہ عام زبان نہیں تھی۔ وہ کوئی ایسی زبان تھی کہ شاید اس کے کارندے ہی سمجھتے تھے۔ پھر چند منٹ کے بعد رولوکا اپنی گردن جھکا کر خاموش بیٹھا رہا۔

اس کے بعد چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک بادلوں کے زبردست گرجنے اور بجلی کی آواز سنائی دینے لگی۔ بجلی اور بادلوں کی ایسی آواز تھی کہ جیسے کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ ساتھ ہی زبردست بارش اور ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔

اس خوفناک دل دہلا نا قابل فراموش سہا دینے والا منظر لوگوں کے دلوں پر سکتہ طاری کرنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے حکیم وقار کا سارا مطب آج کی رات نیست و نابود ہو جائے گا۔ مطب میں جو بھی جہاں تھا دبک گیا تھا اور اللہ سے دعائیں کر رہا تھا۔ ہر کسی کے دل میں یہ بیٹھ چکا تھا کہ چند لمحے میں ہی مطب کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

ہوا کے جھکڑوں میں تیزی آ گئی تھی اور بادل تو ایسے گرج رہے تھے کہ جیسے قیامت کا صور پھونکا جا رہا ہو۔ اور بجلی کی چمک تو بند کمرے میں آنکھوں کو چندھیائے دے رہی تھی۔ چونکہ کمروں کے دروازے بند تھے مگر روشن دان سے بجلی چمکنے کی چمک ضرور اندر آ رہی تھی۔

بجلی چمکنے بادل گرجنے اور پھر ہوا کے جھکڑوں میں تیزی بلکہ بہت زیادہ تیزی آ گئی۔ یہ دیکھ کر لوگ چیخنے چلانے لگے......اور پھر یہی نہیں بلکہ مطب کے کمروں کی چھتیں ہوا میں اکھڑنے لگیں ہر ایک چیز کو ہوا اڑائے دے رہی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو جو خوفناک منظر نظر آتا اسے دیکھ کر لوگ اپنا ہوش و حواس کھونے لگے، جو افتاد آن پڑی تھی وہ انسانی قوت برداشت سے باہر تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے طوفان نوح آ گیا ہو......

پورے مطب پر قیامت برپا تھا اور مطب سے باہر کیا ہو رہا تھا کسی کو کوئی خبر نہ تھی......کیونکہ کسی کو ہوش ہی کہاں تھا......سب کو تو صرف اور صرف اپنی جان کی پڑی تھی......ایسے میں کوئی کسی اور کی خبر کیسے رکھ سکتا تھا۔ اور اس کے بعد پھر جو ہوا چلی بادل گرجے بجلی چمکی ہواؤں کا زور جب بڑھا اور اتنا بڑھا کہ حکیم وقار کا سارا مطب مکمل طور پر نیست و نابود ہو کر ہوا کے رحم و کرم پر رہ گیا اور پھر ہوا سارے مطب کو اڑا کر نہ جانے کہاں لے گئی۔

اچانک حکیم وقار کی فلک شگاف......دل دہلاتی اور کان پھاڑتی آواز سنائی دی......”حکیم کامل......“

اس کی آواز کا سننا تھا کہ رولوکا طیش کے عالم میں کمرے کی چھت پر پہنچا اور گونجدار کرخت اور فلک شگاف آواز میں پکارا۔

”زالوشا......زالوشا......اب تو اپنے یہ اوچھے ہتھکنڈے بند کر دے اور فوراً یہاں سے دفع ہو جا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کی یہ رات تیری آخری رات ثابت ہو۔“

پھر رولوکا نے اپنا سیدھا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیا۔ ہاتھ کا اوپر اٹھنا تھا کہ رولوکا کی انگلیوں سے سرخ سرخ شعاعیں نکل کر پورے مطب پر چھا گئیں اور پھر یک بیک اس طرف بڑھیں جس طرف سے بادلوں کے گرجنے، بجلی کے چمکنے اور ہواؤں کے جھکڑ چلنے کی زوردار آوازیں آ رہی تھیں کہ پھر اچانک سارا کچھ ختم ہو گیا۔ بادل کے گرجنے، ہواؤں کے جھکڑ اور بجلی کا چمکنا غائب ہو گیا۔

ارے یہ کیا......حکیم وقار کا سارا مطب اپنی جگہ مکمل طور پر محفوظ تھا، مطب کی ایک چیز بھی اکھڑی یا ٹوٹی ہوئی نہیں تھی......ہر چیز جوں کی توں تھی بلکہ ایک تنکا تک ادھر سے ادھر نہیں ہوا تھا۔

تو وہ سب کیا نظروں کا دھوکا تھا، بادلوں کا گھن گرج، ہواؤں کا جھکڑ اور بجلی کی جان لیوا چمک، یک

بیک چشم زدن میں ختم ہو جانا، رولوکا کے منہ سے نکلا۔

''کم بخت زالوشا...... تو شعبدہ بازی سے مجھے ہلکان یا پریشان نہیں کرسکتا۔'' اور پھر اس کے بعد رولوکا نے جاگتے الوکو آواز دی۔

رولوکا کی آواز پر جاگتا الوفوراً حاضر ہوگیا تو رولوکا نے اسے اپنی زبان میں پیغام دیا جسے سن کر وہ ایک طرف کو پرواز کرگیا۔

اس کے بعد رولوکلا نے پھر اپنے چند کارندوں کو حاضر کیا۔ وہ سارے کارندے پوشیدہ حالت میں تھے اور کسی کو بھی سوائے رولوکا کے نظر نہیں آتے تھے۔ رولوکا نے انہیں بھی پیغامات دیئے اور پھر اس کے بعد اپنے کمرے میں آگیا۔

رولوکا کے سارے کارندے بمع جاگتا الو کے ہر طرف پھیل گئے اب ان کے ذمہ تھا کہ وہ زالوشا کی ہر حرکت پر نظر رکھیں اور ایک ایک پل کی خبر رولوکا کے گوش گزار کریں کہ اس وقت زالوشا کہاں ہے اور کیا کررہا ہے...... سارے کارندے چوکس ہو کر اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھانے لگے تھے۔

زالوشا، حکیم وقار کے مطب پر شعبدہ بازی کرنے کے بعد بھاگا اور پھر بھاگتا ہی رہا، اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ رولوکا اب ہر حال میں اسے نہیں چھوڑے گا، کیونکہ اس نے بہت زبردست اور پریشان کن شعبدہ بازی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر رولوکا کی جگہ کوئی عام سا عامل ہوتا تو وہ اب تک نہ جانے کہاں کا ہوکر رہ گیا ہوتا۔ یہ تو رولوکا تھا جو کہ اس کے اوچھے ہتھکنڈوں پر ڈٹا رہا۔

زالوشا کے دل میں خوف بیٹھ گیا تھا، اسے خدشہ تھا کہ کسی پل بھی رولوکا اسے دبوچ لے گا اور اس کا خاتمہ کردے گا۔ اس لئے وہ ہر پل ادھر سے ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔

پھر اچانک اس کے دل میں آیا کہ ''کیوں ناں میں ایک خفیہ جگہ بیٹھ کر شابولا کو قابو کرنے کے لئے جاپ شروع کردوں کیونکہ اب میں بغیر شابولا کے ساتھ کے آتش، مانی اور رولوکا پر قابو نہیں پاسکتا۔''

اور پھر اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی وہ قرب و جوار کی جگہیں دیکھنے لگا کہ کونسی جگہ زیادہ محفوظ اور پوشیدہ رہے گی، اور اس جگہ کو رولوکا کے کارندے نہ ڈھونڈ سکیں گے۔ اب وہ پوشیدہ جگہ کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔

سارا دن ساری رات اس کی آنکھوں میں کٹنے لگی جو بھی جگہ وہ دیکھتا اسے ناپسند کردیتا...... اس کے دل میں آتا کہ یہ جگہ زیادہ پوشیدہ اور محفوظ نہیں...... اس جگہ رولوکا کے کارندے بڑی آسانی کے ساتھ مجھ تک پہنچ سکتے ہیں اور جب وہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے اور میں جاپ کے لئے کنڈل میں موجود ہوں گا تو پھر میں ان کارندوں سے جان چھڑا کر بھاگ بھی نہیں سکتا اور پھر اس طرح میں قید ہوکر رہ جاؤں گا۔

وہ بھاگتا رہا اور ہلکان ہوتا رہا اسے کوئی محفوظ جگہ مل کے نہ دے رہی تھی۔

اور پھر اس نے ہمالیہ کی ترائی میں محفوظ جگہ کے لئے سرگرداں ہوگیا۔ محفوظ جگہ کی تلاش کے لئے اس نے رات دن ایک کردیا...... اور پھر بڑی تگ و دو کے بعد اسے ایک جگہ نظر آہی گئی۔ وہ جگہ ہمالیہ کی ترائی میں تھی...... کافی اندر جاکر...... وہ ایک چھوٹا سا بہت گہرا گپھا تھا۔ اسے دیکھ کر زالوشا بہت خوش ہوا...... اس کے دماغ میں فوراً آیا کہ یہ جگہ بالکل محفوظ رہے گی...... رولوکا کے کارندے کسی صورت میرا نشان تک نہیں پاسکتے۔

اور پھر سارا اطمینان کرنے کے بعد اس نے اپنی ضرورت کے تمام لوازمات گپھا میں رکھ لیا اور پھر اس نے شابولا سے رابطہ کیا۔

شابولا۔ ''زالوشا...... یہ تیری مرضی پر منحصر ہے کہ جب چاہے تو میرے لئے جاپ شروع کردے۔'' اور اس کے بعد زالوشا نے گپھا کے اندر بہت بڑا کنڈل قائم کیا اور اطمینان کے ساتھ اس کنڈل میں بیٹھ گیا۔ اس کنڈل میں اس نے ضرورت کی تمام چیزیں رکھ لی تھیں اور جب اسے بالکل ہی اطمینان ہوگیا تو کنڈل میں بیٹھ کر شابولا کو قابو میں کرنے کے لئے جنتر منتر پڑھنے میں

منہمک ہوگیا۔ اس نے اپنا تن من جاپ پر لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اسے یہ تو پتہ تھا کہ اب مجھے ہر حال میں اپنی آنکھیں بند رکھنی ہیں اور مجھے اکتالیسویں دن ہی اس کنڈل سے نکلنا ہے اور اسی دن اپنی آنکھیں بھی کھولنی ہیں۔

ادھر رولوکا کے کارندوں نے یہ خبر پہنچادی کہ زالوشا...... شابولا کو قابو کرنے کے لئے پورے اکتالیس دن کے جاپ پر ہمالیہ کی ترائی میں موجود ایک خفیہ گپھا میں بیٹھ گیا ہے۔ یہ سن کر رولوکا مطمئن ہوگیا کہ چلو اب زالوشا سے جان چھٹی پورے اکتالیس دن کے لئے۔

پھر رولوکا نے مصمم ارادہ کرلیا کہ کسی بھی صورت زالوشا کو اکتالیس دن پورے نہیں کرنے دینے ہیں۔ کیونکہ اس نے پورے اکتالیس دن کا جاپ مکمل کرلیا تو شابولا دیوتا اس کے زیراثر آ جائے گا اور پھر اس طرح زالوشا مزید جنتر منتر میں طاقتور ہو جائے گا۔

زالوشا بھی اپنی جگہ مطمئن تھا کہ ''اب تو میں ہر حال میں اکتالیس دن کا جاپ مکمل کرلوں گا اور شابولا میرے قابو میں آجائے گا، پھر میں رولوکا اور التمش کا اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گا، اس مرتبہ تو خاص طور پر التمش کا خاتمہ ہی کر کے رہوں گا کیونکہ التمش نے کئی مرتبہ میرے بنے بنائے کام خراب کردیئے ہیں اور اس طرح کئی مرتبہ میں شکست سے دوچار ہوا ہوں۔ اگر دیکھا جائے تو پورے سنسار میں ایک التمش ہی ایسا ہے جو کہ میرا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اب میں اس موذی دشمن کی گردن مروڑ کے رکھ دوں گا۔ اور جب تک التمش اس سنسار میں رہے گا میرے لئے وبال جان بنا رہے گا، میرے تمام بڑے بڑے منصوبے میں ٹانگ اڑاتا رہے گا، اب اکتالیس دن پورے کرنے کے بعد سب سے پہلا کام التمش کا خاتمہ کروں گا۔ اب میں نے تمام کام سوچ بچار کر کے کرنا ہے کیونکہ اکثر میری جلد بازی میرا کام خراب کردیتی ہے۔ لہٰذا اب احتیاط بہت ضروری ہے۔ اب تو صرف التمش ہی میرا دشمن نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ رولوکا بھی میرا دشمن بن بیٹھا ہے اور ہاں مانی تو وہ کس کھیت کی مولی ہے اس کے لئے تو میرا ایک ادنیٰ وار ہی کافی ہوگا، اور اس طرح وہ اپنی جان سے جائے گا۔ اس گپھا سے نکلنے کے بعد میں کئی روز تک اپنے منصوبے کو سوچ سمجھ کر عملی جامہ پہناؤں گا۔''

یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد زالوشا نے اپنا کام شروع کردیا۔

ایک دن دو دن اور پھر اس طرح جاپ کرتے ہوئے زالوشا کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ آٹھویں دن اچانک زالوشا کے کان میں ایک زبردست پھنکار سنائی دی اور پھر زالوشا نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول دیں، تو اس کے سامنے ایک مہیب شکل اور خوفناک دراز جسم کا مالک سانپ موجود تھا اس کی پھنکار اتنی خوفناک تھی کہ زالوشا کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ وہ سانپ پھنکارتا ہوا آہستہ آہستہ زالوشا کی جانب بڑھ رہا تھا۔

سانپ کی دونوں آنکھیں سرخ انگارہ ہورہی تھیں اور پھر ان سے وقفے وقفے سے شعلے بھی نکلنے رہے تھے۔ زالوشا کے دماغ میں فوراً آیا کہ ایسا تو نہیں کہ التمش یا پھر رولوکا کو میرے جاپ کا پتہ چل گیا ہو اور پھر ان دونوں میں سے کسی نے اس موذی کو بھیجا ہے تاکہ میرا حشر نشر کردے اور اگر ایسی بات ہے تو پھر اس موذی سے کیوں نہ جان چھڑالی جائے۔ ابھی تو جاپ کرتے ہوئے میرا آٹھواں ہی دن ہے۔ اگر جان بچی تو آئندہ کوئی مناسب وقت دیکھ کر شابولا کا جاپ کرلوں گا۔

اور پھر اس نے اپنا ارادہ مضبوط کرلیا کہ اب مجھے اس جگہ سے بھاگ جانا چاہئے کہ اتنے میں اسے خیال آیا کہ ارے یہ تو نظروں کا دھوکہ یا پھر عمل سے دور کرنے کے لئے ایک ادنیٰ ساحربہ ہے یہ تو اکثر جاپ کے درمیان ہوتا ہے۔ اس سے پہلے بھی جب میں نے شابولا کو قابو کرنے کے لئے جاپ شروع کیا تھا تو ایسے کئی مہلک اور خوفناک مناظر مجھے نظر آئے تھے۔

اور یہ سوچتے ہی اس نے اپنا دل مضبوط کیا اور پھر جنتر منتر پڑھنے میں جٹ گیا۔

پھر اس کے بعد آئے دن ڈراؤنے دھمکانے کا

عمل شروع ہوگیا۔ کبھی کوئی خوفناک اور مہیب شکل چیز آجاتی تو کبھی کوئی بہت ہی دیوہیکل کئی کئی سر اور کئی کئی منہ والا شخص نظر آتا جو کہ طرح طرح سے زالوشا کو ڈراتا دھمکاتا تاکہ وہ جاپ کو چھوڑ دے اور گپھا سے نکل بھاگے۔

ایک رات رولوکا کے کارندوں نے رولوکا کو خبر دی کہ زالوشا کو جاپ پر بیٹھے ہوئے آج اکیسواں دن ہے تو رولوکا کے دماغ میں آیا۔ کیونکہ رولوکا اپنے دیگر کاموں میں مصروف ہوکر زالوشا کو تقریباً بھول چکا تھا۔

اور جب رولوکا کو پتہ چلا تو رولوکا نے اپنے کارندوں کو جواب دیا کہ اچھا میں اس کے لئے کچھ سوچتا ہوں اور پھر سوچ بچار کے بعد ہی کوئی قدم اٹھاؤں گا۔ اور پھر اسی رات رولوکا نے زالوشا کے لئے ایک پروگرام مرتب ڈے والا۔

زالوشا گپھا میں بیٹھا جاپ میں مصروف تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ جہاں وہ بیٹھا ہے اس جگہ کی برف پگھل رہی ہے اور اتنی پگھل رہی ہے کہ کافی مقدار میں پانی جمع ہورہا ہے۔ یہ دیکھ کر تو زالوشا کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔

کیونکہ زالوشا جانتا تھا کہ کنڈل ہمیشہ سیندور، گیرو، لوبان یا پھر مضبوط کنڈل چاقو یا چھری سے کیا جاتا ہے اور اگر کنڈل زدہ زمین کسی نہ کسی طرح کھد جائے یا زمین کی مٹی کسی صورت بھی اپنی جگہ چھوڑ دے تو پھر کنڈل قائم نہیں رہتا۔

زالوشا نے جو کنڈل قائم کیا تھا وہ ایک بڑی چھمری سے ٹھوس برف پر کیا تھا اور اسے پتہ تھا کہ کسی حال میں بھی ٹھوس برف پگھلے گی نہیں۔

اور اب گپھا میں اس جگہ کی ٹھوس برف پگھل رہی تھی۔ لہٰذا اب کنڈل کا قائم رہنا ممکن نہیں تھا اتنے میں کسی نادیدہ قوت نے زالوشا کو تیزی سے پشت کی جانب دھکیلنا شروع کیا اور زالوشا آناً فاناً گپھا سے باہر آن گرا، زالوشا ہوش سے بیگانہ اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہوکر رہ گئی تھیں پھر اچانک اسے ہوش آگیا اور اس کے منہ سے نکلا۔ ”شابولا...... شابولا“

اس کے فوراً بعد غائب ہوگیا۔ زالوشا کی اس حالت کو دیکھ کر رولوکا کے نادیدہ کارندے ہکابکا رہ گئے کہ پلک جھپکتے یہ گیا تو کہاں گیا اور پھر انہوں نے رولوکا سے رابطہ کیا اور ساری حقیقت بتلادی۔

رولوکا نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ اب زیادہ اس کے لئے ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں اور یہ ضرور دھیان میں رکھو کہ زخمی درندہ یا زخمی موذی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ زالوشا مانند زخمی فرار ہوا ہے، اس کی زبردست شکست ہوئی ہے لہٰذا اپنا سارا زور صرف کرے گا کہ بدلہ لے سکے۔

اور اس کے لئے ضروری ہے کہ تم سب قرب و جوار کے تمام علاقوں پر نظریں رکھنے کے ساتھ ساتھ چوکس رہو...... اس کی طرف سے ذرا بھی غفلت نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔

ادھر زالوشا...... زخمی ناگ کی طرح پھنکارتا ہوا کسی سمت کا تعین کئے بغیر آندھی اور طوفان کی طرح بھاگتا رہا۔ بھاگتا رہا...... اسے کچھ بھی سجھائی نہ دے رہا تھا کہ وہ کدھر جارہا ہے اور پھر جب بھاگتے بھاگتے اس علاقے سے خاصی دور ایک جنگل میں پہنچا تو نڈھال ہو کر دھپ سے گر پڑا۔ اس کی آنکھیں بند اور اس کا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ لرزہ کی بیماری میں مبتلا ہوگیا ہے۔

دیگر گوں حالات سے دوچار درخت پر پڑا رہا......

اسے اپنے اردگرد کا کوئی ہوش نہ تھا......

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک کسی نے زالوشا کو جھنجھوڑ کر اٹھایا...... کسمساتا ہوا اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک دیوہیکل بدہیت شکل شخص کھڑا تھا...... اسے دیکھتے ہی زالوشا نے یہ تو اندازہ کرلیا کہ یہ بھی کوئی نادیدہ مخلوق ہے کیونکہ کوئی عام انسان ایسا نہیں ہوسکتا۔

زالوشا پر ایک مرتبہ پھر کپکپی طاری ہوگئی مگر اب اس کے حواس اس کے قابو میں تھے وہ موقع کی نزاکت کو

بھانپ گیا اور فوراً اس کے منہ سے نکلا۔ ''محترم و معزز......'' اور اس کی بات حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

سامنے موجود وجود نے کہا۔

''زنتاش۔''

زالوشا کی زبان لڑکھڑانے لگی پھر بھی اس کے منہ سے نکلا۔ ''محترم زنتاش! میرا نام زالوشا ہے، میں ایک مسافر ہوں اور ناقابل فراموش مصیبت میں گرفتار ہوں اور نہ جانے کتنی مسافت طے کر کے اپنی جان بچا کر یہاں تک پہنچا ہوں۔'' اور پھر زالوشا نے صرف اتنا بتایا کہ میں ایک جاپ کرنے کے لئے کنڈل میں بیٹھا تھا کہ دشمن نے مجھ پر دھاوا بول دیا اور میرے ساتھ برا سلوک کیا اور جب میری جان لینے کے درپہ ہو گیا تو پھر میں موقع پاتے ہی بھاگ نکلا، لیکن پھر بھی انہوں نے میرا پیچھا کیا۔

زالوشا نے اپنی کارستانی اور دوسروں کے ساتھ اپنی زیادتیوں کا ذکر اور اپنے قبیلہ سے نکالنے جانے کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا۔

جب زنتاش نے اس سے اس کے قبیلہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں اپنی پسندیدہ ایک جنی سے محبت کرتا تھا کہ اچانک درمیان میں ایک جن آ گیا اور اس نے زور زبردستی شروع کردی تو میری محبوبہ نے اسے ڈانٹا تو اس نے اس کے ساتھ زبردستی شروع کردی تو طیش میں آ کر میں نے اسے جان سے مار ڈالا۔

ہمارے قبیلہ کا یہ قانون ہے کہ کوئی کسی کو جان سے نہیں مار سکتا۔ اور ایسا کرنے والے کو قبیلہ بدر کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر اسی قانون کے تحت مجھے قبیلہ بدر کر دیا گیا اور قبیلہ کے قانون کے پیش نظر قاتل کی سزا ناقابل معافی ہوتی ہے لہٰذا میں کسی صورت اب اپنے قبیلہ میں جا نہیں سکتا۔

قبیلہ سے نکلنے کے بعد میں نے سوچا کہ کیوں ناں اپنی مخفی قوتوں کو اور مضبوط کرلوں اور اس کے لئے میں نے ایک بہت مناسب جگہ ہمالیہ کی ترائی میں ڈھونڈ کر اس جگہ بیٹھ گیا۔ جاپ کی جب بائیسویں رات آئی تو نہ جانے کسی دشمن کو کیسے پتہ چل گیا اور پھر اس نے میرا کنڈل توڑ کر مجھے بڑی بے دردی سے گھما کے اندر سے گھسیٹتا ہوا باہر لا پھینکا اور یہ تو اچھا ہوا کہ میں اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا نہیں تو ان سب نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

محترم زنتاش میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ میری مدد کریں اور کچھ دنوں تک کے لئے مجھے یہاں پناہ لینے دیں۔ آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ میری التجا قبول کرلیں گے؟''

زالوشا نے اپنی جھوٹی مصیبت کے متعلق جس طرح بتایا اسے سن کر زنتاش کے دل میں ہمدردی پیدا ہوگئی اور اس نے جواب دیا۔

''زالوشا تم ایک ستائے ہوئے مسافر ہو، تم پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں اور تمہارے دردناک حالات کے پیش نظر...... چلو جب تک تمہارا دل چاہے یہاں رہ سکتے ہو...... ویسے یہ درخت تو میرا مسکن ہے لیکن خیر کوئی بات نہیں، میں ساتھ والے درخت پر گزارہ کرلوں گا...... ویسے میرا قبیلہ ستاروں کا پجاری ہے اور ہم لادین جنات ہیں۔

جنگل کے برابر میں جو میدان ہے اس میدان میں میرا قبیلہ آباد ہے اور میں وقتاً فوقتاً اس جنگل میں اپنا دل بہلانے کے لئے آتا ہوں اور اس درخت پر آرام کرتا ہوں۔ ویسے میرے قبیلے کے دیگر جنات بھی اس جنگل میں گھومتے پھرتے ہیں...... میں تمہارے متعلق قبیلہ والوں کو بتادوں گا کہ ایک مسافر مصیبت کا مارا ہماری حدود میں پناہ لینے کے لئے آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ رعایت برتا جائے۔

ویسے زالوشا...... تمہاری روداد بڑی درد ناک ہے...... اگر میری مدد کی ضرورت پڑے تو بلا جھجک بتا دینا، آج سے میری اور تمہاری دوستی پکی...... میں خود تمہارے پاس آیا کروں گا...... تم ہمارے قبیلہ میں نہیں آنا کیونکہ ہم دونوں ہیں تو جنات مگر ہم دونوں الگ

الگ مذہب کے پیروکار ہیں...... ہم ستاروں کے پجاری اور تم آگ کے پجاری ہو۔

زالوشا...... ویسے تم نے اپنے نادیدہ دشمن کے متعلق کیا سوچا ہے...... آئندہ کا کیا پروگرام ہے...... تمہاری باتوں سے تو میں نے اندازہ لگالیا ہے کہ تمہارا دشمن تم سے زیادہ قوی ہے اور قوی دشمن سے لڑنا یا بدلہ لینا کوئی آسان کام نہیں...... اور اگر ہماری مدد کی ضرورت پڑے تو بتادینا میرے کئی دوست ہیں جو میری بات مانتے ہیں اور ہم کوشش کریں گے کہ ہم تمہارے ساتھ مل کر تمہارے دشمن کو زیر کریں۔

لیکن میں اپنے تئیں پہلے معلوم کروں گا کہ تمہارا دشمن کتنا زورآور ہے اور اس کی پہنچ کتنی دور تک ہے اور اس کا تعلق کہاں سے ہے اور اس کے کارندے کتنے طاقتور ہیں......؟ اور جب پوری معلومات کرلوں گا تو پھر تمہاری مدد کے لئے میں کوئی منصوبہ بناؤں گا اور پھر تمہارے ساتھ آگے کو بڑھوں گا۔

اور تم یہ بھی خیال رکھنا کہ تمہارا دشمن اگر زیادہ طاقتور ہوا، یا پھر وہ حق پر ہوا تو ہم تمہارا ساتھ کسی صورت بھی نہیں دیں گے۔ کیونکہ خواہ مخواہ اور بلا مقصد کسی کے چکر میں پڑنا ٹھیک نہیں...... اور ہمارے قبیلے کا دستور ہے کہ خواہ مخواہ کسی بے قصور کو چھیڑنا ٹھیک نہیں...... تم ان باتوں کو دھیان میں رکھنا اور اگر تم قصوروار ہوئے تو یہ جگہ بھی تمہیں چھوڑنی پڑے گی......'' اور یہ بول کر زنتاش خاموش ہوگیا۔ پھر وہ بولا۔'' اچھا زالوشا...... اب تم آرام کرو...... اور میں بھی آرام کرتا ہوں۔''

ویسے رولوکا کے کارندوں میں جاگتا الو ایسا تھا کہ جو چوکس طریقے سے زالوشا کی نگرانی کررہا تھا اور ساری خبریں رولوکا تک پہنچا رہا تھا لیکن زالوشا ان باتوں سے بے خبر نیند کے مزے لے رہا تھا۔

زالوشا بہت زیادہ حیران پریشان تھا کہ آخر رولوکا یا پھر التمش کو پتہ کیسے چلا کہ میں ہمالیہ کی ترائی میں موجود اس خفیہ گپھا میں جاپ کررہا تھا۔ ویسے التمش کی طاقت کے بارے میں تو میں جانتا ہوں کہ اس کی پہنچ کہاں تک ہوسکتی ہے۔ ہو ناں ہو یہ رولوکا کی کارستانی ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ رولوکا کچھ زیادہ ہی طاقتور ہے۔

رولوکا تو بھی کیا یاد کرے گا زالوشا سے تیرا پالا پڑا ہے، وہ تو میں مغالطے میں رہا ورنہ تو میری گرد کو کہاں پہنچ سکتا تھا، مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے گپھا کے باہر سفید کنڈل قائم نہیں کیا، اور پھر گپھا کے اندر مجھے سرخ کنڈل قائم کرنا چاہئے تھا۔

اگر میں نے بھی تیرا دن کا سکون اور رات کی نیند حرام نہ کردی تو میرا نام بھی زالوشا نہیں۔ اور پھر ایسی ہی سوچوں کے تحت زالوشا کے شب و روز گزرنے لگے، کوئی ایسا پل نہیں گزرتا کہ وہ رولوکا التمش اور مانی کو نیست و نابود کرنے کا منصوبہ نہ بناتا رہا۔

زالوشا کو گپھا سے جب رولوکا کے کارندوں نے نکال باہر کیا اور اس کا جاپ ادھورا رہ گیا تو ایک صبح رولوکا مانی کے گھر پر آیا التمش سے ملنے کے لئے تاکہ ہر طرح سے خبردار کردے کہ زالوشا زخمی ناگ کی طرح اپنا ادھورا جاپ چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

دروازے پر پہنچ کر رولوکا نے دستک دی...... تو چند لمحے بعد ہی دروازہ کھلا، دروازہ کھولنے والا مانی تھا، رولوکا کو دیکھ کر مانی خوشی سے اچھل پڑا...... اور فوراً بولا۔

''حکیم صاحب السلام علیکم۔''

رولوکا نے اس کے سلام کا جواب دیا اور پھر مانی نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھادیا اور ساتھ ہی اس کے منہ سے آواز نکلی۔'' دینو بابا دیکھئے کون آیا ہے؟''

دینو بابا بولے۔'' بھئی کون آیا ہے؟ بتاؤ تو صحیح۔''

مانی چہکتے ہوئے بولا۔'' رولوکا صاحب تشریف لائے ہیں۔''

یہ سنتا تھا کہ التمش عرف دینو بابا جیسے دوڑتے ہوئے دروازے پر آئے اور فوراً سے پیشتر رولوکا سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور بولے۔'' آپ نے آنے کی تکلیف کیوں کی، کوئی اشارہ مجھے کردیتے تو ہم دونوں فوراً ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے، ارے آپ

دروازے پر کیوں کھڑے ہیں اندر تشریف لائیں، مانی بیٹا تم نے انہیں دروازے پر کیوں کھڑا کر رکھا ہے۔"

یہ سن کر رولو کا بولا۔ "التمش صاحب کوئی بات نہیں...... چلیئے اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔"

مانی اور دینو بابا دروازے سے ایک سائیڈ ہو کر رولو کا کو اندر آنے کے لئے راستہ دیا تو رولو کا نے اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔ اندر آ کر رولو کا ایک چارپائی پر بیٹھ گیا تو دینو بابا بولے۔ "محترم! آپ کے لئے گرم یا ٹھنڈا لاؤں۔"

یہ سن کر رولو کا بولا۔ "آپ تکلیف نہ کریں، میرے سامنے بیٹھیں اور میری باتیں غور سے سنیں جس کے لئے میں آیا ہوں، بہت اہم باتیں ہیں، غور طلب اور عمل کرنے والی۔"

"جی حکم کریں۔" دینو بابا بولے۔

رولو کا بولا۔ "التمش صاحب دراصل بات یہ ہے کہ زالوشا جب یہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگا اور پھر اس کے بعد پناہ کی خاطر سرگرداں رہا...... کوئی ایسی جگہ اسے نہ مل رہی تھی کہ وہ اپنا ٹھکانہ بنالے اور پھر طیش میں آ کر ایک رات اس نے بہت خطرناک شعبدہ بازی پر اتر آیا۔ اس نے باطنی طور پر بہت زبردست حملہ پورے مطب پر کیا تاکہ اس سے میں ہراساں ہو جاؤں اور اس سے خوف کھا کر اس کا خیال اپنے دماغ سے نکال دوں...... اگر کوئی اور میری جگہ ہوتا تو بوکھلاہٹ میں کچھ سے کچھ کر گزرتا خیر میں نے اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

پھر اسے میری طاقت کا اندازہ ہوا...... بہر حال وہ پوشیدہ ٹھکانہ اور سکون کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑتا رہا...... اور کافی تلاش بسیار کے بعد ہمالیہ کی ترائی میں ایک جگہ اسے مل گئی۔ وہ بہت ہی اندر جا کر ایک تنگ سا گپھا تھا جس میں اس نے اپنا ٹھکانہ بنالیا اور پھر اپنی مخفی طاقت میں مزید اضافہ کے لئے اس نے شابولا کا جاپ شروع کر دیا۔

لیکن بائیسویں رات میں میرے کارندوں نے اسے حال سے بے حال کر کے اس کا کنڈل توڑ دیا اور اسے گپھا سے گھسیٹ کر باہر نکال دیا۔ تو وہ بدحواس ہوش سے بیگانہ ہو کر زخمی ناگ کی طرح پھنکارتا ہوا ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا، میرے کارندوں نے اس کا پیچھا کیا...... مگر پھر میں نے انہیں اس کے پیچھے جانے سے روک دیا۔

لیکن اپنا ایک اہم کارندہ اس کے پیچھے لگا دیا تاکہ وہ اس کی مخفی سرگرمیوں کے متعلق مجھے باخبر رکھے۔

وہ بھاگتا بھاگتا فلاں جنگل میں پہنچ گیا اور اس جگہ اپنا عارضی ٹھکانہ بنالیا، اس جگہ اس کی ملاقات ایک لادین جن سے ہوئی اور اس نے اپنی جھوٹی روداد سنا کر اسے اپنا ہم خیال بنا رکھا ہے۔

تو میرا آپ سے یہ کہنا ہے کہ اس کی طرف سے ہر پل چوکنا رہیئے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو غافل دیکھ کر حملہ کر دے، کیونکہ وہ بہت زیادہ بپھرا ہوا ہے۔

چونکہ شابولا کو حاصل کرنے کا اس کا جاپ ناکام ہو گیا اس وجہ سے وہ زیادہ طیش میں ہے اور اس نے سوچ لیا ہے کہ چاہے میری جان چلی جائے میں کسی صورت بھی رولو کا اور التمش کو نہیں چھوڑوں گا۔

سب سے زیادہ کمزور پہلو مانی صاحب کا ہے ان کی طرف سے آپ زیادہ چوکنا رہیئے گا، آپ پر اور مجھ پر تو اس کا زور زیادہ چلے گا نہیں، لہٰذا وہ ان کی طرف پلٹے گا، ویسے زیادہ پریشان کن مسئلہ تو نہیں ہے کیونکہ میں نے اپنے کارندوں کو خاص طور پر مانی صاحب کی حفاظت پر مامور کر دیا ہے۔ میں نے اندازہ لگا لیا ہے کہ کچھ دن وہ دبکا پڑا رہے گا اس لئے کہ رولو کا میری تلاش ترک کر کے اپنے دیگر کاموں میں مصروف ہو جائے گا اس کے بعد موقع دیکھ کر میں زبردست حملہ یک بیک دونوں پر کر دوں گا اور پھر نیست و نابود کر کے رکھ دوں گا۔

میں اس لئے آپ کو خبر دینے کے لئے آ گیا کہ آپ اپنے تئیں چوکنا رہیئے گا، اچھا اب مجھے اجازت دیں میں چلتا ہوں...... مطب میں آج کئی لوگ آنے والے ہیں، میں نے انہیں آج بلایا ہے، وہ لوگ آ کر

میرا انتظار کریں گے اور میں حکیم وقار سے بھی ملے بغیر آپ کے پاس آ گیا، اگر میں وقت پر نہ پہنچ پایا تو حکیم صاحب زیادہ پریشان ہوں گے، آپ لوگ پریشان نہ ہوں میں اپنے حساب سے چلا جاؤں گا۔'' اور پھر رولوکا انتش اور مانی سے مصافحہ کرنے کے بعد واپس حکیم وقار کے مطب میں پہنچ گیا۔

رولوکا کے انتظار میں تین شخص موجود تھے۔ رولوکا اپنے کمرے سے نکلا اور نیچے مطب میں پہنچ گیا۔ حکیم وقار اپنے کمرے میں موجود تھے، رولوکا پر نظر پڑتے ہی مسکراتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھے اور ہاتھ ملایا، پھر بولے۔ ''حکیم صاحب صبح بخیر۔''

رولوکا نے بھی جواب دیا۔ ''صبح بخیر۔''

پھر حکیم وقار مسکراتے ہوئے بولے۔ ''حکیم صاحب خیر خیریت تو ہے ناں...... اور آپ کے زالوشا کے مسئلہ کا کیا بنا...... میں تو کئی دن سے متفکر ہوں اور ہر نماز کے بعد دعائے خیر مانگتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ زالوشا کو جلد از جلد انجام تک پہنچائے۔''

حکیم وقار کی بات سن کر رولوکا بولا۔ ''حکیم صاحب آپ کی محبت ہی تو ہے جس نے میرے ذہن سے افریقہ کی یاد بھلا کر رکھ دی جبکہ افریقہ میں میرے اپنے موجود ہیں اور افریقہ میرا وطن ہے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں انسان کے لئے محبت سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں اور یہ انسانی محبت ہی ہے کہ بعض اوقات بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خونی درندے اور موذی جانور تک پیار و محبت کے آگے انسان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اچھا آپ کام کریں میں اپنے کمرے میں چلتا ہوں کئی لوگ میرا انتظار کر رہے ہیں۔''

''جی بہت اچھا آپ تشریف لے جائیں...... ذرا مریض کم ہو جائیں تو میں آپ کے کمرے میں آتا ہوں، چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' حکیم وقار بولے اور پھر رولوکا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رولوکا اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ تین لوگ کمرے میں موجود تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے، رولوکا کو دیکھ کر تینوں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر رولوکا سے علیک سلیک کے بعد ہاتھ ملایا۔ ان تینوں میں سے دو ہندو تھے اور ایک مسلمان، پتہ یوں چلا کہ ایک نے السلام علیکم کہا تھا اور دو نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تھا۔

رولوکا ایک صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''جی آپ کا نام؟''

''سرکار میرا نام رام داس ہے...... میں تلسی نگر کا رہائشی ہوں...... سرکار میری پریشانی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے...... وجہ یہ ہے کہ میرے کئی ایکڑ کھیت ہیں...... میں نے اپنے کھیتوں کی حفاظت کے لئے کئی کھیتوں میں بجوکا لگا رکھا ہے۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''بجوکا کا کیا مطلب...... بجوکا کس کو کہتے ہیں؟''

رام داس بولا۔ ''سرکار بجوکا ہم لوگ اسے بولتے ہیں کہ کھیتوں کی حفاظت کے لئے تاکہ رات یا دن میں جانور آ کر کھیت میں فصل کو خراب نہ کریں۔ یعنی ایک ڈنڈے میں دوسرا ڈنڈا باندھ کر اور اس پر گھاس پھونس باندھ کر مشابہ انسانی شکل دے دیتے ہیں اور دور سے جانور یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی انسان کھیت کی حفاظت کے لئے کھڑا ہے اور پھر کھیت میں فصل خراب کرنے والے جانور داخل نہیں ہوتے۔

سرکار میں یا اکثر میرا بیٹا رات میں مچان پر موجود ہوتے ہیں...... ایک رات کھٹ پٹ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی، تو میں نے دیکھا کہ...... بجوکا اپنی جگہ موجود نہیں تھا...... پھر میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرف دیکھنے لگا اور یہ سمجھا کہ یہ میرا وہم نہ ہو...... میں اچنبھے میں پڑ گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

لیکن سرکار ایسا ہو گیا تھا...... پھر دو لوگوں کی باتیں سنائی دیں...... باتیں کرنے کی آوازیں میرے مچان کے نیچے سے آ رہی تھیں...... آوازوں کے ساتھ ساتھ ان کے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔

ایک بولا۔ ''اچھا اب باتیں زیادہ نہ کر...... سے

بیت رہا ہے...... دو چار ساتھیوں کو اور بلا کر کھیل شروع کرتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ ہی ایک نے تین بندوں کا نام لے کر آواز لگائی تو جواب ملا کہ اچھا ہم آتے ہیں۔'' سرکار اتنے میں تین بجوکا تین کھیتوں سے آتے ہوئے نظر آئے۔

انہیں دیکھ کر میری گھگھی بندھ گئی اور کاٹو تو بدن میں خون نہیں...... میں پسینے میں شرابور ہو گیا...... اور دم سادھے بیٹھا رہا۔ پھر ایک کی آواز سنائی دی......

''بھائیو! فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، سکھ شانتی سے رہو اور اچھلو کودو...... اگر اوپر موجود رام داس ہماری آزادی میں رکاوٹ بنے گا تو میں اس کی ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گا......'' اور پھر وہ پانچوں کھیت میں دھما چوکڑی مچانے لگے...... وہ ادھر سے ادھر دوڑتے رہے قہقہے لگاتے رہے اور اچھل کود کرتے رہے اور پھر صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑے ہو گئے۔'' یہ بول کر رام داس خاموش ہو گیا۔

پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''سرکار...... صبح کا تڑکا پھیلتے ہی میں تو مچان سے اترا...... اور اپنے کھیت میں موجود بجوکا کے قریب گیا...... مگر بجوکا بے حس و حرکت کھڑا تھا...... پھر میں نے اپنے دماغ پر زور ڈالا لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا اور اسے میں نے اپنا وہم سمجھا۔ لیکن سرکار جب میں نے کھیت کی حالت دیکھی تو پریشان ہو گیا...... وہ مکئی کا کھیت ہے۔ بے شمار پودے تہس نہس ہوئے پڑے تھے۔ پھر میں نے سوچا کہ ایسا ممکن نہیں کہ بے جان بجوکا میں جان پڑ جائے اور ایسا تو میں نے اپنی زندگی میں کبھی سنا بھی نہیں کہ رات میں بجوکا میں جان پڑ جائے۔

میں نے کئی رات ایسا ہی دیکھا...... اور پھر ایک رات تو میرے بیٹے نے بھی ایسا ہی دیکھا...... تو میری رات کی نیند حرام ہو گئی...... میں نے تو بیٹے کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پتر یہ تیرا وہم ہے۔'' تاکہ بیٹا ڈر نہ جائے...... پھر میں مندر کے پجاری جی کے پاس گیا اور جیسا انہوں نے کہا میں نے ویسا ہی کیا مگر سرکار اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا...... اب میں آپ کے پاس بڑی آس امید لے کر آیا ہوں...... آپ کچھ بتائیں کہ کیا معاملہ ہے...... میں تو بہت زیادہ ڈر گیا ہوں...... بھگوان آپ کا بھلا کرے۔''

یہ سن کر رولو کا بولا۔ ''رام داس جی آپ پریشان نہ ہوں، میں پتہ کرتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا...... ایسا ہونا تو نہیں چاہئے مگر اس سنسار میں سب کچھ ممکن ہے۔''

اور یہ بول کر رولوکا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہوئے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی اوپر کو اٹھا کر گول گول دائرے کی شکل میں گھماتا رہا۔ کوئی تین منٹ کے بعد رولوکا نے اپنی آنکھیں کھول کر رام داس کو بغور دیکھا اور پھر بولا۔ ''رام داس جی آپ کی بات صحیح ہے...... ایسا ہی ہو رہا ہے۔ جیسا آپ نے دیکھا ہے۔

ایک بھٹکی ہوئی آتما اس بجوکا میں سما گئی ہے۔ اور اس کی ساتھی دیگر آتمائیں بھی اس کا ساتھ دے رہی ہیں...... دراصل اس کا اصل مقصد آپ کے کھیت میں فصل کو خراب کرنا ہے، پھر ایک وقت پر آپ کی ہتھیا کر دینا...... اور یہ کام آپ کے ایک رشتہ دار نے کرایا ہے کسی جادوگر سے...... وہ باعث دشمنی آپ کے ساتھ ایسا کر رہا ہے...... یہ تو اچھا ہوا کہ آپ نے جلدی کر لی ورنہ آپ کا جانی نقصان ہو جاتا...... آپ اب فکر نہ کریں اس بجوکا اور آپ کے رشتہ دار کا انتظام میں کر دیتا ہوں......'' اور یہ بول کر رولوکا خاموش ہو گیا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ کمرے میں زور کی ہوا چلنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہوا ختم ہو گئی اور ایک کونے میں سے سفید دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا...... وہ سارا دھواں ایک جگہ جمع ہو کر اس نے ایک ہیولہ کی شکل اختیار کر لی۔ پھر اس ہیولہ میں سے آواز سنائی دی۔ ''حضور آپ کے بلانے پر میں حاضر ہوں۔''

(جاری ہے)

سنہری جھیل

فائزہ رحمٰن۔اٹک

کالج گروپ کے سارے اسٹوڈنٹ جھیل میں اپنی بہادری دکھلانے کے لئے چھلانگ لگاتے اور چند منٹ بعد واپس جھیل سے نکل آئے پھر ایک لڑکی نے جھیل میں چھلانگ لگائی مگر یہ کیا وہ جھیل سے باہر نہ نکل سکی۔

دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی اپنی نوعیت کی عجیب و غریب ناقابل فراموش کہانی

یونیورسٹی میں یہ پہلا سمسٹر تھا اور Physic, ڈیپارٹمنٹ کی سحر بھی اس ہلہ گلہ میں شامل تھی جو کہ آج کل یونیورسٹی میں ہو رہا تھا مختلف گروپس کی نوک جھونک چل رہی تھی اور سب کچھ بہت دلکش لگ رہا تھا۔ سحر ایک متوسط گھرانے کی تھی اور خوب دل لگا کر پڑھنے والی بھی مگر بہت جلدی متاثر ہو جانے والی اپنی اس عادت سے اکثر وہ خود بھی چڑ جاتی تھی مگر بظاہر یہ کوئی بری عادت بھی نہ تھی۔

خیر یونیورسٹی میں باقاعدہ پڑھائی، کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور سحر بھی خوب دلجوئی سے پڑھ رہی تھی اس کے علاوہ سحر اپنی نماز بھی باقاعدگی سے ادا کرتی، چاہے اس کے یونیورسٹی ٹائم میں بھی نماز کا وقت ہوتا وہ وہیں نماز ادا کر لیتی زندگی ایک ہی نظام کے تحت گزرتی چلی جا رہی تھی۔

ایک دن یونیورسٹی میں ایک نیا چہرہ نظر آیا بہت دلکش حسن اور ذہین۔ اور بعد میں پتہ چلا کہ یہ سحر کے ڈیپارٹمنٹ کی اسٹوڈنٹ ہے۔ جس کا نام عنبر ہے۔ اب کیا تھا جہاں پر ہر کوئی عنبر سے متاثر نظر آتا وہیں سحر بھی اپنا حال بتادیتی کاش میری اس سے دوستی ہو جائے سحر کے ذہن میں کئی سوالات آتے کہ عنبر کینٹین کی طرف کیوں نہیں جاتی۔ ہمیشہ وہ کالا لباس ہی کیوں پہنتی ہے مگر سوال کا جواب دینا تو دور کی بات عنبر سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہ کرتی۔ اور پھر کافی دیر تک تبصرے چلتے رہتے۔ ''مغرور ہے، اپنے حسن پر ناز ہے۔'' کوئی کہتا۔ ''نہیں یار اپنی ذہانت کا جادو جگانے کا طریقہ ہے۔'' مگر کچھ بھی تھا، سحر سمیت ہر کوئی اس سے متاثر تھا اور اس سے دوستی کرنے کا خواہش مند بھی۔

دن گزرتے گئے اور تمام اسٹوڈنٹ عنبر کے معمول سے واقف ہو گئے اور اس پر تبصرے بھی دن بدن کم ہو گئے مگر سحر کا تجسس کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا آخر وہ کون ہے کیوں اس طرح Behave کرتی ہے مگر سحر موقعہ کی تلاش میں تھی کہ اس سے کچھ پوچھ سکے پہلے سمسٹر کے پیپرز شروع ہوئے اور ختم ہو گئے مگر سحر نے ہمیشہ ہر پیپر میں نوٹ کیا کہ عنبر کہیں سے دیکھ کر پیپر حل کرتی ہے مگر کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے چپ رہی کہ تمام ٹیچرز اسے میری خام خیالی تصور کریں گے۔

گرمیوں کی دوپہر تھی اور تمام اسٹوڈنٹ گھروں کو جا چکے تھے اور شام کی کلاسز کے اسٹوڈنٹ آنا شروع ہو چکے تھے مگر سحر کو کوئی لینے نہ آیا اتنے میں گھر سے کال آئی۔ ''سحر خود ہی آجاؤ آج۔''

سحر ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ وہ کس طرح سے جائے۔ اتنے میں عنبر مین گیٹ کی طرف بڑھتی نظر آئی۔ سحر نے سوچا کیوں نہ عنبر سے لفٹ لی جائے۔ یقین تو نہ تھا کہ لفٹ ملے گی مگر ٹرائی کرنے میں بھی کوئی حرج نہ تھی۔ سحر نے عنبر کو مخاطب کرتے ہوئے لفٹ مانگی تو عنبر نے حیرانگی سے سحر کو دیکھا اور فرنٹ ڈور اوپن کرتے ہوئے سحر کو بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ سحر کو تو جیسے اسی کا انتظار تھا جھٹ سے بیٹھ گئی۔ راستے میں سحر اور عنبر دونوں چپ ہی ہیں۔ اور سحر نے محسوس کیا کہ وہ اپنے حواس کھو رہی ہے یا پھر کوئی اور بات ہے جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔ جھٹکے سے گاڑی رکی اور سحر جیسے ہوش میں آگئی بہت ہی مترنم آواز سے عنبر نے کہا۔ ''سحر آپ کا گھر۔''

سحر جواب میں ہوں ہاں بھی نہ کر سکی کیونکہ عنبر کی آواز میں کچھ ایسا تھا کہ وہ چپ سادھ کے رہ گئی۔ بس سحر نے شکریہ ادا کیا اور گھر میں داخل ہو گئی۔ اب سحر نے سوچا کیا میں نے، عنبر کو اپنے گھر کا ایڈریس بھی نہ دیا۔ اور کمرے میں پہنچ کر اسے ایک اور دھچکا لگا وہ جلدی میں عنبر کا بیگ اٹھا لائی تھی۔

خیر کھانا کھانے کے بعد سحر سو گئی اور عصر کے وقت اٹھی نماز ادا کی چائے پی اور پھر اپنے نوٹس تیار کرنے بیٹھ گئی مگر نوٹس تو سارے بیگ میں تھے جو وہ عنبر کی گاڑی میں چھوڑ آئی اور اب عنبر کا بیگ کھولنا اور اس میں سے نوٹس نکالنا اسے کچھ نامناسب سا لگا یہ بھی ممکن تھا کہ عنبر کے بیگ میں نوٹس ہوں ہی نہیں۔ ''اف خدایا کیا'' کافی دیر سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ بیگ کھولے اور نوٹس نکال لے، کیونکہ وہ صرف اور صرف نوٹس کے لئے ہی بیگ کھولنا چاہتی تھی اور اس میں کوئی حرج بھی نہ تھی۔

مگر جیسے ہی اس نے بیگ کھولا پہلی نظر ایک بوتل پر پڑی جس میں سرخ رنگ کا مشروب تھا اور عنبر کو صرف وہی مشروب پیتے دیکھا گیا تھا، نہ تو وہ کبھی کینٹین گئی اور نہ ہی اس مشروب کے علاوہ اس نے کوئی ڈرنک لیا تھا۔ مگر جس چیز کے لئے بیگ کھولا گیا تھا وہ تو کیا اس قسم کی کوئی چیز نہ تھی یعنی نوٹس۔ پیپر، پن کچھ بھی نہ تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی تو سحر نے عنبر کی آواز سنی جو بتا رہی تھی کہ وہ سحر سے بیگ لینے آئی ہے۔ میں نے بیٹھنے کو کہا تو جواب میں عنبر ایک گہری مسکراہٹ دے کر پلٹ گئی۔

اگلے دن یونیورسٹی میں کلاس نہ ہوئی سارے اسٹوڈنٹ لان میں بیٹھے خوش گپیوں میں مشغول تے کہ عنبر آتی دکھائی دی سب حیران تھے یہ پری چہرہ لان میں آ کر کس کے پاس جائے گی اور کیا کہے گی وہ سحر کے

پاس آئی اور کارڈ، دیتے ہوئے بولی۔ ”کل ہمارے گھر پارٹی ہے تم ضرور آنا میں نے ڈیپارٹمنٹ میں سے صرف تمہیں پوچھا ہے۔“ خوشی کی بات تو تھی مگر سحر سوچے بنا نہ رہ سکی آخر صرف مجھے ہی کیوں لیکن خیر دیکھی جائے گی۔ اسی بہانے اس کا گھر اور اس کے گھر کا ماحول تو دیکھنے کو ملے گا۔

اگلے دن سحر عنبر کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئی گھر کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ پارٹی تو دور کی بات جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہ ہو عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مگر اس نے ہمت کر کے ڈور بیل بجا دی تو دروازہ کھلتا چلا گیا اور سامنے ہی بہت سے لوگ نظر آئے تو سحر کی ہمت بندھ گئی۔ اندر داخل ہوئی تو ویٹر سرخ رنگ کا مشروب پیش کر رہے تھے جو کہ بالکل ویسا ہی تھا جیسے عنبر کے بیگ سے نکلا تھا۔

اس نے مشروب نہ لیا اس کی نظریں تو بس عنبر کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ اس نے دیکھا عنبر کے گرد بہت خوبصورت بچیاں گھیرا ڈالے کچھ گا رہی ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کی آواز اونچی نہ تھی اور نہ ہی سحر سمجھ سکی کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

وہ عنبر کے سامنے جا بیٹھی مگر عنبر تو جیسے اسے پہچان نہ رہی تھی۔ یا وہ جان بوجھ کر پہچاننا نہ چاہ رہی تھی سحر سمجھ نہ سکی۔

کھانے کا وقت ہو گیا اور سب لوگ کھانا کھانے لگے سحر تو بس ان کو نوٹ کر رہی تھی سب لوگ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھے۔ خاص طور پر لڑکیاں بہت ہی خوبصورت مگر وہ صرف سرخ مشروب لے رہی تھیں۔ اتنے میں عنبر کو اٹھایا گیا اور وہی سرخ رنگ کا مشروب اس کے پاؤں میں گرایا گیا اور وہ اس کے اوپر سے چلتی ہوئی آگے نکل گئی۔ سحر کو ایک دم حیرت ہوئی جب عنبر اسے بلائے بغیر اس کے پاس سے گزر گئی اور وہ صرف اتنا محسوس کر پائی جیسے کوئی ہوا کا جھونکا گزرا ہو۔

سب لوگ چلے گئے مگر کسی کو اس نے دروازے سے نکلتے نہ دیکھا اس نے سوچا شاید پچھلی سائیڈ کوئی اور بھی دروازہ ہو وہ پچھلی سائیڈ گئی اور سامنے ہی عنبر کو کھڑے پایا پہلی بار عنبر گویا ہوئی۔ ”آؤ سحر میرے کمرے میں میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ یقیناً تم بھی سننا چاہتی ہو گی۔“

عنبر نے بولنا شروع کیا۔ ”سحر میں کسی اور دنیا کی باسی ہوں اور تمہاری دنیا میں صرف پڑھنے کا شوق مجھے کھینچ لایا۔“

”کیا مطلب کوئی اور دنیا اور تم..........؟“

”ہاں سحر تم مجھے اچھی لگی اس لئے صرف تمہیں بتانا چاہ رہی ہوں تمہاری اپنی دنیا ہے۔ ہم ہوا کے پجاری لوگ ہیں۔ لڑکیاں صرف کالے رنگ کا ڈریس پہنتی ہیں۔ اگر وہ کسی اور رنگ کا لباس استعمال کریں تو انہیں موت سے کوئی نہیں بچا سکتا میری ماں تمہاری دنیا سے تعلق رکھتی تھی اسی وجہ سے مجھے اس دنیا میں آ کر رہنے اور پڑھنے سے دلچسپی ہے۔ مگر آج نہیں تو کل مجھے اپنی دنیا میں واپس جانا ہے۔ یہ تعلیم ان کی نظر میں بے کار ہے۔“

”آؤ سحر میں تمہیں اپنی دنیا کی سیر کراتی ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”آنکھیں بند کرو۔“ سحر کو محسوس ہوا وہ ہوا میں اڑ رہی ہے اور کبھی کبھی کوئی جھٹکا بھی لگتا ہے۔ مگر وہ عنبر کی آواز کے انتظار میں تھی کہ کیا وہ آنکھیں کھولنے کو کہے کچھ دیر بعد۔ ”آنکھیں کھول دو۔“ سحر کی آواز آئی اور سحر نے آنکھیں کھول دیں۔

مگر یہ کیا آنکھیں کھولنے کے باوجود سحر کو کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو زور سے ملا اور تب با مشکل عنبر کو دھندلا سا دیکھ پائی اور باقی صرف دھند ہی دھند تھی ہر طرف تا حدِ نظر اس دھند میں کچھ ہیولے آگے پیچھے ہوتے نظر آ رہے تھے اور سحر بار بار اپنی آنکھیں مل رہی تھی۔ اور چلتے ہوئے بھی ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے بس ہوا میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ اچانک کچھ عجیب سی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ اور ایک جال سحر کے اوپر آ کر گرا اور وہ جال میں پھنس گئی۔ اور اپنے ہوش کھو بیٹھی جب ہوش میں آئی تو اپنے آپ کو لوہے کے ایک شکنجے میں جکڑے پایا سامنے کچھ عجیب و غریب ڈھانچہ نما انسان کھڑے تھے اور

ایک پتھر سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔
اچانک ہوا کا ایک جھونکا سا آیا اور وہ ڈھانچے حرکت کرتے ہوئے سحر کے قریب آنے لگے اور سحر اس وقت کو کوس رہی تھی جب عنبر سے دوستی کا خیال ذہن میں آیا تھا۔ اور ساتھ ہی اللہ سے مدد مانگ رہی تھی۔
اچانک ایک گرجدار آواز سنائی دی اور وہ ڈھانچے رک گئے اور سحر نے دیکھا عنبر ایک دیوہیکل نما شخص کے پاؤں پکڑے بیٹھی تھی۔ اور پھر سحر آزاد ہوئی اور عنبر نے بتایا یہ ہمارا سردار ہے میں اس کی اجازت کے بغیر تمہیں اپنی دنیا میں لے آئی تھی۔ مگر اب ہمیں معافی مل چکی ہے۔ تم میرے ساتھ جہاں چاہو جا سکتی ہو۔ پھر اس نے سحر کو اپنے والدین سے ملوایا۔ دیکھنے میں تو وہ اس کے ہم عمر لگتے تھے، سحر یہی سوچ رہی تھی کہ عنبر نے تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا کہ یہاں انسان جوان ہی رہتا ہے ہاں مگر جب مرنے کا وقت قریب ہو تو اصلی عمر سامنے آجاتی ہے۔ اور موت بھی ایسی کہ ہم ہوا کے جھونکے میں بدل جاتے ہیں۔ جیسے ہی کسی کا وقت ختم ہوتا ہے وہ ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔
ہماری زندگیاں بے مقصد ہیں۔ ہاں مگر ایک مقصد ہے ہر کوئی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ہے سنہری پھول ہر کوئی اس پھول کو حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ اگر کسی نے وہ پھول حاصل کر لیا تو وہ امر ہو جائے گا اور اس دیس کا ہمیشہ کے لئے حکمران بھی اور نہ وہ کبھی ہوا کے جھونکے میں بدلے گا بلکہ وقت اس کے کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔
شمالی علاقہ میں سنہرے پانی کی جھیل ہے اور اس کے درمیان وہ سنہرے رنگ کا پھول ہے۔ ہمارے قبیلے کے کئی لوگ گئے ضرور مگر واپس کوئی نہ آیا۔
سحر جو کافی دیر سے بیٹھی گفتگو سن رہی تھی اچانک بولی۔ ”عنبر کیا ہم وہ پھول حاصل کر لیں گے؟“ عنبر نے جواباً ایک مسکراہٹ دی اور کہا۔ ”چھوڑو اس خام خیالی کو۔“ سحر نے اپنے ارادے پر ڈٹتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو عنبر ہم ایک خدا کے ماننے والے ہیں۔ وہ ہماری پکار سنتا ہے مجھے یقین ہے وہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔“

عنبر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”اچھا اگر تمہیں اتنا بھروسہ ہے تو قبیلے کو آگاہ کرنا ضروری ہے ورنہ وہ تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ اور تمہارے ساتھ مجھے بھی۔“
رات ہوئی اور خاص قسم کی آواز کے ساتھ ہی لوگ ایک میدان میں جمع ہونے لگے۔ وہ عجیب سے لوگ جب جمع ہوئے تو سحر کو کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا مگر عنبر نے اپنے قبیلے والوں کو ساری صورتحال بتائی اور اجازت طلب کی۔ اجازت ملنے کے بعد سحر اور عنبر ان پہاڑوں کی جانب نکل پڑیں۔
کافی دن کی مسافت کے بعد ایک دن جیسے ہی آرام کرنے کے لئے سحر بیٹھی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے قریب ہی کوئی پانی کی ندی ہے یا کچھ اور، وہ یہی سوچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اگے کو قدم بڑھا دیئے۔ مگر سامنے اب آنکھوں کو چندھیا دینے والی سنہری لہریں تھیں اور تاحد نظر وہ سنہری چادر تنی نظر آرہی تھی۔ عنبر جس نے اس جھیل کے متعلق بہت سی خوفناک باتیں سن رکھی تھیں سہمی سہمی سی لگ رہی تھی جب کہ سحر بہت پر جوش نظر آرہی تھی اس کی وجہ وہ خود بھی نہ جان پائی کہ وہ اتنی پر جوش کیوں ہے۔ وہ ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے کسی برف میں اس کے پاؤں دھنس رہے ہیں۔ مگر جھیل میں وہ داخل نہ ہوئی ہو۔ مگر عنبر کو معلوم تھا کہ وہ جھیل میں داخل ہو چکیں ہیں۔ کیونکہ اس جھیل میں جتنا آگے بڑھتے جاؤ اور پیچھے مڑ کر دیکھو تو لگتا ہے ہم کنارے پر ہیں ابھی جھیل میں داخل نہیں ہوئے اور سامنے دیکھتے ہوئے یہ جھیل کہیں دور نظر آتی ہے۔ یہ ساری باتیں عنبر سحر کو بتا رہی تھی مگر سحر تو جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ ہو اور چلتا جا رہا ہو اس کی مثال بنی ہوئی تھی۔
اس جھیل کی وہ ٹھنڈک محسوس کر سکتی تھیں۔ مگر یہ اندازہ لگانا کہ جھیل کا درمیان کہاں ہے اس کے کنارے کہاں ہیں یہ ان کے بس سے باہر تھا۔
عنبر کو ایک دو بار ٹھوکر سی لگی اور وہ گرتے گرتے بچی اس کا پہلے ہی برا حال تھا کہنے لگی۔ ”سحر واپس چلتے ہیں۔“ مگر سحر چلتی ہوئی آگے نکل گئی اور اب وہ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں چل رہی تھیں یعنی سحر آگے

ہی آگے جا رہی تھی مگر عنبر نے واپس دوڑ لگا دی اور ایک زبردست ٹھوکر کھا کر گر پڑی، سحر کو بھی ایک زوردار ٹھوکر لگی اور وہ عنبر کو پکارتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑی اور پھر اسے ہوش نہ رہا۔

سحر کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک صاف شفاف کمرے میں پایا۔ جس میں ایک طرف سے کھڑکی کے ذریعے روشنی داخل ہو رہی تھی۔ سحر اٹھی اور اس نے کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں سامنے صرف وہی سنہری لہریں تھیں اور کھڑکی سے آنے والی کوئی روشنی نہ تھی بلکہ انہیں لہروں کی چمک تھی۔ سحر وہیں پھر کھڑی تھی کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی آواز آئی اور وہ پیچھے مڑی ایک بزرگ کھڑے تھے۔ چہرہ نورانی تھا۔ سحر کا خوف کم ہوا ''آؤ بیٹی مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ میں تمہارے انتظار میں زندہ تھا۔ سحر بیٹی پریشان نہ ہو تمہیں ایک نیک مقصد کے لئے چنا گیا ہے۔ اس سنہرے پھول کی حفاظت میں کرتا آیا ہوں، یہاں کے باسی ہوا، اور وقت کے ماننے والے ہیں اور جیسے ہی کسی کا وقت پورا ہوتا ہے تو یہ ہوا کے پھول کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس نے یہ پھول حاصل کر لیا تو اس کی طاقت کئی گنا بڑھ جائے گی اور وہ ہر طرف تباہی مچادے گا۔ ہر چیز کو ختم ہونا ہے یہ قانون فطرت ہے مگر یہ اس کے خلاف سوچتے ہیں یہ کمرہ اسی جھیل کی گہرائی میں ہے۔ یہاں تک صرف کوئی نیک ہی پہنچ سکتا ہے اور وہ بھی نیک اور سچے جذبات رکھنے والا۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ اب اس پھول کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے، بیٹی تم اپنی دنیا کو تباہی سے بچا سکتی ہو۔ یہ قانون ہے اور چلتا آیا ہے اور چلتا رہے گا، مجھ سے پہلے کئی آئے اور اب تم اور تمہارے بعد کوئی اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں اس نیک کام کے لئے منتخب کیا گیا۔ اور ہاں وہ تمہاری دوست جس کا اصل نام رابیش ہے وہ صرف تمہارے ذریعے یہ پھول حاصل کرنا چاہتی تھی اور اس ندی میں وہ صرف اسی کام کی وجہ سے آئی تھی اور اب وہ اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے۔''

سحر جو یہ سب باتیں سن رہی تھی اچانک اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ ''مگر بابا جی میرے والدین؟''

سحر بیٹے ایک بات یاد رکھو اوپر والا جو کام کرنا چاہتا ہے اس کا بندوبست بھی کر دیتا ہے تم فکر نہ کرو آنکھیں بند کرو میں تمہیں تمہاری دنیا میں پہنچا دیتا ہوں، مگر تمہیں یہاں لوٹ کر آنا ہوگا۔

سحر نے آنکھیں کھولیں تو خود کو اس کمرے میں پایا جہاں سحر کو عنبر نے اپنی کہانی سنائی اور اپنی دنیا کی سیر کو لے گئی تھی۔ ابھی وہی وقت تھا جس وقت پارٹی ختم ہوئی تھی۔ سحر باہر نکلی اور ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر پہنچ گئی۔ وہ حیران تھی یہ خواب تھا یا حقیقت وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ پا رہی تھی کیا تھا وہ سب یا پھر کوئی خواب تھا۔

صبح کے وقت ہی وہ دوبارہ عنبر کے گھر کی جانب چل پڑی کئی بار دستک دی گئی بیل دی مگر نہ کوئی جواب آیا نہ دروازہ کھلا۔ سامنے سے ایک بوڑھی عورت آتی نظر آئی اور بولی۔ ''کیا بات ہے بیٹی۔''

''اماں جی میری سہیلی کا گھر ہے کافی دیر سے کھڑی ہوں کوئی جواب نہیں مل رہا۔''

''بیٹی اس گھر میں تو سالوں سے نہ کوئی آیا نہ رہا کئی سالوں سے یہ ویران پڑا ہے۔''

''سحر جی'' کے علاوہ کچھ نہ بول سکی اور یونیورسٹی چلی گئی شاید وہاں عنبر سے ملاقات ہو جائے مگر وہاں بھی عنبر نہ تھی وہ ہوتی تو یہاں ملتی۔

خیر وقت گزرتا گیا اور سحر کے ذہن میں یہ واقعہ دھندلا پڑتا گیا۔ سحر باقاعدگی سے نماز پڑھتی اور تلاوت کرتی اور اپنے اللہ سے مدد مانگتی۔ ایک دن یونیورسٹی میں خوب ہلہ گلہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ شمالی علاقہ جات میں ٹرپ جا رہا تھا۔ اور سحر بھی پر جوش ہو گئی۔ کہ چلو روٹین لائف سے ہٹ کر کچھ ایکٹیویٹی کرنے کو ملے گی۔

وہ دن آ گیا اور تمام اسٹوڈنٹ ہل چل مچاتے خوش گپیوں میں مصروف شمالی علاقہ کی طرف رواں دواں تھے وہاں تین دن رکنے کا پروگرام تھا یہی وجہ تھی کہ راستے میں بھی جہاں کوئی آبشار وغیرہ نظر آتی تو وہیں

کچھ دیر رکنے اور انجوائے کرنے کا مشغلہ شروع ہوجاتا۔
دو دن خوب انجوائے کیا گیا ہر طرح سے آخری دن تھا۔ جہاں قیام کیا گیا تھا قریب ہی جھیل تھی آج جھیل سے مچھلیاں پکڑنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اور صبح سی ہی سب لوگ اپنے اپنے گروپس میں مچھلیاں پکڑنے میں لگے ہوئے تھے۔ تمام دن گزر گیا شام کا دھندلکا پھیلنے کے ساتھ ہی سردی میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا، رات جھیل کے کنارے گزارنے اور مچھلیاں فرائی کرنے کا پروگرام بن چکا تھا۔ کنارے آگ کے الاؤ روشن ہوگئے اور جنگل میں منگل کا سا بن گیا۔ سب لوگ بہت انجوائے کررہے تھے۔ باتوں باتوں میں کچھ اسٹوڈنٹ اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کے لئے جھیل میں غوطہ لگانے کا سوچنے لگے۔ اچانک ایک آواز بلند ہوئی۔ ''جھیل میں غوطہ لگانے والے لوگ ہاتھ اوپر کریں۔'' یہ کیا سحر کا ہاتھ خود بخود اوپر اٹھ گیا، سب حیران تھے یہ پانی کے نام سے ڈرنے والی لڑکی بھی غوطہ لگائے گی۔ ''او کے دیکھتے ہیں۔''

سب اپنی اپنی باری پہ آتے گئے اور غوطہ لگانے کے بعد اپنی بہادری کو منواتے داد وصول کرتے الاؤ کے گرد آکر بیٹھتے گئے۔ نعرہ بلند ہوا۔ ''اب سحر کا نمبر ہے۔''

سحر جیسے ہوش میں آگئی۔ ''ہاں میرا نمبر۔''

''مس آپ کا نمبر دیکھتے ہیں۔''

''جی دیکھ لیجئے گا۔'' سحر نے مسکراتے ہوئے جھیل میں چھلانگ لگادی۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی مگر سحر دوبارہ باہر نہ آئی۔ سحر سحر سب نے مل کرے پکارا مگر سحر ہوتی تو جواب دیتی۔ ''سحر یار باہر آؤ مان گئے تم بہادر ہو، مذاق مت کرو باہر آؤ۔'' مگر کوئی جواب نہ آیا۔

ادھر سحر کو چھلانگ لگاتے ہی ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بے انتہا گہرائیوں میں گرتی چلی گئی۔ اور اپنے ہوش سے بے گانہ ہوگئی۔

جب آنکھیں کھولیں تو سامنے انہیں بزرگ کو مسکراتے پایا۔ سحر کو جیسے بھولا ہوا واقعہ یاد آنے لگا۔ بیٹی اٹھو اور یہ لال رنگ کا شربت پیو تو جسم میں توانائی محسوس کروگی۔'' اور کٹورا سحر کے منہ سے لگادیا۔

واقعی حیرت انگیز طور پر جیسے ہی مشروب پیا تو توانائی محسوس کرنے لگی اور چہرے کا رنگ ٹھیک ہوگیا۔

''بیٹی اب تمہیں یہی مشروب پینا ہوگا یہ ایک پھل کا رس ہے جو تمہیں یہاں ملتا رہے گا۔ اس کی کئی خاصیتوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ تمہیں جوان اور طاقت ور رکھے گا مگر ہر چیز کو اس دنیا فانی سے جانا ہے جب تک تمہاری زندگی ہے اور جب تمہارا وقت پورا ہونے لگے گا تمہاری اصل عمر سامنے آجائے گی جیسا کہ میری دیکھ رہی ہو۔ اور اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم پھول کی حفاظت کرپاتی ہو یا نہیں۔ اوپر والے کی یاد سے کبھی غافل نہ ہونا اور اپنی جان سے بڑھ کر اس پھول کی حفاظت کرنا کیونکہ اس پھول کو حاصل کرنے والے امن کا نہیں تباہی و بربادی کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی آواز بند ہوگئی۔

سحر جیسے سکتے میں آگئی اور اسے وہ الفاظ یاد آنے لگے۔ ''بیٹی جب اوپر والے کو کوئی کام کرنا منظور ہو تو وہ بندوبست بھی کردیتا ہے۔''

دنیا کی نظر میں وہ جھیل میں ڈوب کر مرچکی تھی۔ مگر حقیقت کا علم صرف اوپر والے کو تھا۔ وہ بھی راضی تھی کہ اس کو نیک کام کے لئے چنا گیا ہے مگر والدین کا خیال آتے ہی وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ روتے روتے نجانے کتنا وقت گزر گیا اور پھر اسے آہستہ آہستہ سکون ملنے لگا۔

ادھر کئی دن جھیل میں تلاش کے بعد سحر کا غائبانہ نمازِ جنازہ ادا ہوچکا تھا۔ اس کے والد نے تو جیسے اپنی دنیا سے کنارہ کشی کرکے جھیل کے کنارے کو ہی اپنا مسکن بنالیا تھا۔

اب بھی چاند کی چاندنی رات میں سحر اپنے والد سے ملنے آتی ہے وہ جھیل سے نکلتی ہے اور دوبارہ جھیل ہی میں چلی جاتی ہے۔ اس کے والد سمجھتے ہیں یہ سحر کی روح ہے جو ان سے ملنے آتی ہے۔ مگر حقیقت سے تو سحر یا پھر اوپر والا ہی واقف ہے۔ نجانے ایسا کب تک چلے یہ قدرت کا قانون ہے اور چلتا رہے گا جب تک وہ چاہے گا اس کو بدلنا کسی کے بس میں نہیں۔

سرد جہنم

ایس امتیاز احمد - کراچی

اپنے وقت کا عظیم المرتبت ڈاکٹر جس کا سکہ ہر ذہن پر بیٹھ چکا تھا مگر وہ خود اپنے ہی تجربہ کی بھینٹ چڑھ گیا اور پھر اس کے آخری الفاظ دوسروں کے لئے مشعل رہ بن گئے۔

قارئین! اگر آپ اس کہانی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو اسے رات کی تنہائی میں پڑھیں

آپ پوچھ رہے ہیں کہ میں سرد ہوا سے کیوں ڈرتا ہوں۔ ٹھنڈے کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر دہشت کا عالم کیوں طاری ہوجاتا ہے اور بہار کے دلفریب موسم میں جب کوئی خوش گوار دن، خنک شام میں ڈھلنے لگتا ہے، تو لرز کیوں اٹھتا ہوں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں طبعاً سردی سے متنفر ہوں، چنانچہ مجھے کئی بار مشورہ دیا گیا کہ مستقلاً کسی گرم استوائی ملک میں رہائش اختیار کرلوں۔ بعض احباب سمجھتے ہیں کہ میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے لئے سردی سے خوف زدہ ہونے کا مظاہرہ کرتا ہوں اور اس مظاہرے سے میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سے زیادہ لوگ متوجہ ہوں اور مجھے حیرت کی نظر سے دیکھیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاتا ہے کہ میں نمائش پسند ہوں۔ خدا گواہ ہے یہ دونوں نظریئے غلط

ہیں۔ جو اصحاب بچپن سے جانتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے نمائش اور ظاہر پسندی سے ہمیشہ نفرت رہی ہے۔ میں الگ تھلگ اور سادہ زندگی بسر کرنے کا عادی ہوں۔ رہا دوسرا نظریہ، تو اس امر کی تصدیق کرنے والے بھی مل جائیں گے کہ کچھ عرصہ پہلے مجھے سردی سے قطعی خوف محسوس نہ ہوتا تھا۔ کڑکڑاتے جاڑوں میں معمولی کپڑے پہن کر رات گئے برف باری میں تنہا گھومنا میرا محبوب ترین مشغلہ تھا، مگر ایک خاص واقعہ نے مجھ سے یہ مشاغل چھین لئے۔ میں یہ واقعہ من وعن آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔ اس طرح آپ خود اندازہ کرسکیں گے کہ میں سردی اور سرد ہوا سے خوف کھانے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔

جہاں تک میرے تجربات کا تعلق ہے، یہ درست نہیں کہ انسان صرف اندھیرے، سکوت اور تنہائی میں خوف زدہ ہوتا ہے، کیونکہ مجھے پہلی بار پیرس کی گنجان ترین آبادی میں واقع ایک بورڈنگ ہاؤس میں حقیقی خوف سے سابقہ پڑا، جبکہ ایک خاتون اور دو صحت مند اور توانا جوان میرے ساتھ تھے۔ نیچے سڑک پر سینکڑوں لوگ آجا رہے تھے، بسیں اور گاڑیاں چل رہی تھیں، دکانیں کھلی تھیں اور ان پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ اس کے باوجود خوف کا سامنا ہوا، تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، مگر ٹھہریئے، اس طرح شاید ساری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آسکے میں شروع سے یہ سناتا ہوں۔

1993 کا ذکر ہے۔ میں ایک ماہانہ رسالے میں قلیل تنخواہ پر ملازم تھا۔ مالی حالت پتلی ہونے کی وجہ سے اکثر مقروض رہتا۔ زیادہ کرایہ ادا کرنے کی سکت نہ تھی، پھر بھی چاہتا تھا کوئی ایسی جگہ مل جائے جو زیادہ گندگی اور تکلیف دہ نہ ہو۔

تلاش بسیار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اتنے کم پیسوں میں معقول جگہ کا ملنا ممکن نہیں، چنانچہ ایک ایسے بورڈنگ ہاؤس میں کمرہ کرائے پر لے لیا جو دوسری جگہوں سے نسبتاً اچھا تھا۔ یہاں اس بات کی سہولت بھی تھی کہ رسالے کا دفتر نزدیک تھا اور عمارت کے نچلے حصے میں روٹی، گوشت اور دودھ کی دکانیں تھیں اور آمدورفت پر زیادہ خرچ اٹھنے کا امکان نہ تھا۔ جس عمارت کا ابھی میں نے ذکر کیا ہے، چار منزلہ اور بھورے پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ اندرونی دیواریں زیادہ تر چوبی تھیں اور انہیں جگہ جگہ سے دیمک تباہ کرچکی تھی۔ زینے اور برآمدوں میں کئی ایک مقامات پر سنگ مرمر کی ٹائلیں نظر آتی تھیں، لیکن اکثر جگہ سے یہ پتھر گھس کر بے رنگ ہوچکے تھے اور کئی ایک جگہوں پر تو انہیں نکال کر گارے اور چونے سے عام اینٹیں لگا دی گئی تھیں۔ کمروں میں بڑے بڑے سنگی آتش دان اور کارنس کسی زمانے میں ضرور خوبصورت ہوں گے، لیکن اب مکینوں کی عسرت وافلاس کے سبب بے ہنگم اور مصروف دکھائی دیتے تھے۔ ان آتش دانوں میں شاید کبھی آگ جلی ہو۔ دراصل پیرس جیسے مہنگے شہر میں غریب آدمی کے لئے ایندھن اور کوئلے کا خرچ برداشت کرنا بہت مشکل ہے۔

مالکہ مکان کا نام مس ہریرو تھا۔ ادھیڑ عمر کی اس ہسپانوی عورت کی ٹھوڑی پر چند بال تھے جن کی وجہ سے وہ خاصی مضحکہ خیز دکھائی دیتی تھی۔ تاہم طبیعت کی بہت نرم اور اچھی تھی۔ میں نے جلد ہی محسوس کرلیا کہ اکثر مالکان کی طرح اسے کرایہ داروں کی شکایتیں کرنے کی عادت نہیں اور نہ وہ رات گئے تک بلب جلانے یا دیر سے گھر لوٹنے پر ناک بھنوں چڑھاتی ہے۔ میرے علاوہ دوسرے کرایہ داروں کی اکثریت نچلے طبقے کے ہسپانوی مزدوروں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ شاذونادر ہی ایک دوسرے سے بات کرتے، اس لئے ماحول خاصا پرسکون تھا۔ نیچے سڑک پر سے گاڑیاں گزرنے کی آوازیں البتہ لکھنے میں مخل ہوتی تھیں، لیکن جلد ہی میں ان کا عادی ہوگیا۔

اس عمارت میں منتقل ہونے کے تین ہفتے بعد ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ایک شام مجھے اچانک

احساس ہوا کہ کمرے کی چھت نم ہے اور کئی جگہوں سے ٹپک رہی ہے۔ باہر جھانکا، مطلع صاف تھا اور بارش کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔ میں فوراً نیچے گیا اور مالکہ مکان مس ہریرو کو اطلاع دی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

''اب ڈاکٹر موناز کو کون سمجھائے، اس نے اپنی لیبارٹری میں کوئی دوا گرادی ہوگی۔ بے چارہ بہت بیمار ہے، روز بروز اس کی حالت بگڑتی جارہی ہے، مگر کیا کروں، وہ کسی سے اپنا علاج کرانے پر رضا مند نہیں ہوتا۔ طویل بیماری نے اسے چڑچڑا کردیا ہے، ورنہ پہلے بہت خوش مزاج انسان تھا۔

''آخر ڈاکٹر موناز چھت پر کیا کررہا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتی، شاید نہا رہا ہوگا۔ دن میں بیسیوں مرتبہ پانی میں عجیب عجیب خوشبو ڈال کر نہاتا ہے...... بڑی انوکھی عادتیں ہیں اس کی۔''

''کیا وہ لوگوں کا علاج معالجہ کرتا ہے؟''

''نہیں، عرصہ ہوا اس نے یہ دھندا چھوڑ دیا۔ کہتے ہیں، بہت بڑا ڈاکٹر تھا۔ میرے والد کہا کرتے تھے بارسلونا میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ حال ہی میں ہمارا ایک مستری چھت کی مرمت کرتے ہوئے چوتھی منزل سے گر پڑا تھا، ڈاکٹر موناز نے اس کا بازو جوڑ دیا، حالانکہ اسپتال والوں نے یہ بازو کاٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ڈاکٹر موناز اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلتا۔ میرا بھائی اسٹیانو اسے کھانے پینے کی چیزیں، لانڈری سے دھلے ہوئے کپڑے اور دوائیں لاکر دیتا ہے۔ وہ منوں کے حساب سے امونیا منگواتا ہے، معلوم نہیں کہاں استعمال کرتا ہے۔''

میں ڈاکٹر موناز کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن مس ہریرو سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ میں کمرے میں لوٹ آیا۔ تھوڑی دیر بعد چھت سے پانی ٹپکنا بند ہوگیا۔ کان لگا کر سنا، تو کسی مشین کی گھر گھر سنائی دی۔ اس سے پہلے بھی میں یہ آواز بیسیوں دفعہ سن چکا تھا، لیکن کبھی توجہ نہ دی۔ میں ڈاکٹر موناز کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر وہ اتنا بڑا ڈاکٹر ہے، تو اس واہیات بورڈنگ ہاؤس میں کیوں رہتا ہے۔ نہ جانے اسے کیا مرض ہے، لیکن وہ اسپتال میں کیوں نہ گیا؟ دن بھر کمرے میں بند رہنے سے اس کا مطلب کیا ہے؟ کوشش کے باوجود مجھے ان سوالوں کے جواب نہ مل سکے اور بالآخر میں نے سوچنا ترک کردیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے دل کا دورہ نہ پڑتا، تو ڈاکٹر موناز سے ملاقات ممکن نہ تھی۔ ایک سہ پہر اچانک مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر مجھے بتا چکے تھے کہ دل کا دورہ پڑتے ہی فوراً طبی امداد حاصل کرنی چاہئے، ورنہ یہ دورہ جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ دونوں ڈاکٹر جن سے میں وقتاً فوقتاً طبی مشورے لیا کرتا تھا، بورڈنگ ہاؤس سے بہت دور تھے، لہٰذا میں نے ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چوتھی منزل پر یعنی میرے کمرے کے عین اوپر ڈاکٹر موناز کا فلیٹ تھا۔ میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے کسی نے بہت ہی صاف انگریزی میں نام اور ملاقات کا مقصد پوچھا اور میرے جواب دینے پر دروازہ کھول دیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جون کا مہینہ تھا اور باہر اچھی خاصی گرمی تھی، لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھنڈی ہوا کے ایک جھونکے نے میرا خیر مقدم کیا۔ میں کانپنے لگا۔ یوں محسوس ہوا برف خانے میں آ گیا ہوں۔ ڈاکٹر موناز کی نشست گاہ سامان آرائش سے پر تھی۔ خوب صورت صوفے، سیاہ مہاگنی کا بنا ہوا اعلیٰ فرنیچر، کتابوں کی منقش الماریاں حسین ودلفریب رنگوں کے پردے۔ اس غلیظ اور پرانی عمارت میں ایسا سجا سجایا کمرہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔

دائیں طرف چھوٹی سی لیبارٹری تھی۔ جس میں کسی مشین کے چلنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ ادھ کھلے دروازے میں سے دواؤں کی بھری

ہوئی شیشیاں، فلاسک، سپرٹ، لیمپ اور شیشے کی نلکیاں دکھائی دیں۔ غالباً یہی کمرہ میرے کمرے کے عین اوپر واقع تھا۔ دروازے کے بائیں جانب اس کی خواب گاہ تھی جس میں پرتکلف بستر، جھاڑ، فانوس اور آرائش کی دوسری چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ خواب گاہ کے دروازے کے ساتھ ہی ایک اور دروازہ تھا جو غالباً غسل خانے کا تھا۔ رہائش سے محسوس ہوتا تھا کہ ڈاکٹر مونا زاعلیٰ تعلیم یافتہ اور باذوق انسان ہے۔

اس کا قد چھوٹا اور سر باقی جسم کی مناسبت سے بڑا تھا۔ لباس انگریزی وضع کا اور نہایت عمدہ سلا ہوا، چہرے پر تفکر کا خاص انداز، گھنی پلکوں کے نیچے تیز اور ہوشیار آنکھیں، فرانسیسی وضع کی داڑھی، آنکھوں پر بغیر فریم کی عینک قدیم ہسپانیوں کی طرح اونچی ناک اور خوب صورت دہانہ جو اس کی مضبوط اور ناقابل تسخیر قوت ارادی کا پتہ دیتے تھے۔ رنگ برف کی طرح سفید۔ مجموعی طور پر کسی اعلیٰ خاندان کا فرد نظر آتا تھا۔

ان خوبیوں کے باوجود پہلی بار اس کے سرد اور ٹھنڈے کمرے میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک ناقابل توجہ کراہت کا احساس ہوا اور میں خاصی دیر تک اپنے اس ردعمل کی وجہ تلاش نہ کرسکا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کراہیت پھولے ہوئے چہرے اور بے حد سرد انگلیوں کے لمس نے پیدا کی ہو یا اس کا سبب کمرے کا انتہائی سرد ماحول ہو۔

بہرحال اس سے ہاتھ ملا کر مجھے متلی سی ہونے لگی تھی۔

اس کی آواز نامانوس تھی اور وہ ٹھہر ٹھہر کر اور پراسرار لہجے میں گفتگو کرتا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے اپنا مرض بتا چکا تھا، اس لئے غالباً وہ مرض کی طرف سے میری توجہ ہٹانے کے لئے اپنی سائنسی تحقیقات بیان کرنے لگا۔ میری طبیعت سنبھل گئی تھی، اس لئے یہ باتیں دلچسپی معلوم ہوئیں۔ میں صوفے پر دراز ہوگیا، وہ کہہ رہا تھا۔

''ادراک ذات اور قوت ارادی دواؤں سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں۔ اگر مادی جسم صحیح سالم ہو تو قوت ارادی کے بل پر اپنے آپ کو زندہ رکھا جاسکتا ہے، خواہ اعضائے رئیسہ میں سے ایک آدھ ختم ہوچکا ہو۔'' قدرے توقف سے وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''کسی دن میں تمہیں دل کے بغیر زندہ رہنے کا طریقہ بھی بتاؤں گا۔'' وہ بولا۔

میں خاصی دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ معلوم ہوا وہ بعض جلدی بیماریوں میں مبتلا ہے اور یہ بیماریاں ایسی ہیں کہ ان کے لئے دوا سے زیادہ احتیاطی تدابیر اور شدید سردی کی ضرورت ہے۔ 55 درجے فارن ہائٹ سے زیادہ درجہ حرارت اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا، چنانچہ اس نے پٹرول کے انجن اور مونیا سے مطلوبہ سردی پیدا کرنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اسی انجن کی گھر گھر مجھے اپنے کمرے میں سنائی دیتی تھی۔

ڈاکٹر موناز کے علاج سے جلد ہی مجھے آرام آ گیا۔ وہاں سے لوٹا تو ہمیشہ کے لئے اس کا مداح بن چکا تھا۔ اس دن کے بعد ہفتے میں دو تین بار میں اسے ملنے جاتا۔ وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا۔ اس کے کمرے میں سردی ناقابل برداشت تھی، اس لئے وہاں جانے سے پہلے میں ایک لمبا اونی کوٹ پہن لیتا۔ وہ مجھے اپنی زندگی کے تجربات سناتا جو بالعموم الف داستانوں کی طرح محیر العقول ہوتے تھے۔ وہ قدیم اطباء کی بہت عزت کرتا تھا کیونکہ بقول اس کے یہ لوگ ایسے ایسے نسخے جانتے تھے جو موت کے بعد انسانی اعصاب کو انگیخت کرسکتے تھے۔

کئی بار اس نے مجھے بوڑھے ڈاکٹر تارس کی کہانی سنائی جو اٹھارہ سال قبل کئی طبی تجربوں میں اس کا شریک رہا تھا۔ اپنے عجیب وغریب تجربات میں اسے ایک موذی مرض نے آن لیا۔ ڈاکٹر موناز نے بڑی تندہی سے اس کا علاج کیا اور اسے افاقہ ہوگیا، مگر خود ڈاکٹر موناز اس مرض میں مبتلا ہوگیا۔ یہ وہی مرض تھا جس کے لئے موناز اپنے کمرے کو یخ بستہ رکھتا تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ ڈاکٹر موناز، مرض سے شکست کھا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھانے لگی۔ اعضاء کی حرکات میں التوا اور بے ڈھنگا پن آگیا اور چال میں لڑکھڑاہٹ۔ قوت ارادی کمزور پڑ گئی اور یاداشت دھندلانے لگی۔ نہ جانے کیوں میرا پہلے دن کا احساس کراہت لوٹ آیا۔ اب پھر اسے دیکھ کر متلی سی ہونے لگتی۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، تیز خوشبوؤں سے اس کا عشق بڑھتا جا رہا تھا۔ اب وہ ہر وقت کمرے میں صندل، لوبان اور اگربتیاں جلائے رکھتا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو اس کی نشست گاہ پر اہرام مصر کے تلچھٹ اور بودار تہہ خانوں کا گمان ہوتا۔

اس کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ وہ ہمیشہ کمرے کا درجہ حرارت گرانے کی فکر میں رہتا۔ میری مدد سے اس نے امونیا کے نئے پائپ فٹ کئے اور انجن کی اوور ہالنگ کی۔ اب کمرے کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے ہی رہتا۔ صرف باورچی خانے قدرے گرم ہوتا، چنانچہ میں ملاقات کی غرض سے جاتا، تو ہمیشہ باورچی خانے میں بیٹھتا تھا۔ باورچی خانہ گرم رکھنے کی وجہ محض یہ تھی کہ ٹب اور برتنوں میں پانی جم نہ جائے، وگرنہ ڈاکٹر موناز کو حرارت ہرگز پسند نہ تھی۔ اور وہ ایک منٹ سے زیادہ باورچی خانے میں نہ ٹھہر سکتا تھا۔ چوتھی منزل پر اس کے علاوہ ایک ڈچ جوڑا بھی مقیم تھا۔ ان میاں بیوی نے مالکہ مکان سے شکایت کی کہ ڈاکٹر موناز نے اپنا فلیٹ اتنا سرد کر رکھا ہے کہ وہ دونوں رات بھر سو نہیں سکتے اور سردی سے ان کے دانت بجتے ہیں۔ مالکہ مکان نے ڈاکٹر موناز سے ذکر کیا۔ وہ بڑے خوف ناک انداز میں ہنسا اور بات کا رخ پھیر دیا۔

ان دنوں میں اکثر اسے ملنے جاتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی معیت تھکا دینے والی اور صبر آزما ہوتی تھی۔ کئی بار جی، میں آیا کہ اس کی دوستی ترک

"دل ٹوٹنے سے اٹیک اٹیک"

طبی ماہرین نے کہا ہے کہ "دل توڑنا" محاورہ ہی نہیں ہے بے وفا لوگوں کی خود غرضی، بے وفائی اور مطلب پرستی سے لوگ عارضہ قلب میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اس لئے دوسروں کے دلوں میں اترنے کی کوشش کریں، اگر آپ کسی کے دل سے اتر گئے تو وہ دل ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ آسٹریلیا میں ہونے والی اس طبی تحقیق کو ہارٹ فاؤنڈیشن نے مکمل کیا، تحقیق کے مطابق پروفیسر تھامس بوکیلے نے کہا کہ جسمانی سطح پر تبدیلیوں کی وجہ سے ہی عارضہ قلب نہیں ہوتا، کسی ان دیکھی کیفیت، حالات یا صورتحال میں تبدیلی بھی دل کو خطرے سے دوچار کر دیتی ہے، تحقیق میں 160 افراد کا مطالعہ کیا گیا جن میں بیوی، بچے، رشتہ دار اور بزنس پارٹنر یا پھر محبوب اور محبوبہ نے بے وفائی کی تھی اور خود غرضی کا مظاہرہ کر کے انہیں عارضہ قلب میں مبتلا کر دیا۔ تحقیق کے مطابق ناروا، رویوں کی وجہ سے عارضہ قلب کے امکانات 6 گنا بڑھ جاتے ہیں۔

(راجہ باسط مظہر۔ راولپنڈی)

کردوں، مگر وہ بڑی کامیابی سے میرا علاج کر رہا تھا اور اس کی دواؤں سے مجھے فائدہ پہنچا تھا۔ علاوہ ازیں وہ مجھ سے دواؤں کی قیمت لیتا نہ معائنہ کی فیس۔ یوں بھی میں اس کا واحد ملاقاتی تھا اور مجھے اس پر رحم آنے لگا تھا۔ کسی روز نہ جاتا، تو اسے بڑی تکلیف ہوتی۔ کمرے کی صفائی اور انجن کی دیکھ بھال ایسے کام تھے کہ وہ تنہا انہیں انجام نہ دے سکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اسے بازار سے چیزیں لا کر دیتا تھا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی اپنے فلیٹ سے باہر نہ آتا تھا۔

رفتہ رفتہ مجھے اس کی بہت سی حیران کن عادتوں کا علم ہوگیا۔ مثال کے طور پر وہ نہاتے وقت پانی میں اتنی خوشبوئیں ملاتا کہ میری ناک پھٹنے لگتی۔ اس کے باوجود ایک بار میں نے اسے جانگیہ پہنے دیکھا، تو میرا سر چکرانے لگا۔ کتنا گھناؤنا مرض تھا اس کا۔ جلد کا گوشت گل سڑ کر ناقابل بیان تعفن چھوڑ رہا تھا۔ جسم کے قدرتی خطوط اور گولائیاں غائب ہو چکی تھیں۔ اور پہلی نظر میں گوشت یوں نظر آتا تھا جیسے قصائی کی دکان پر لٹکے ہوئے بکرے ہو۔

بورڈنگ ہاؤس کے مکینوں میں میرے علاوہ صرف مس ہریرو اور اس کا بھائی اسٹیانو، کبھی کبھار ڈاکٹر موناز سے ملنے جاتے تھے، لیکن بڑھتا ہوا مرض دیکھ کر انہوں نے بھی اوپر جانا بند کر دیا۔

مس ہریرو تو اس کا ذکر سنتے ہی سینے پر صلیب کا نشان بناتی اور کسی انجانے خوف سے کانپ اٹھتی۔ دو ایک بار ڈاکٹر موناز نے میرے ذریعے اسٹیانو کو بلایا، مگر مس ہریرو نے سختی سے منع کر دیا۔ اس طرح بے چارہ ڈاکٹر میرے رحم و کرم پر زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔ کئی بار میں نے دبے لفظوں میں اسے مشورہ دیا کہ کسی ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرو، مگر وہ غصے سے آگ بگولا ہو جاتا اور ایک بار تو اس نے مجھے ڈانٹ بھی پلائی۔ میں اسے مریض سمجھتا تھا، اس لئے چڑچڑا پن اور غصیلی عادات برداشت کرتا رہا۔

ایک اور تبدیلی جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا، یہ تھی کہ اب وہ بستر پر لیٹنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ لکھنے میں مصروف رہتا۔ ہر دوسرے تیسرے دن اپنے لکھے ہوئے کاغذ ایک لفافے میں بند کر کے ڈیسک میں رکھتا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہتا۔

''میرے مرنے کے بعد یہ لفافہ ڈاک میں ڈال دینا۔''

میں ان لفافوں پر ایڈریس پڑھنے کی کوشش کی۔ یہ سب یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کے نام لکھے گئے تھے۔ نہ جانے موناز نے ان خطوط میں کیا لکھا تھا۔ روز بروز اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ وہ کسی ذہنی کوشش میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اس کی شخصیت موت سے نبرد آزما تھی۔ دوائیں چھوڑ کر وہ صرف قوت ارادی کے بل پر صحت یاب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک روز میں اس کے کمرے میں پہنچا تو اس نے ایک طویل مسودہ دکھاتے ہوئے ایک ڈاکٹر کا نام لیا اور کہا۔ ''میرے مرنے کے بعد یہ مسودہ اسے رجسٹری کر دینا۔'' یہ نام سن کر میں خوف زدہ رہ گیا۔ اتفاق سے میں اس ڈاکٹر کا نام پہلے بھی سن چکا تھا اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ کئی برس پہلے وہ انتقال کر چکا ہے۔ کچھ پوچھنے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر موناز کے غصے سے خوف آتا تھا۔ انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ بورڈنگ ہاؤس کے رہنے والے والوں میں ڈاکٹر موناز کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں۔ ہوا یوں کہ ایک شام ڈاکٹر موناز نے میری معرفت بجلی ٹھیک کرنے والے کو بلوایا۔ اس شخص نے عمارت کے نچلے حصے میں دکان کھول رکھی تھی۔ وہ پہلی جنگ عظیم میں حصہ لے چکا تھا اور طبعاً باہمت اور جری تھا۔ میرے سامنے وہ اوزاروں کا تھیلا لے کر ڈاکٹر موناز کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ دو تین منٹ بعد اس کی چیخ سنائی دی۔ میں بھاگم بھاگ اوپر پہنچا۔ وہ فلیٹ کے دروازے میں بے ہوش پڑا تھا۔ اوزاروں کا تھیلا وہاں نہ تھا، شاید وہ بھاگتے وقت فلیٹ کے اندر

چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اسے جھنجوڑا اور جب وہ ہوش میں آیا، تو ایک لفظ کہے بغیر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے چلا گیا۔ میں ڈر گیا، تاہم ہمت کرکے اندر گیا۔ ڈاکٹر موناز غسل خانے میں تھا، وہیں سے غصیلی آواز میں بولا۔

''یہ تم کس گدھے کو پکڑ کر لائے تھے، کم بخت مجھ سے پوچھے بغیر غسل خانے میں آ گیا۔''

میں نے خاموشی سے اوزاروں کا تھیلا اٹھایا اور نچلی منزل میں مستری کے پاس جا کر پوچھنے کی کوشش کی، وہ مجھے کچھ نہ بتا سکا، کانپتا اور بائبل کی آیات پڑھتا رہا۔

اس دن کے بعد بورڈنگ ہاؤس کے رہنے والے ڈاکٹر موناز سے خوف کھانے لگے۔ اس کے پاس جانا تو دور، کوئی اس کا ذکر بھی پسند نہ کرتا۔ تقریباً بیس دن گزر گئے اور ایک رات وہی ہوا جس کا مجھے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ڈاکٹر موناز نے اپنے کمرے کا فرش یعنی میرے کمرے کی چھت بجا کر مجھے بلایا۔ اوپر گیا تو معلوم ہوا کہ امونیا پمپ کا انجن خراب ہو گیا ہے اور ائیر کنڈیشنگ کا نظام معطل ہونے کی وجہ سے کمرے کا درجہ حرارت بڑھتا جا رہا ہے۔ میں نے ڈاکٹر موناز سے مل کر انجن ٹھیک کرنے کی کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ڈاکٹر موناز کی حالت قابل دید تھی، وہ پمپ اور انجن بنانے والوں کو برا بھلا کہتا، اپنے بال نوچتا اور مایوسی سے سر کو دائیں بائیں پٹکتا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور آدھی رات کے وقت مستری کو بلانے گیا۔ بڑی مشکل سے ایک مستری کو جگایا اور اسے ساتھ لے کر بورڈنگ ہاؤس پہنچا۔ مستری نے انجن کی دیکھ بھال کی اور مایوسی سے بولا۔

''پسٹن اور کئی اہم پرزے ناکارہ ہو چکے ہیں۔'' صبح تک کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر موناز بولا۔

''جس طرح ہو سکے انجن کو درست کردو، منہ مانگی اجرت دوں گا۔''

''میں کہہ چکا ہوں اس وقت پرزے کہیں سے نہیں مل سکتے صبح پتہ کریں گے۔''

''اف! اف!! اف!!!'' ڈاکٹر موناز چلایا۔ نادانو! یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے، تمہیں کیسے سمجھاؤں انجن کا ٹھیک ہونا کس قدر ضروری ہے۔''

مستری شاید اس کی حالت دیکھ کر خوف زدہ ہو چکا تھا، اوزاروں کا تھیلا اٹھا کر چلتا بنا۔

ڈاکٹر موناز کسی جان لیوا حملے کی وجہ سے دہرا ہو رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے اور چیختا ہوا غسل خانے کی طرف بھاگا۔ میں کمرے کے وسط میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ چند منٹ بعد وہ باہر آیا۔ اس کا سارا جسم بھاری کپڑوں سے ڈھکا ہوا تھا اور گردن اور سر پر اس طرح پٹیاں بندھی تھیں کہ آنکھوں کے سوا باقی چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''بھاگو اور بازار سے جس قدر برف مل سکے، لے آؤ۔''

''لیکن اس وقت برف کی دکانیں بند ہوں گی۔''

''افوہ۔'' بھئی جاؤ تو سہی۔ بعض ہوٹل اور ادویہ کی دکانیں رات بھر کھلی رہتی ہیں۔ ان سے پتہ کرنا جلدی کرو، میرا دم گھٹ رہا ہے۔

میں تیزی سے سیڑھیاں اتر کر سڑک پر گیا اور ڈیڑھ گھنٹے میں جتنی برف مل سکی لا کر ڈاکٹر موناز کے بند غسل خانے کے دروازے پر ڈھیر کر دی۔ ڈاکٹر موناز غالباً ٹب میں لیٹا ہوا تھا۔ ہر بار جب میں برف کی سل رکھ کر لوٹتا، اس کی غیر قدرتی، غیر انسانی آواز سنائی دیتی۔

''اور برف لاؤ...... برف...... جس قدر مل سکے، خرید لو۔''

رات بھر میں بھاگ دوڑ کرتا رہا اور خدا جھوٹ نہ بلوائے، تو منوں برف جمع ہو گئی، لیکن ڈاکٹر موناز مجھے اور برف لانے کی تاکید کرتا رہا۔ صبح ہوئی تو میں نے

اسٹیانو سے مدد کی درخواست کی۔ میں چاہتا تھا وہ برف لاکر دیتا رہے اور میں نیا پسٹن ڈھونڈنے کی کوشش کروں مگر اس نے صاف انکار کردیا۔ میں نے لالچ بھی دیا، مگر وہ کسی طرح ڈاکٹر موناز کے کمرے میں داخل ہونے پر تیار نہ ہوا۔

بالآخر میں نے کسی ایسے شخص کی مدد لینے کا منصوبہ بنایا جو معاوضے پر کام کرسکے۔ بازار میں ایک آوارہ سا آدمی اس کام پر رضا مند ہوگیا۔ میں اسے برف کے لئے پیسے دے کر کسی اچھے مستری اور نئے پسٹن کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس بھاگ دوڑ میں کئی گھنٹے صرف ہوگئے لیکن ہر طرف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے کھانے کا ہوش تھا نہ آرام کی پروا ٹراموں، ٹیکسیوں، بسوں اور گھوڑا گاڑیوں پر سارے شہر میں پھرتا رہا۔ کئی جگہ ٹیلی فون کئے، بہت سے مستریوں کے گھر پہنچا اور بالآخر دن کے دو بجے، انجن کا پسٹن اور دوسرے مطلوبہ پرزے ملے اور نصف گھنٹے کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک مستری کو اپنے ساتھ چلنے پر رضا مند کرسکا۔

سہ پہر کے تین بجے بورڈنگ ہاؤس پہنچا تو قسمت اپنا وار کرچکی تھی۔ اکثر کرایہ دار سہمے ہوئے باہر سڑک پر کھڑے تھے۔

ایک ہسپانوی مزدور سیڑھیوں میں بیٹھا رقت انگیز لہجے میں مناجات پڑھ رہا تھا۔ میں کسی سے بات کئے بغیر تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا ڈاکٹر موناز کے فلیٹ کے سامنے پہنچا۔ یہاں بھی تین چار افراد ناک پر رومال رکھے سرگوشیاں کررہے تھے۔ وہیں دروازے پر ایک طرف اسٹیانو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ وہ آوارہ شخص جسے میں نے پیسے دے کر اس کام پر رضا مند کیا تھا کہ برف لاکر ڈاکٹر موناز کے کمرے میں ڈھیر کرتا رہا، پہلے ہی پھیرے کے بعد چیختا ہوا کمرے سے بھاگا۔ میرا خیال ہے اس نے جھانک کر غسل خانے میں لیٹے ہوئے مریض کو دیکھنے کی کوشش کی ہوگی اور ڈاکٹر موناز کی ایک جھلک نے اسے خوف زدہ کردیا۔ میرے جانے سے کوئی نصف گھنٹہ پہلے بورڈنگ ہاؤس کے رہنے والوں کو شدید بو کا احساس ہوا، معلوم ہوتا تھا ڈاکٹر موناز کے کمرے سے آرہی ہے۔ سب لوگ وہاں پہنچے، مگر دروازہ اندر سے مقفل تھا۔ وہ لوگ اس وقت سے باہر کھڑے حیران ہورہے تھے، بو واقعی ناقابل برداشت تھی۔ میں نے کان لگا کر سنا، کمرے میں کسی سیال شے کے قطرے ٹپکنے کی آواز کے سوا مکمل خاموشی تھی۔

کچھ سوچ کر میں نے عمارت کے سارے دروازے اور کھڑکیاں کھلوادیں، پھر دروازے توڑنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن مس ہریرو کو یاد آگیا کہ مالکہ مکان کی حیثیت سے اس دروازے کی ایک چابی اس کے پاس بھی ہے۔ وہ نیچے گئی اور چابی لے آئی۔ جونہی میں نے دروازہ کھولا، بدبو کے ایک بھبکے نے میرا استقبال کیا۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا اور چند لمحے بعد ایک بڑا سا رومال ناک پر رکھ کر اندر داخل ہوگیا مس ہریرو، اسٹیانو اور چند اور لوگ دروازے پر آکھڑے ہوئے۔

خدا میرے حال پر رحم کرے، زندگی بھر اس منظر کو نہ بھلا سکوں گا۔ کمرے کے وسط میں صوفے پر ڈاکٹر موناز کا اوور کوٹ کسی مائع میں لتھڑا ہوا پڑا تھا۔ غالباً یہ بو اسی مائع کی تھی۔ میں نے لپک کر کوٹ اٹھایا۔ نیچے صوفے پر سیاہ رنگ کی گاڑھی سیال کیچڑ پھیلی ہوئی تھی اور اس میں ایک ٹوٹی ہوئی کھوپڑی اور چند انسانی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ کیچڑ کے قطرے نیچے فرش پر ٹپک رہے تھے۔ باہر سے میں نے یہی آواز سنی تھی۔ ڈاکٹر موناز اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ اور یہ اس کی لاش تھی، مگر اس حالت میں کہ بڑے سے بڑا جری اور بہادر انسان بھی اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ مس ہریرو، اسٹیانو اور کرایہ دار چیختے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔ صوفے کے سامنے رکھی ہوئی میز پر میرے نام ایک خط پڑا تھا۔ میں نے اسے کھول کر پڑھا اور پھر فوراً ہی جلا دیا۔

اس چار منزلہ عمارت میں دن کے چار بجے مجھ

پر ایک ایسا انکشاف ہوا کہ باقی کرایہ دار اسے جان لیتے تو بے ہوش ہو کر گر پڑتے۔ نیچے ٹریفک کا شور سنائی دے رہا تھا اور میں پیرس کے گنجان ترین حصے میں ہزاروں لاکھوں زندہ انسانوں کے درمیان کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ معلوم نہیں آپ میری بات پر اعتبار کریں گے یا نہیں۔ تاہم بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ حقیقت میں موجود ہیں، انسان اس پر یقین نہ کرنے ہی میں اپنی بہتری سمجھتا ہے، ورنہ یہ زندگی بہت تلخ ہو جائے۔ یہ راز میرے سینے میں دفن ہے۔ آپ کے لئے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آج بھی امونیا کی بو، سرد ہوا یا خنکی مجھ پر خوف کی ایسی شدید اور پاگل کر دینے والی کیفیت طاری کر دیتی ہے کہ میرے اعصاب جواب دے جاتے ہیں اور میں چیخنے اور چلانے لگتا ہوں۔

میں زیادہ تر آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتا کیونکہ آپ یہ جاننے کے لئے بے تاب ہوں گے کہ ڈاکٹر موناز کی موت کس طرح ہوئی اور اس کی لاش کیچڑ اور شکستہ ہڈیوں میں کیونکر تبدیل ہو گئی۔ ڈاکٹر موناز نے اپنے خط میں لکھا تھا۔

"یہ میرا آخری وقت ہے۔ مزید برف ملنے کی کوئی امید نہیں، کیونکہ جس شخص کو تم نے اس کام پر مقرر کیا تھا، اس نے مجھے دیکھ لیا اور چیختا ہوا بھاگ نکلا۔ گرمی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی ہے اور میرا جسم پگھل رہا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا ایک مرتبہ میں نے کہا تھا کہ اعضائے جسمانی کام چھوڑ دیں تو انسان قوت ارادی کے بل پر جسم کو دوبارہ کام کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ یہ نظریہ درست تھا، لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں، کیونکہ مادی جسم بتدریج گلتا اور سڑتا رہتا ہے۔ مجھے اس بات کا علم نہ تھا، ورنہ میں یہ خوفناک تجربہ نہ کرتا۔ ڈاکٹر تارس ان تجربات میں میرا ساتھی تھا۔ دراصل میں نے بستر مرگ پر اسے بلا بھیجا تھا۔ اس نے مجھ پر تجربات شروع کئے اور بالآخر کامیاب ہوا لیکن یہ علاج خاصا طویل اور اعصاب کو تھکانے والا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خود اعصابی صدمے کا شکار ہو کر اچانک مر گیا اور میں اس کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ میری اپنی حالت یہ تھی کہ گو دل اور دماغ اپنا کام کرنے لگے تھے، لیکن گوشت پوست آہستہ آہستہ ہڈیوں کا ساتھ چھوڑ رہا تھا، چنانچہ میں نے اپنے گلتے ہوئے جسم کو ادویہ کی مدد سے اور انتہائی سردی میں محفوظ رکھا اور ابھی تک زندہ ہوں۔ یہ ایک حیرت انگیز تجربہ تھا اور میری خواہش تھی کہ میری موت کے بعد دنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹروں تک اس تجربے کی روداد پہنچ جائے، اس لئے میں نے وہ خطوط لکھے جن میں موت کے بعد زندہ رہنے کے طریقوں پر مفصل بحث تھی مگر اب میں نے یہ خطوط جلا دیئے ہیں، کیونکہ میں نہیں چاہتا کوئی شخص ذہنی اذیت کے ان طویل مراحل سے گزرے جن سے میں گزر رہا ہوں۔ قدرت کا مقابلہ کرنے والے ہمیشہ شکست کھاتے ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خود کو زندہ رکھنے کے لئے جو زبردست جنگ کرنی پڑتی ہے، وہ انسان کے اعصاب کو توڑ مروڑ کر رکھ دیتی ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ طبعی موت کو سینے سے لگا لیا جائے۔ کاش! آج سے اٹھارہ برس پیشتر میں یہ تجربہ نہ کرتا اور مرتے وقت مجھے تکلیف نہ ہوتی۔ اب میری حالت یہ ہے کہ جسم کیچڑ بنتا جا رہا ہے، گوشت ٹوٹ کر فرش پر گر رہا ہے، لیکن میں زندہ ہوں اور بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کو یہ حروف لکھنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا ہے! افسوس صد افسوس اس انسان پر جو قدرت سے نبرد آزما ہونے کی بے کار کوشش کرتا ہے...... ہاتھوں کا گوشت گل کر گر پڑا ہے اور ہڈیوں کی مدد سے قلم پکڑا نہیں جاتا، اس لئے میرے دوست الوداع۔"

میں اٹھارہ سال پرانے مردے سے اپنی دوست کی تفصیلات بھلانا چاہتا ہوں، لیکن جونہی سرد ہوا مجھ سے ٹکراتی ہے تو ساری خوفناک یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

صدیوں کی آگ

احسان سحر۔میانوالی

حسین و جمیل مانند اپسرا حسینہ اپنے بستر پر دراز تھی کہ اچانک کھڑکی میں کھٹکا ہوا اور جب اس حسینہ نے اس طرف اپنا رخ کیا تو دنگ رہ گئی کیونکہ کھڑکی میں بھی وہ خود مجسم موجود تھی اور وہ واقعی حیران کن بات تھی کہ ایسا......

ایک محبت کی متلاشی روح کا شاخسانہ جو اپنے محبوب کی تلاش میں جنم جنم سے سرگرداں تھی

عزت نگر میں بحیثیت ڈاکٹر مجھے پریکٹس کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ تین ہفتے ہوئے ہوں گے کہ مجھے مہارانی اوشا دیوی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس سے قبل میرے کئی مریض اس کی انتہائی خوبصورتی اور کمسنی کا تذکرہ کرچکے تھے۔ چنانچہ مجھے جب مہارانی کی بڑی حویلی میں طلب کیا گیا تو میں اسی سہ پہر میں دل میں خوش ہوتا ہوا اس کی خدمت میں روانہ ہوگیا......

حویلی ایک باغ کے درمیان واقع تھی۔ جونہی باغ میں داخل ہوا میں نے محسوس کیا کہ ایک عجیب سی بوجھل بوجھل فضا نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا ہو۔ تھوڑا سا آگے بڑھا تو کئی سادھیاں برابر برابر بنی ہوئی نظر آئیں۔ بچپن سے میری یہ عادت رہی ہے کہ قبروں اور سادھیوں پر لکھے ہوئے کتبے ضرور پڑھتا ہوں۔

چنانچہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر میں نے ان سادھیوں کے کتبوں پر اپنی نظریں دوڑائیں، یہاں تک کہ ایک پرانی سادھی پر دیوناگری رسم الخط میں اس عجیب وغریب کتبے پر نظر پڑی جس کا اردو میں مفہوم یہ تھا۔

نام......کنور رانی شکنتلا دیوی

پیدائش 1857ء......وفات 1878ء

’ہے بھگوان، اب اسے سنسار میں دوبارہ نہ بھیج یو‘

یہ عبارت عجیب احمقانہ سی معلوم ہوئی۔ ”کیا جن لوگوں نے یہ سادھی بنائی انہیں کوئی تعریفی یا حاکی جملہ نہ مل سکا تھا؟ کیا حقیقت میں وہ لوگ اس نوجوان لڑکی سے اتنا بیزار تھے کہ انہوں نے اس کی موت کے بعد بھگوان سے یہ درخواست کرنا ضروری سمجھا کہ اسے دوبارہ نہ اس دنیا میں بھیجا جائے؟“ یہ میری زندگی کا پہلا کتبہ تھا۔ جو اپنے مضمون کے لحاظ سے بالکل اچھوتا اور انوکھا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں کبھی مہارانی اوشا دیوی سے اتنا بے تکلف ہوسکوں گا، اس سے اس کتبہ کے بارے میں سوال کرسکوں گا......؟

بہر صورت اتنا وقت نہیں تھا کہ میں مرے ہوئے لوگوں کو زندہ انسانوں پر ترجیح دوں، اس لئے میں نے حویلی کی جانب بڑھنا ضروری سمجھا۔ آہنی پھاٹک پر صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ایک ادھیڑ عمر خادمہ نے میرا استقبال کیا۔

”ڈاکٹر صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”شریمتی مہارانی صاحبہ آپ کی منتظر ہے......“

میں خادمہ کے پیچھے ایک بڑے ہال میں داخل ہوا جہاں کچھ نوجوان پنگ پانگ کھیل رہے تھے۔

اور کچھ ٹولیوں کی صورت میں تاش اور ایک طرف گراموفون پر نغمے بجائے جارہے تھے۔ پورے حال میں اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اور وہ لوگ اپنی دلچسپیوں میں اس قدر مگن تھے کہ کسی نے مجھ پر توجہ نہ دی۔ ہال سے ہوتے ہوتے ہم لوگ صحن میں داخل

ہوئے اور ہال سے حویلی کے اس حصے میں پہنچے جہاں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اور تب میں مہارانی اوشادیوی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کھڑکی کے قریب بچھی ہوئی ایک خوب صورت آبنوسی مسہری پر دراز تھی۔

مجھے یاد نہیں کہ مہارانی پر نظر پڑتے ہی میں کتنی دیر تک مبہوت بنا کھڑا رہا۔ تاہم مجھے آج بھی یاد ہے اس کی مسہری کہاں پڑی تھی۔ کھڑکی سے پھولدار درختوں اور بیلوں کی شاخیں جھانک رہی تھیں۔ مسہری کے سرہانے کچھ ہندی اور اردو کی کتابیں اور کروشیا کا سامان رکھا ہوا تھا۔ میں نے ہمیشہ بچپن ہی سے جب نانی اماں اپنے پاس لٹا کر مجھے شہزادوں اور شہزادیوں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ یہ توقع کر رکھی تھی کہ میری کسی نہ کسی روز ایسی شہزادی سے ملاقات ہوگی جو دنیا میں سب سے زیادہ حسین وجمیل ہوگی۔ مہارانی کو دیکھتے ہوئے جس چیز نے مجھے مبہوت کر رکھ دیا وہ یہی تصور تھا۔ دنیا کی حسین ترین شہزادی میرے سامنے مسہری پر لیٹی ہوئی مسکرا رہی تھی۔

اس پہلی اور بھرپور نظر کے بعد اکثر و بیشتر میں نے سوچا کرتا تھا کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ مہارانی کا حلیہ بیان کروں تو وہ انہیں الفاظ کا جامع کسی طرح پہنایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی تعریف کے لئے کون سا لفظ استعمال کرنا چاہئے۔ ادیبوں اور شاعروں نے عموماً اپنے محبوب کے گال کشمیری سیب سے تشبیہ دی ہوگی۔ لیکن مہارانی کے گالوں جیسے سیب تو غالباً آج تک کہیں پیدا نہیں ہوئے ہوں گے۔ اس طرح اس کی آنکھیں تھیں...... میر کا مشہور شعر......

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

مہارانی کی آنکھوں کی تعریف اللہ اللہ، اس کی آنکھوں میں جو گہرائی اور گہرائی تھی۔ جو تحیر اور اسرار چھپا ہوا تھا اس کے بارے میں دنیا کے سارے شاعروں کے دیوان چپ تھے...... مہارانی اوشادیوی کے کمرے میں ایک پنجرے میں بند دو مینا تھیں جو اتنی خوش الحانی کے ساتھ چہک رہی تھی کہ میں وہ جملے نہ سن سکا جس کے ذریعے مہارانی نے مجھے خوش آمدید کہا تھا۔

بہرصورت انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوئے اس نے سب سے پہلے میری قیام گاہ اور پریکٹس کے بارے میں سوالات کئے۔ اس کی مترنم آواز میں کھو کر میں تقریباً یہ بھول ہی گیا کہ حویلی میں میری آمد کا مقصد اصل میں کیا ہے۔

''میں نے خواہ مخواہ مسلسل کئی کئی گھنٹے گھوڑا سواری کر کے اپنے دل کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔''

اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ ''صبح سے یہ حالت ہوگئی ہے کہ ہر اس جگہ پر دل دھڑکتا ہوا معلوم ہورہا ہے۔ جہاں اسے نہیں دھڑکنا چاہئے۔ میرے واقف کاروں کا کہنا ہے کہ مجھے طبی مشورہ لینا چاہئے، اس لئے میں نے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی ہے۔ مہربانی کر کے یہ دیکھ لیجئے کہ میرا دل اپنی جگہ درست حالت میں ہے یا نہیں......؟''

میں نے اس کی نبض اور سینے کا اس طرح جائزہ لیا کہ میرے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور خود میرا اپنا دل میرے قابو میں نہیں تھا۔ تاہم یہ پتہ لگانے میں مجھے دیر نہ لگی کہ اس کا دل ضرورت سے زیادہ کمزور ہے۔

دھڑکن کی ترتیب غیر موزوں اور پمپنگ کی رفتار مدھم ہے۔ چنانچہ میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ دو تین ہفتے آرام کرے۔ ''اگر میں نے گھوڑا سواری نہیں کی تو۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تو میں پریشان ہوجاؤں گی۔ شاید میرا ہاضمہ خراب ہوجائے۔ بہرحال میں کوشش کروں گی کہ آپ کے کہنے پر عمل کروں اور کتابوں، دوستوں اور اپنے خوب صورت وجے کے ساتھ اپنا دل بہلاؤں۔'' وجے کے نام کے ساتھ اس نے چھوٹی نسل کے ایک سفید کتے کی طرف اشارہ کیا۔ جو اس کی مسہری کے پائنتی پر بیٹھا ہوا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''کیا آپ کے ہاں کوئی ایسے صاحب ہیں جنہیں میں آپ کی صحت اور دیکھ بھال کے حوالے سے ضروری صلاح مشورہ دے سکوں؟''

''جی نہیں، میرا کوئی عزیز رشتے دار نہیں، اس دنیا میں

کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کی ہدایت پر مجھے کاربند ہونا پڑے۔ میں تنہا ہوں بالکل......"

"لیکن حویلی میں تو لاتعداد لوگ نظر آ رہے ہیں......؟"

"ان میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو یہاں سیر و تفریح کے لئے آتے ہیں۔ کچھ میرے خدام ہیں۔ جب میں یہ کہتی ہوں کہ میں بالکل تنہا ہوں تو اس سے مراد ہوتی ہے کہ میں آزاد ہوں۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔ "یعنی کوئی ایسا شخص نہیں جو مجھ پر حکم چلا سکے......"

میں ضروری دوائیاں دے کر اور آرام کی ہدایات کرتے ہوئے جانے کے لئے گھوما تو اچانک اس نے مجھ سے سوال کیا۔

"آپ کو سمادھیوں کے قریب کھڑے دیکھا تھا، مجھے اس کھڑکی سے سب کچھ نظر آتا ہے، کیا آپ کو بھی مرے ہوئے لوگ متاثر کرتے ہیں؟"

"جی مہارانی صاحبہ، خاص کر قبروں اور سمادھیوں پر لگے کتبے میں پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا، آپ کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے اندر بھی یہی کمزوری ہے۔ اور غالباً اسی لئے آپ نے اپنے اس کمرے کا انتخاب کیا ہے جس کی کھڑکی سے سمادھیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔"

وہ ہنسی۔ "ان سمادھیوں میں میرے آباؤ اجداد آرام کر رہے ہیں، میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص سمادھی میں کروٹ بھی بدلے تو مجھے فوراً پتہ چل جائے گا، آپ کا کیا خیال ہے سمادھیوں سے اتنا قریب ہونے میں کوئی حرج تو نہیں......؟"

"میرے خیال میں جسمانی صحت کے لئے یہ قرب مناسب نہیں ہے......"

"آپ ڈرتے ہیں کہ میرے ماں باپ یا دادا دادی کا بھوت مجھے پریشان کرے گا؟ یہ نہ بھولئے کہ یہ سب کی سب سمادھیاں میرے عزیز کی ہیں۔ بہرحال آپ پہلے میرے دل کو اصل جگہ پر پہنچا دیجئے۔ اس کے بعد مسئلے پر آپ سے دلچسپ گفتگو کی جا سکے گی......" پھر والہانہ انداز میں مسکراتی ہوئی بولی۔ "دن کے بجائے کبھی رات میں بھی تشریف لائیں، میں آپ کو باغیچے میں ملوں گی۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ چاندنی رات میں ایک بڑے سفید الو کی معیت میں گھومتے ہوئے کتنا لطف آتا ہے، خصوصاً اس وقت جب وہ الو ادھر ادھر آپ کے آگے آگے اڑتا ہوا پھر رہا ہو اور سمادھیوں کے کتبوں پر بیٹھ کر آرام کرنے لگتا ہو......"

میں شہر میں اس طرح واپس ہوا جیسے کوئی سحر زدہ انسان ہو۔ ریاست میں آنے کے بعد مہارانی اوشا کماری کی پہلی ہستی ایسی تھی، جس نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میں بھی گوشت پوست کا بنا ہوا ایک انسان ہوں، اس سے قبل میری حیثیت ایک بے حس ڈاکٹر جیسی تھی۔ لیکن ایک شخصیت نے میری حالت بالکل ہی بدل کر رکھ دی۔ میں یہ جانتا تھا کہ کبھی مہارانی کو حاصل نہیں کر سکوں گا۔ لیکن سینے کے اندر جیسے کوئی چپکے چپکے دل میں میٹھی چسکیاں دے رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی من موہنی صورت گھوم رہی تھی اور کانوں میں اس کی وہی مدھ بھری آواز رس گھول رہی تھی۔

میں اگلے ہفتے تین مرتبہ مہارانی اوشا دیوی کی حویلی میں گیا۔ اور یہ دیکھا کہ اس کی حالت بہت ہی معمولی سی تبدیل ہوئی ہے۔ میں نے طے کیا کہ بجلی کا علاج شاید فائدے مند ثابت ہو۔ میرے پاس رپورٹ ایبل ایئر بیس یعنی ایسا سامان موجود تھا جسے آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکے۔

علاج مہارانی کے ہی کمرے میں شروع کیا گیا۔ اس علاج کے باعث مجھے طویل عرصے تک روزانہ حویلی میں جانا پڑا اور اس دوران مہارانی نے مجھ سے ایسی مزیدار باتیں کیں جن کی آج بھی یاد آ جاتی ہے تو دل میں چبھن سی ہونے لگتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ میری زندگی کا خوشگوار دور تھا۔ روز بروز میری مسرتوں اور خوشیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مہارانی کی ایک ساحرانہ حیثیت تھی۔ اس کا ہمدردانہ خلوص، رقص کرتی ہوئی آواز اور گلابی ہونٹوں کی مسکراہٹ نے مجھے اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ کبھی کبھی تو اس کی باتوں سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے خیالات کو پڑھ لیتی ہے اور اس سے قبل کہ میں اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ

پیستاؤں وہ ان کے بارے میں گفتگو کرنا شروع کردیتی ہے۔

اردو اور انگریزی ادب پر اس کا کافی گہرا مطالعہ تھا۔ ہندی ادب کے متعلق وہ زیادہ پر امید نہیں تھی۔ مجھے اس کے گہرے مطالعے اور یادداشت پر بے حد حیرت ہوتی تھی۔ تاہم اس نے اپنے متعلق کوئی بات تفصیل سے نہیں بتائی تھی۔ مجھے اس کی اپنی زندگی یا اس کے آنجہانی آباؤ اجداد اس کے دوستوں کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہوسکا۔ علاوہ اس بات کہ وہ محض نام کی مہارانی ہے کبھی کسی زمانے میں اس کے باپ دادا یہاں حکومت کیا کرتے تھے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد بغاوت کے جرم میں ریاست ختم کردی گئی اور اب انگریزی سرکار سے جو تھوڑا بہت وظیفہ ملتا ہے اس پر گزر اوقات کا دارومدار ہے۔ بستی کے لوگ آج بھی عزت نگر کو ریاست اور شادیوی کو مہارانی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایک شام کو میں پوچھ ہی بیٹھا......

"آپ تمام دنیا کی باتیں کرتی ہیں، لیکن اپنی شخصیت کے بارے میں کچھ ارشاد نہیں فرماتی......"

"مجھے تو یہ سوچتے ہوئے بھی تکلیف ہوتی ہے کہ ایسی زندگی کس کام کی جس میں شخصیت کا کوئی تعین ہی نہ ہوسکے۔"

میں ہنس پڑا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی کوئی شخصیت ہی نہیں ہے حالانکہ میرے خیال میں یہ آپ کی پرکشش شخصیت ہی ہے جو روزانہ مجھے کشاں کشاں یہاں کھینچ لاتی ہے۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" اس نے کہا۔ "میں احمق بھی نہیں ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ...... سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے وضاحت کروں...... کبھی کبھی تو میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میں کہاں کھوگئی ہوں۔ اور اس کی تلاش میں ہوں کہ اپنے آپ کو ڈھونڈ نکالوں...... اور کبھی میں تنہا رہ جاتی ہوں، چاہے آپ میرے پاس ہوں یا کوئی دوسرا شخص......"

ایک دو ثانیے میں وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

"آپ نے محسوس کیا ہوگا میں اپنے بارے میں سنجیدگی سے کوئی بات نہیں کرسکتی، حالانکہ میں دل سے چاہتی ہوں کہ آپ سے ایسی باتیں کروں جن کا تعلق صرف میری ذات سے ہو۔"

"کوشش کیجئے مہارانی صاحبہ......" میں نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ "میں بھی دل سے چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے اپنے آپ کو نہ چھپائیں۔"

"توقع نہیں کہ مجھے کوئی کامیابی ہوگی۔ تاہم میں کوشش کرتی ہوں کہ آپ کو یاد ہوگا جب آپ پہلے پہل حویلی میں تشریف لائے تھے میں نے آپ کو بتایا تھا کہ گھڑ سواری کے باعث میں نے اپنے دل کو نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ میرے دل کی بیماری کی وجہ کچھ اور ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں آپ کو کوئی بھوت کہانی سنا رہی ہوں۔ مجھے یہ بھی امید نہیں کہ آپ میری بات کا یقین کریں گے تاہم جو کچھ میں آپ کو بتاؤں گی وہ سو فیصد درست ہے اور میرے دل کو بے قابو کرنے میں اس کا سب سے بڑا ہاتھ ہے۔"

وہ خاموش ہوگئی جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر بولی......

"پہلی مرتبہ جب میں کم عمر تھی اور جوانی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی...... میں اپنی اسی مسہری پر لیٹی ہوئی تھی...... سونے کی کوشش کررہی تھی، رات کافی گزر چکی تھی۔ میں نے دن کو ایک ناول پڑھا تھا جس کا ہیرو دوہری شخصیت کا مالک تھا، دن میں وہ شریف اور عبادت گزار بن جاتا تھا اور رات کو اچانک ڈاکو اور قاتل کی حیثیت سے بڑے بڑے ڈاکے ڈالتا، مجھ پر اس ناول کا بہت برا اثر ہوا تھا اور میں بار بار سوچ رہی تھی کہ کہیں میری بھی تو دوہری شخصیت نہیں۔ کروٹیں بدلتے بدلتے ایکا ایکی میری آنکھیں کھڑکی کی طرف گھوم گئیں۔ میں نے دیکھا کہ ایک مدھم چہرہ کھڑکی سے لگا ہوا مجھے دیکھ رہا ہے۔ مجھے کسی قسم کے خوف اور ڈر کا احساس نہیں ہوا علاوہ اس بات کے کہ میرے دل کی دھڑکنیں میں شدید قسم کا اضافہ ہوگیا......

عین اسی وقت چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور چاندنی کی روشنی میں، میں نے جھانکنے والے چہرے کو بالکل صاف طور پر دیکھا...... وہ میرا اپنا چہرہ تھا......"

"کیا......؟" میں اچھل پڑا۔ "کیا آپ کو شبہ ہوا تھا کہ

وہ آپ کا چہرہ ہے......؟"

"جی نہیں رتی برابر بھی شبہ نہیں ہوا کہ ہر شخص اپنے چہرے سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ میرا اپنا چہرہ بلاشک شبہ مجھ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جب اس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا تو اس چہرے نے اپنا سر اس طرح ہلایا جیسے اسے کسی بات کا شدید رنج ہو۔ ایک لمحہ کے لئے میں نے سوچا کہ شاید میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن میری آنکھوں نے بند ہونے سے انکار کردیا۔ انہیں اسی منظر سے لطف آرہا تھا۔ اب کی مرتبہ میرے چہرے نے جو مسلسل مجھے تک رہا تھا۔ انتہائی افسوسناک طریقے سے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا......

یہ میں تھی جو اسے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ بھی میں تھی جو مجھے تک رہی تھی۔ فرق اتنا تھا کہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہوئی میں بہت زیادہ غمزدہ اور دکھی معلوم ہورہی تھی اور بستر پر پڑی ہوئی میں کچھ پڑھنے لکھنے اور اٹھنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اس وقت میرا دل چاہا کہ میں اپنے آپ کو......اپنے اس کو جو بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ آئینے میں دیکھوں۔ چنانچہ میں بستر سے اٹھ بیٹھی، میرے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں دھڑکن کی آواز صاف طور پر سن سکتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کچھ آپ کو بتانے والی ہوں اسے کیونکر باور کراؤں۔ نہیں نہیں، انتہائی مصیبت ناک حادثہ تھا۔ میں سنگھار دان کے سامنے بڑے سے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی لیکن......لیکن اپنے آپ کو دیکھنے سے بالکل قاصر۔ آئینے میں دیوار کی تصویر نظر آرہی تھی۔ الماری کا کونہ کونہ نظر آرہا تھا۔ چڑیا کا پنجرہ نظر آرہا تھا......اور وہ ساری چیزیں نظر آرہی تھیں، جو ہمیشہ اس میں نظر آتی ہیں۔ لیکن میرا عکس غائب تھا۔ اس طرح غائب تھا جیسے میرا کوئی وجود ہی نہ ہو۔

اب آہستہ آہستہ مجھ پر خوف نے غلبہ پانا شروع کیا، بے ہوشی سی طاری ہونے لگی، مگر میں نے طے کرلیا کہ کچھ بھی کیوں نہ ہوجائے ہرگز بے ہوش نہیں ہوں گی۔ نیم غشی کے عالم میں ڈرائنگ روم کی جانب روانہ ہوگئی۔ وہاں کے آئینے میں بھی اس شے کا پتہ نہ تھا۔ جس کی مجھے تلاش تھی۔ آخر کیا بات تھی کہ میرا عکس غائب ہوگیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرا دماغ خراب ہوگیا ہو۔ میں اپنی ذہنی کشمکش اور پریشانی کا اظہار نہیں کرسکتی تھی۔ تھکے تھکے قدموں سے میں اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ ہمت کرکے کھڑکی پر نظر ڈالی۔ چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ لیکن کھڑکی سے کسی کا جھانکتا ہوا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں آئینے کے پاس آگئی اور وہاں آئینے میں میرا عکس موجود تھا۔ اتنے فرق کے ساتھ کہ چہرہ اداس تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ کیا میں آپ کو دوسرا واقعہ بھی سناؤں کہ یا یہ سمجھ لوں کہ آپ نے میری توقع کے مطابق پہلے ہی واقعہ پر اعتبار نہیں کیا......؟"

"سنا دیجئے دوسرا قصہ بھی۔" میں نے کہا۔ "شاید ان دونوں واقعات کی روشنی میں کوئی ماہر نفسیات مجھے آپ کے دل کے بارے میں کوئی مناسب مشورہ دے سکے۔"

"دوسرا واقعہ تقریباً تین سال بعد ہوا، میں بیمار تھی اور پریشان تھی کہ کھوئی کھوئی سی کیوں رہتی ہوں، میری حالت ایک ایسے اداکار سی معلوم ہوتی تھی جسے دنیا کے اسٹیج پر بغیر کوئی پارٹ دیئے ہوئے بھیج دیا ہو۔ اس زمانے میں میرے کمرے میں ایک صوفہ لگا ہوا تھا اور ایک شام کو میں نے اس صوفے پر خود کو لیٹے ہوئے پایا۔ اس کی شکل اس کا جسم اس کے جسم کا ایک ایک رواں میرا اپنا تھا۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھی اور مجھے تکے جارہی تھی اور پہلے ہی کی طرح اداس اور غمزدہ معلوم ہورہی تھی، ایک بار مجھ پر غشی طاری ہونے لگی، لیکن میں نے اپنے ہوش بحال رکھے، ایسا لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی ہے، میں نے اس کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کو ہلتے دیکھا۔ لیکن کان میں کوئی آواز نہیں آئی۔ میرے قریب ہی ایک میز پر دستی آئینہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھالیا اور اس میں اپنا عکس دیکھنے کی کوشش کی، لیکن میں اپنے خوف میں حق بجانب تھی، آئینے میں میرے عکس کا کوئی نام ونشان نہیں تھا۔ لیکن کمرے میں موجود دیگر چیزیں صاف نظر آرہی

تھیں۔ تھوڑی دیر میں وہاں بیٹھی ہوئی آئینے میں اپنے آپ کو اسی طرح تلاش کرتی رہی گویا مجھے ہپناٹائز کردیا گیا ہو اور میں مجبور ہوگئی ہوں کہ آئینے پر نظریں جمائے رہوں۔ پھر آہستہ آہستہ میرا عکس ابھرنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ آئینے میں، میں اپنے آپ کو واضح طور پر دیکھنے لگی۔ میرے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے کوئی طویل سفر کیا ہے اور اب تھکی ہاری اپنے گھر آئی ہوں......

میں نے آج تک ان دونوں واقعات کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ آپ پہلے شخص ہیں ڈاکٹر صاحب، جنہیں میں نے یہ باتیں بتائی ہیں، کہیے کیا خیال ہے آپ کا ان حیرت انگیز واقعات کے بارے میں؟"

"میرا خیال ہے کہ یہ دونوں واقعات آپ نے خواب میں دیکھے ہوں گے اور اب اپنے خوابوں کو حقیقت سمجھ کر خواہ مخواہ ان کے بارے میں پریشان ہورہی ہیں......"

"اگر ایسی باتیں کریں گے تو آئندہ آپ کو اپنے بارے میں ایک بات بھی نہیں بتاؤں گی۔" اس نے منہ پھلا کر میری طرح آپ بھی جانتے ہیں کہ میں سوئی ہوئی نہیں تھی بلکہ جاگ رہی تھی۔"

"ہوسکتا ہے، شعوری طور پر آپ جاگ رہی ہوں لیکن آپ کا شعور خواب دیکھنے میں مصروف ہو، ماہر نفسیات شعور اور لاشعور کے باہمی جھگڑے سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ میں آپ کو ایسی کئی مثالیں دے سکتا ہوں۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس قسم کے واقعات عام ہیں......"

مہارانی اوشا کماری نے اپنا سر ہلایا۔ "میں آپ کی ممنون ہوں کہ آپ مجھ سے یا میرے ذہن سے یہ واقعات نکال دینا چاہتے ہیں، مگر افسوس یہ ہے کہ میں ان واقعات کو فراموش نہیں کرسکتی۔

شاید میں نے آپ کو بتایا ہے کہ دونوں مرتبہ میں نے محسوس کیا ہے کہ میں بے ہوش ہونے والی ہوں، لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے نے میری رہنمائی کی اور مجھے بے ہوش نہیں ہونے دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں بے ہوش ہوگئی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو جاؤں گی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کائنات کی بھول بھلیوں میں بھٹک جاؤں گی اور اپنے آپ کو کبھی نہ پاسکوں گی، میرے دل کی کمزوری اور صنف کا باعث یہ دونوں واقعات ہیں اور ساتھ ساتھ یہ خوف بھی دامن گیر ہے کہ پتہ نہیں اب کب اور کس وقت کیا ہوجائے گا......"

میرے چلنے سے قبل اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور دوسری باتیں کرنے لگی، جہاں تک اس کے واقعات کا تعلق ہے میرا دماغ انہیں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ تاہم یہ طے شدہ امر ہے کہ نفسیاتی طور پر وہ اتنی پریشان ہوچکی تھی کہ اس کا اثر نہ صرف اس کے جسم پر بلکہ دل پر بھی پڑا تھا۔ اگلے روز ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اطلاع ملی، فون پر مہارانی اوشا دیوی کی خادمہ مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کی خادمہ سے اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ وہ اپنی ملکہ کی بچپن سے اس کی خدمت کررہی تھی اور اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ جیسے کسی دیوی دیوتا کی پوجا کی جاتی ہے۔

"جلدی تشریف لایئے ڈاکٹر صاحب۔" اس نے مجھے فون پر اطلاع دی۔ "مہارانی صاحبہ سورہی ہیں، میں انہیں جگانے کی کئی کوشش کرچکی ہوں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی، عجیب سی نیند ہے ان کی......"

دس منٹ کے اندر اندر میں وہاں پہنچ گیا۔ مہارانی اوشا دیوی مسہری پر اسی عالم میں لیٹی ہوئی تھی کہ نہ اسے نیند کہا جاسکتا اور نہ بے ہوشی۔ سانس ٹوٹے ہوئے تھے اور ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بند تھیں۔

کوئی شخص بھی جو کسی لڑکی سے محبت کرتا ہو اپنی محبوبہ کو خوابیدہ حالت میں دیکھ کر دل میں امنگیں پیدا ہوتی ہوئی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن مہارانی کو اس طرح لیٹے دیکھ کر میرے دل میں امنگیں پیدا ہونے کے بجائے حزن و ملال کے بادل چھاگئے۔ اس کے پیارے پیارے گلابی چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ آنکھیں نیم باز تھیں اور ادھ کھلے پپوٹوں سے آنکھوں کی سفیدی نظر آرہی تھی۔ کلائی سفید نظر آرہی تھی۔ اور نبض کی رفتار بالکل مدھم، میں نے خادمہ سے

کہا کہ وہ جلدی سے گرم پانی کی بوتل لے آئے، بوتل آنے کے بعد ہم دونوں جلدی سے اس کے جسم سے لپٹی ہوئی چادر ہٹائی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مہارانی کے دونوں پیر نہ صرف ٹھنڈے، گیلے تھے بلکہ ان پر کیچڑ بھی لگی ہوئی تھی، پنجوں کے پوروں پر کیچڑ سوکھ گئی تھی اور ساڑھی کے نچلے حصے پر اور ٹخنوں پر کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔

"معلوم ہوتا ہے یہ سوتے میں چلتی رہی ہیں۔" میں نے خادمہ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "جب یہ پیدا ہوں تو انہیں کسی بھی حال میں یہ بات بتائی جائے، جتنی جلدی ممکن ہو سکے ان کی ساڑھی اور پیروں سے کیچڑ صاف کردو۔"

تقریباً دس منٹ کی مالش کے بعد مہارانی کے منہ سے ایک لمبی سی آہ نکلی اور کروٹ بدل کر وہ زور زور سے چلائی۔

"نہیں، نہیں، نہیں۔"

آہستہ آہستہ اسے ہوش آنے لگا۔ چہرے کا گلابی رنگ بحال ہوگیا، آنکھوں کی پتلیاں اپنی جگہ پر آگئیں۔ نبض کی رفتار قدرے بہتر ہوگئی۔ اور برف جیسے یخ جسم میں زندگی کی حرارت محسوس ہونے لگی۔

اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔ مجھے دیکھا اور اچانک ہی ایک عجیب و غریب سا سوال کردیا۔

"کیا یہ میں ہوں؟" اس کے سوال نے مجھے تھوڑا سا بوکھلا دیا، یہ پوچھنے کے بجائے کہ "کیا یہ آپ ہیں؟" وہ الٹی بات پوچھ رہی تھی۔ "کیا یہ میں ہوں؟"

میں نے بڑی نرمی اور شفقت کے ساتھ اسے اپنی موجودگی سے آگاہ کیا اور ہر ممکن احتیاط برتتے ہوئے اسے بتایا کہ اس پر ہلکی سی غشی طاری ہوئی تھی جس کے باعث خادمہ نے مجھے بروقت بلالیا۔ اس نے سکون کے ساتھ بات سنی۔

"گزشتہ رات پھر وہی وقعہ ہوا۔"

"کون سا واقعہ......؟"

"میرا عکس پھر غائب ہوگیا تھا۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اس سے قبل بھی میرا عکس غائب ہوا تھا، مجھ پر بے ہوشی سی طاری ہونے لگی، میں نے مزاحمت کرکے اپنے آپ کو بے ہوش ہونے سے بچایا تھا۔ گزشتہ رات میری قوت مزاحمت ختم ہوگئی تھی، بے ہوشی نے مجھ پر غلبہ پالیا اور میں غائب ہوگئی۔"

خادمہ کو مکمل خاموشی اور چند دواؤں کے ساتھ بارے میں ضروری ہدایات دے کر میں وہاں سے اپنے راؤنڈ پر چل دیا۔ مجھے چند اہم مریضوں کو دیکھنا تھا، میں پہلے ہی تسلیم کرچکا ہوں کہ مذہبی رکاوٹ کے باوجود مجھے مہارانی اوشا دیوی سے محبت ہوگئی تھی۔ میں نے کبھی یہ سوچا نہیں تھا کہ میری محبت کا جواب محبت سے ملے گا یا کبھی میں مہارانی کو اپنا بنا سکوں گا، میرا عشق چکور سا تھا...... جو چاند پر عاشق ہوتا ہے لیکن کبھی اس تک پہنچ نہیں پاتا، اکثر اوقات میں اپنے اس جذبے پر اپنے آپ کو لعنت و ملامت کرتا، مگر کم بخت دل کے ہاتھوں مجبور تھا اور جو دل کے ہاتھوں مجبور ہوں وہ مجبور ہی رہتے ہیں۔

اس رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے میری آنکھ کھل گئی مہارانی اوشا دیوی کا تصور میرے ذہن میں سوار تھا۔ اگر وہ واقعی خواب خرامی میں مبتلا ہے تو یہ حادثہ آج پھر ہو سکتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو زخمی کر بیٹھے یا باغیچہ میں کیاریوں کے پاس پہنچ کر اس کی آنکھ کھل جائے اور وہ خوفزدہ ہوجائے۔

"میں کیسا بے وقوف شخص ہوں کہ خادمہ سے یہ کہے بغیر چلا آیا کہ آج کی رات وہ مہارانی کے کمرے میں گزارے۔ یہ جان کر مجھے بے حد حیرت ہوئی کہ یہ کرنے سے قبل ہی کہ مجھے حویلی جانا چاہئے میں نے وہاں جانے کے لئے لباس تبدیل کرلیا تھا۔ بہر حال یہ سوچ کر حویلی روانہ ہوا کہ میں صرف باغیچے پر ایک نظر ڈال کر واپس آجاؤں گا...... اور اگر مہارانی وہاں خواب عالم میں گھومتی ہوئی نظر آئی تو میں اسے حویلی پہنچا کر خادمہ کو خصوصی نگہداشت کی ہدایت بھی کردوں گا۔

چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا اور اس کی روپہلی روشنی حویلی کے پورے باغیچے کو منور کررکھا تھا۔

باغیچے میں پہنچتے ہی کسی الو کی آواز پر میں چونک گیا

پھر اچانک مجھے مہارانی کی بات یاد آئی......

"آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ چاندنی راتوں میں ایک بڑے سفید الو کی معیت میں گھومتے ہوئے کتنا لطف آتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ الو ادھر ادھر آپ کے آگے پیچھے پھر رہا ہو اور سادھیوں کے کتبوں پر بیٹھ کر آرام کرنے لگتا ہو......' اور عین اسی وقت ایک بڑا سفید الو میرے رخساروں سے ٹکراتا ہوا ایک سادھی پر جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، ایک سادھی کے پاس زمین پر مجھے کچھ سفید سی چیز پڑی ہوئی نظر آئی، میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ کون ہے۔ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میں مہارانی تک پہنچا، وہ بے ہوش تھی۔ دانت بھینچے ہوئے تھے۔ ہاتھ پاؤں اکڑ چکے تھے، سانس اس طرح چل رہی تھی جیسے اس پر نزع کا عالم طاری ہو۔ اور تب میری نظریں اتفاقیہ طور پر سادھی کے کتبے پر پڑیں۔

"کنورانی شکنتلا دیوی...... ہے بھگوان اب اسے سنسار میں دوبارہ نہ بھیجو......"

"نہیں، نہیں، نہیں۔" مہارانی کے منہ سے آواز نکلی۔ جن کے باعث میری توجہ کتبے سے ہٹ کر ایک بار پھر اس کی جانب مبذول ہوگئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے جسم کو اپنے ہاتھوں سے اٹھالیا۔ وہ پھول کی طرح ہلکی پھلکی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا ہوا میں اسے کمرے میں لے آیا۔

وجے نے مجھے کمرے میں آتا دیکھا تو پیار بھری آواز نکالتا ہوا وہ میرے قدموں میں آ کر چمٹ گیا اور میں نے مہارانی کو مسہری پر لٹایا تو وہ مجھے فراموش کر کے اس کے سفید ہاتھوں کو چاٹنے لگا۔

تھوڑی دیر تک میں وہیں بیٹھا رہا۔ پھر خادمہ کے کمرے میں جا کر اسے بیدار کیا۔ اور اس سے کہا کہ وہ مہارانی اوشا دیوی کے کمرے میں جا کر سوئے اور یہ خیال رکھے کہ وہ دوبارہ باہر نہ جانے پائے۔

اگلی صبح میں مریضوں سے نمٹ کر پہلی فرصت میں مہارانی کی حویلی کی طرف روانہ ہوگیا، راستے میں خادمہ مل گئی۔

"میں آپ ہی کو بلانے جارہی تھی۔" اس نے کہا۔ "مہارانی صاحبہ کی وہی کل کی سی حالت ہے ایسی گہری نیند سو رہی ہیں کہ انہیں دیکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج کل جلدی تھک جاتی ہیں۔' میں نے اسے تسلی دی۔

"شاید آپ کا کہنا ٹھیک ہو پر میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ ایسا کون سا کام کرتی ہیں کہ ان کو تھکن ہوجاتی ہے۔" اس نے کہا۔ "رات اس کے جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بلی گھس آئی تھی اور مہارانی صاحبہ کی دونوں مینائیں اپنے پنجروں میں مری پڑی ہیں...... اب میں انہیں کیسے بتاؤں گی کہ ان کی مینائیں بلی نے مار ڈالی ہیں۔"

"میں بتادوں گا انہیں۔" میں نے سمجھایا۔ "لیکن خدا کے لئے پنجروں کو کمرے سے باہر لے جاؤ کہ اگر مہارانی جاگیں تو انہیں فوراً صدمے کا سامنا نہ کرنا پڑے۔" میں نے کہا۔

"خادمہ پنجروں کو لے کر باہر چلی گئی اور میں مسہری کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے مہارانی کی سفید کلائی پر اپنا ہاتھ رکھا تاکہ اس کی نبض دیکھی جاسکے، مگر اچانک میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، وہ ہاتھ جنہیں پیار کرنے کی آرزو میرے سینے میں کروٹ لیتی رہتی تھی۔ سفید پڑے ہوئے تھے اور ان کی انگلیاں خون آلود تھیں اور مٹھیوں میں میناؤں کے پروں کے گچھے دبے ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ مجھے مہارانی اوشا دیوی کے پاس بیٹھے ہوئے خوف محسوس ہوا، مگر جیسے تیسے میں نے آپ پر قابو پایا۔ اور ملازمہ سے نیم گرم پانی منگا کر مہارانی کے ہاتھ کے سارے نشانات صاف کیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آگئی، اس کی آنکھوں میں وحشی پن تھا لیکن جلد ہی وہ پرسکون ہوگئی۔

پھر وہ میری طرف محبت بھری نظروں سے ایسے دیکھنے لگی جیسے وہ میرا خیر مقدم کر رہی ہو......

"میں پھر بے ہوش ہوگئی تھی؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا کر نسخہ لکھا اور ایک انجکشن لگایا۔

"وجے کہاں ہے۔" اس نے کمرے میں چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"آج صبح سے ہی غائب ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے اسے ہر جگہ تلاش کرلیا۔ پاس پڑوس کے لوگوں سے بھی پوچھ لیا لیکن کسی کو بھی پتہ نہیں ہے۔"

"وہ کھڑکی سے باہر کود گیا ہوگا۔" مہارانی نے کہا۔ "اور اب کسی گندی کتیا کے پاس بیٹھا اپنی دم ہلا رہا ہوگا......"

اچانک اسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو اس کا پورا چہرہ شرم سے لال ہوگیا۔ اس وقت وہ مجھے اتنی پیاری لگی کہ میرا دل چاہا کہ اخلاق و آداب کے سارے بندھن توڑ کر اسے پیار کروں......

"میں نے ایک خوفناک خواب دیکھا ہے وجے کے متعلق......" اس نے مجھے کہا۔ "اب میں خود ہی اسے تلاش کرکے لاؤں گی۔"

میں جانتا تھا کہ جب وہ کسی بات کا تہیہ کرے تو اسے روکنا بہت مشکل ہے۔ اپنی بات کے آگے وہ کسی کی بات نہیں مانتی۔ حالاں کہ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ بستر سے اٹھے۔

اسے آرام کا مشورہ دینے سے قبل ضروری تھا کہ میں اسے بتادوں۔ وہ پچھلی دو راتوں سے سوتے میں چلنے لگی ہے۔ تنہائی اس کے لئے موزوں نہیں، ڈر ہے کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچ جائے......

"اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کیلئے کسی نرس کا انتظام کروں......؟" میں نے کہا۔ "وہ آپ کا پورا خیال رکھے گی......"

اس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں کیا بات ہے میرا دل نہیں چاہتا کہ آپ کی بات ماننے سے انکار کروں...... آپ تو مجھے حکم دیا کیجیے......" اس نے چند لمحوں تک کچھ سوچا۔

جب میں حویلی سے واپس ہوا تو اس کا آخری جملہ بار بار میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔ کیا اس نے سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی۔ کیا جولڑکی صرف حکم چلانا جانتی ہے، کیا وہ دل سے چاہتی ہے کہ میرے احکامات پر عمل کرے۔

کہیں اس جملے میں اظہار محبت تو پوشیدہ نہیں؟

سہ پہر کو خود بخود میرے قدم اس حویلی کی طرف اٹھ گئے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کہنے لگی......

"آپ نے بلی کے جرم کے متعلق کچھ سنا......؟" اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اور آواز کپکپا رہی تھی۔

"اس نے میری دونوں میناؤں کو مار ڈالا۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ بہر صورت میں نے افسوس میں سر ہلاتے ہوئے ہمدردی کا اظہار کیا۔ "بہت پیاری مینائیں تھیں۔"

"جی ہاں میں تو ان پر عاشق تھی۔" اس نے کہا۔ "اس کے علاوہ مجھے وجے کی طرف سے بھی پریشانی ہے۔ وہ میری نظروں سے گھنٹے کے لئے بھی دور نہیں رہ سکتا۔ میرے بغیر وہ پاگل ہوجائے گا۔ کسی نے اسے چوری تو نہیں کرلیا......؟"

"نہیں کس کی مجال ہے جو آپ کے کتے کو چرائے، پریشان نہ ہوں، ادھر ادھر ہوگا شام تک آجائے گا۔"

"نرس کا انتظام ہوگیا......؟" اس نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"جی ہاں وہ آج ہی آجائے گی۔ اس کے لئے کسی کمرے کا انتظام کرادیجیے، دن میں وہ اپنے کمرے میں رہے گی اور رات کے وقت آپ کے کمرے میں آکر بیٹھ جایا کرے گی......"

"کاش وہ سوپر بننے کی عادی نہ ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن جب وہ میرے کمرے میں مجھ پر نظریں جمائے بیٹھی ہوگی تو میں کس طرح سوسکوں گی، خیر اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی......"

اور پھر اس جملے کے ساتھ اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

"آج کی سہ پہر کتنی خوب صورت ہے، چلیے تھوڑی دیر باہر گھوم آئیں......"

ہم دونوں دیر تک حویلی کے باغیچے میں گھومتے رہے، وہ جان بوجھ کر سادھیوں کی طرف نہیں گئی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ جان بوجھ کر اس سمت کو نظر انداز کررہی ہو۔

تقریباً پانچ منٹ کے بعد ہم لوگ باغ کے مالی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے۔

وہ وجے کو ایک چھوٹی سی زنجیر کے ساتھ باندھے ہمارے پاس لارہا تھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر وجے کی زنجیر اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ ”یہ کہاں سے ملا تمہیں......؟“ میں نے مالی سے پوچھا۔

”یہ دریا کے کنارے گھوم رہا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا اور اسے لے کر یہاں آگیا......“

میں نے وجے کی پشت کو پیار کے ساتھ تھپ تھپایا، اور اس کے منہ سے بھی خوشی کی آواز نکلی۔ اور وہ اپنی ننھی سی دم ہلانے لگا۔ میں اسے لئے مہارانی اوشا دیوی کے پاس پہنچا۔ عین اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی جس کے لئے میں ہرگز تیار نہیں تھا۔ وجے نے مہارانی کو دیکھتے ہی منہ سے ایسی آواز نکالی جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا ہو، اس کا پورا جسم اکڑ کر لکڑی کی طرح سخت ہوگیا، دم نیچے جھک کر پچھلی دونوں ٹانگوں کے درمیان غائب ہوگئی۔

”وجے، وجے“ مہارانی نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے؟ کیوں ڈر رہے ہو؟ یہ میں ہوں میری طرف دیکھو وجے یہ میں ہوں......“ لیکن وہ کتا جس کے بارے میں اس نے کہا تھا کہ وہ میرے بغیر پاگل ہوجائے گا کسی قیمت پر اس کے پاس جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔

”کیا ہوگیا ہے اسے......؟“ مہارانی نے کہا اور آگے بڑھ کر وجے کو گود میں اٹھانے لگی......

”پیچھے ہی رہیئے مہارانی صاحبہ پیچھے ہی رہیے۔“ مالی نے چلا کر کہا۔

وجے کی آنکھوں کا رنگ بدل گیا، وہ بہت زور سے بھونکا اور وحشیانہ طور پر اس نے اچھل کر مہارانی پر حملہ کردیا اور ساڑھی کے پلو کو پھاڑتا ہوا ایک سمت میں بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے فوراً ہی مہارانی کو سنبھال لیا، ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ مسلسل اس سمت دیکھ رہی تھی۔ جدھر وجے غائب ہوا تھا۔

”کتوں کا کوئی اعتبار نہیں......“ بالآخر میں نے کہا۔

”کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی انوکھی بات دیکھی ہے۔“

چند لمحوں بعد ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ اس نے نرس کے متعلق ایک دو باتیں پوچھیں۔

پھر وہ حویلی میں واپس چلی گئی۔ اگلی صبح میں اس کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لئے حویلی چلا گیا۔

وہ پریشان معلوم ہورہی تھی۔ تاہم اس نے نرس کی جانب اطمینان کا اظہار کیا۔

وجے کے بغیر پورا کمرہ اجڑا ہوا معلوم ہورہا تھا۔ لیکن کمرے کے اجڑنے کی ایک یہی وجہ نہیں تھی۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں رکھے ہوئے سارے آئینے غائب تھے۔

”کیا کوئی دوسرا واقعہ ہوا؟ آپ کا عکس تو ٹھیک ہے نا......؟“

”آپ مجھ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کیجیے، میں نے طے کرلیا ہے کہ آئندہ کبھی اپنے آپ کو، وہم اور وسوسے کا شکار نہیں ہونے دوں گی، کبھی نہیں......“

چند روز بعد میں نرس سے ملا اور اس سے کہا وہ مجھے اپنی مریضہ کے متعلق تفصیل سے رپورٹ دے، کوئی ایسی خاص بات تو نہیں تھی جو وہ مجھے بتاتی، علاوہ اس کے کہ مریضہ بمشکل تمام رات کو گھنٹہ یا آدھے گھنٹے کے لئے سوتی ہے۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکیاں اور روشن دان بند کردیئے ہیں۔

”کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ وہ گرمی کے باوجود کھڑکیاں نہیں کھولتی......؟“

”جی نہیں، میں نے ایک دو بار انہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، خود میرا ان کے بند کمرے میں دم گھٹنے لگتا ہے۔......“

میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں مہارانی کو سمجھاؤں گا۔

''اس کے علاوہ مجھے ایک بات اور عرض کرنی ہے۔'' نرس نے کہا۔ ''آپ انہیں سمجھایئے کہ وہ ڈراموں کے ڈائیلاگ نہ بولا کریں.....''

''ڈراموں کے ڈائیلاگ.....؟''

''میں تو یہی سمجھتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''کبھی کبھی رات کے وقت وہ مجھ سے کہتی ہیں کہ میں انہیں فلاں کتاب یا فلاں چیز لادوں۔ جونہی میں باہر نکلتی ہوں وہ ڈائیلاگ بولنا شروع کردیتی ہیں۔ کبھی وہ چیخ پڑتی ہیں کبھی رونے لگتی ہیں، آپ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ ایسی پیاری خاتون سے اتنی بھیانک چیخیں بلند ہوسکتی ہیں، اور جب میں واپس آتی ہوں تو وہ خاموش اپنے بستر پر پڑی ہوئی ہانپ رہی ہوتی ہیں۔ آپ انہی مشورہ دیجئے کہ وہ خوفناک ڈائیلاگ بولنا اور چیخیں نکالنا بند کردیں۔ غالباً انہی دو چیزوں کے باعث ان کا اعصابی نظام درست نہیں ہے.....''

اسی سہ پہر کو میں اس سے ملنے گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

''معلوم ہوا ہے آپ رات کے وقت کھڑکیاں اور روشن دان بند کرلیتی ہیں، میں یہ مشورہ تو نہیں دیتا کہ ہمیشہ کھڑکیاں کھولے رکھیں البتہ گرمی کے موسم میں کھڑکیاں نہ کھولنے سے صحت پر بڑا اثر پڑسکتا ہے.....''

''اگر نرس نے آپ سے چغلی کھائی ہے تو میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتی۔'' اس نے غصے سے کہا۔ ''میں کھڑکیاں اور روشن دان کیسے کھلے چھوڑ سکتی ہوں..... میں کہ وہ..... وہ کھڑکیوں اور روشن دانوں سے جھانکتی ہے اور زور زور سے روتی اور چلاتی ہے.....''

اس کے بعد میری ہمت نہ پڑی کہ اس سے اس سلسلے میں مزید کوئی بات کروں، ہر بات خود بخود میری سمجھ میں آگئی تھی۔ تقریباً تیسرے یا چوتھے روز نرس رپورٹ دینے آئی تو میں نے مہارانی کی نیند کے بارے میں دریافت کیا۔ ''اب تو انہوں نے سونا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں پاگل ہی نہ ہوجائیں۔''

''کیا وہ اب بھی راتوں کو روتی اور چیختی ہیں.....؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ان کی چیخوں سے میرے جسم کا رواں رواں لرز اٹھتا ہے.....''

''جو کچھ وہ کہتی ہیں اسے سمجھ لیتی ہوں.....؟''

''وہ کہتی ہے مجھے اندر آنے دو۔ راستہ دو مجھے، میں جسم کے بغیر نہیں رہ سکتی تم کیا کرو گی اس جسم کا، اسے چھوڑ دو، مجھے جگہ ملنی چاہئے، یہ جسم تمہارا نہیں ہے میرا ہے، تو پھر ان کی چیخیں نکلنے لگتی ہیں...... ارے ارے ڈاکٹر صاحب کیا بات ہے آپ کس طرح سفید پڑتے جارہے ہیں.....''

☆......☆......☆

لرزتے قدموں کے ساتھ میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور وہاں پہنچ کر میں نے اپنی اٹیچی کیس سے وہ قلمی کتاب نکالی جو مہارانی اوشا دیوی کے دارالمطالعہ میں پرانی کتابوں کے ایک ڈھیر میں پڑی ہوئی تھی۔

یہ کتاب دیوناگری میں تھی اور میں اسے یہ سوچ کر لے آیا تھا کہ اس میں ایک صدی قبل کے کچھ تاریخی حقائق تحریر ہوں گے لیکن گزشتہ شب جب میں نے غیر ارادی طور پر اس کتاب کو کھولا تو معلوم ہوا کہ اس میں مہارانی اوشا دیوی کے خاندانی واقعات ہیں......

میں نے مختلف اوراق کو الٹنا پلٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ مندرجہ ذیل عبارت پر میری نظر پڑی جس کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

'......آج شکنتلا دیوی تیسری بار ختم ہوئی، پچھلی تین صدیوں سے اس نے ہمارے خاندانی وقار کو مٹی میں ملا رکھا ہے۔ یہ ہر صدی میں جنم لیتی ہے اور کسی نہ کسی مسلمان کی محبت میں گرفتار ہوجاتی ہے...... آج بھی وہ مرتے وقت یہی کہہ رہی تھی کہ میں نہیں مرسکتی میں اس سنسار میں دوبارہ آؤں گی...... اور اس وقت تک آتی رہوں گی جب تک میری آتما کی پیاس نہ بجھ جائے، ہم سب کی بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ وہ اب اسے نیا جنم نہ دیں......'

کتاب کا مسودہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، نرس نے جو کچھ کہا تھا، اس کے ایک ایک لفظ کی

تصدیق ہو رہی تھی۔

یقیناً یہ شکنتلا دیوی کی بھٹکی ہوئی روح تھی جو مہارانی اوشا دیوی کو تنگ کر رہی تھی۔

اس شام کو میں نے مہارانی سے کتاب کے بارے میں پوچھا کہ آیا اس نے اپنے خاندانی حالات پر مشتمل دیوناگری کی ایک قلمی کتاب کا مطالعہ کیا ہے تو اس نے نفی میں جواب دیا، میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کنور رانی شکنتلا دیوی کے متعلق کچھ معلوم ہے۔

"جی ہاں، مجھے اس کے بارے میں ساری باتیں معلوم ہیں...... میری طرح وہ بھی اکیس سال کی تھی، میری طرح اس نے بھی ایک مسلمان......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بات بدل کر بولی۔ "لیکن مجھے اپنے خاندانی حالات واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے آباؤ اجداد یہاں کے حکمران تھے، انہوں نے غریبوں پر ایسے ظلم ڈھائے کہ تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ کاش میں اس خاندان میں پیدا نہ ہوتی...... ایک بات اور بتاؤں۔ ہمارے خاندان میں شکنتلا جیسی تین لڑکیاں جنم لے چکی ہیں۔ ان تینوں نے اپنے اپنے زمانے میں خاندانی رسم و رواج سے بغاوت کی اور دور شباب میں ہی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ ہوسکتا ہے میں چوتھی ہوں، چوتھی اور آخری کیونکہ آج کوئی ایسا شخص نہیں جو میرے راستے میں حائل ہوسکے...... میں جو چاہوں کرسکتی ہوں......"

دو روز کے بعد میں اپنے مطب میں بیٹھا ہوا تھا کہ مہارانی کی وفادار خادمہ داخل ہوئی اور بولی۔ "ڈاکٹر صاحب وہ چلی گئیں......"

"کون مہارانی اوشا دیوی......؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں وہ آپ کی نرس چلی گئی۔ اس کا سارا سامان حویلی میں پڑا ہوا ہے۔ مالی کہہ رہا تھا کہ وہ جاتے وقت بری طرح چیخ رہی تھی اور اپنے ہاتھوں سے پاگلوں کی طرح اپنا لباس پھاڑ رہی تھی۔ مہارانی صاحبہ کہتی ہیں کہ انہوں نے اس سے کہا تھا کہ دودھ میں تھوڑا سا اوولٹین ملا کردے، اس کے بعد انہیں نیند آگئی اور انہیں نہیں معلوم کہ نرس پر کیا گزری۔"

اپنے باقی مریضوں کو نمٹا کر میں خادمہ کے ساتھ ہی حویلی پہنچا، مہارانی باغیچے میں ٹہل رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"افسوس کہ آپ کی نرس کو میں نے ڈرا دیا۔"

"آپ نے ڈرا دیا۔" میں نے پوچھا۔

"آپ نے؟"

"معلوم تو ایسے ہی ہوتا ہے کہ کیونکہ ایک تربیت یافتہ نرس اس طرح چیخی چلاتی کپڑے پھاڑتی ہوئی اس وقت بھاگ سکتی ہے جب وہ خوفزدہ ہوگئی ہو......"

"اسے دوئیاں لگ گئی ہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔ "بہر حال آپ کے لئے آج ہی کسی دوسری نرس کا انتظام کردوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب، لیکن اب مجھے کسی نرس کی ضرورت نہیں، میں نے اپنے کئی واقف کاروں کو تار بھیج دیئے ہیں کہ وہ کچھ دنوں کے لئے یہاں میرے پاس ہی آجائیں۔"

سہ پہر کو میں نرس کے ہاں پہنچا مگر اس کی ماں نے جو خود بھی نرس رہ چکی تھی اور ایک چیریٹی ہوم چلا رہی تھی اسے ملانے سے انکار کردیا......

"نہیں نہیں، ڈاکٹر صاحب آپ اس سے نہیں مل سکتے، وہ بیمار پڑی ہے اور اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ بہکی بہکی باتیں کررہی ہے مہربانی کرکے آپ اس کا سامان بھجوادیجئے......"

میں خاموشی کے ساتھ واپس ہوگیا۔ لیکن مطب پر آنے کے بجائے مناسب سمجھا کہ مہارانی کو نرس کا پتہ بتا کر آؤں تاکہ اس کا سامان اس کے گھر پر پہنچا دیا جائے، حویلی میں خادمہ نے مجھے ایک خط دیا، جس میں بغیر القاب کے تحریر تھا......

"میں جارہی ہوں...... میرا چلا جانا ہی ٹھیک ہے...... جب آپ کو یہ پرچہ ملے گا میں ٹرین میں سوار ہوچکی ہوں گی...... اب میں اس حویلی میں ایک رات بھی نہیں گزار سکتی...... مہربانی کرکے مجھ سے کسی اس بات کی

تشریح کرنے کے لئے نہ کہیں...... مختصر اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ زمین و آسمان میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کے متعلق ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں، میں آپ کو خط بھیجتی رہوں گی......اوشا......"

مجھے اس کے جانے کی تھوڑی خوشی ہوئی۔ صحت کے لئے تبدیلی آب و ہوا بہت ضروری تھی۔ مختلف شہروں سے مجھے اس کے خطوط موصول ہوتے رہے، لیکن کسی بھی خط میں اس نے کوئی بھی بات کھل کر نہیں لکھی۔ اس کے دل میں کیا تھا یہ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا، کبھی کبھی میرے قدم بے اختیار اس حویلی کی طرف اٹھ جاتے اور میں حسرت بھری نظروں سے اس کے در و دیوار کو تکتا رہتا۔ اور دل ہی دل میں سوچا کرتا کہ آیا میں کبھی اس سے دوبارہ ملاقات بھی کر سکوں گا، اسی دوران میں یہ افواہ پھیل گئی کہ مہارانی صاحبہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گی، اور ان کی حویلی کو جلد ہی کرائے پر اٹھا دیا جائے گا۔

مگر ایک صبح مجھے اس کا خط موصول ہوا جس پر لکھنو کے ڈاک کی مہر لگی ہوئی تھی۔

"آپ کے بغیر، ادھر ادھر بھٹک کر پریشان ہو چکی ہوں، میں آپ کے قدموں میں رہنا چاہتی ہوں، پیر کے دن عزت نگر پہنچ جاؤں گی۔ منگل کی صبح مجھ سے ضرور ملیے، میں سمجھتی ہوں کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں اپنے دل کی بات زبان پر لے آؤں، آخر کب تک اپنے اوپر ظلم کروں گی...... آپ کی اپنی......اوشا......"

اس خط نے مجھے سر سے پاؤں تک مست و بے خود کر دیا، وہ میری تھی۔ مجھ سے محبت کرتی تھی، میرے بغیر یہ دنیا اس کے لئے سنسان تھی، خود میرا اپنا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا، واقعی اب وقت آ گیا تھا کہ میں اپنے دل کی بات زبان پر لے آؤں اور اسے بتا دوں کہ اوشا جب سے تمہیں دیکھا ہے اسی روز سے تمہیں چاہنے لگا ہوں......

کس بے چینی کے ساتھ میں نے وقت گزارا...... اس کا بیان احاطہ تحریر میں نہیں آ سکتا، پیر کی رات بارہ بجے اچانک میری آنکھ کھل گئی، ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مجھے آواز دے رہا ہو، چھوٹی چھوٹی کنکریاں میری کھڑکی پر پھینکی جا رہی تھیں، میں نے جھانک کر دیکھا مہارانی اوشا دیوی کھڑی ہوئی تھی اور مجھے اشارے سے باہر بلا رہی تھی......

"جلدی کرو جلدی۔" اس نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے، جلدی کرو میری زندگی خطرے میں ہے......"

میں گرتا پڑتا ہوا باہر بھاگا...... دروازے کے پاس اپنے دونوں بازو پھیلائے ہوئے کھڑی تھی، میں اسے اپنی آغوش میں لینے کے لئے تڑپ اٹھا، مگر جونہی اس کے پاس پہنچا وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"بہت دیر لگا دی تم نے، بہت دیر لگا دی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔ "فوراً واپس چلے جاؤ، کہیں کوئی دیکھ نہ لے جاؤ......"

میں ایک ایسے شخص کی طرح کھڑا ہوا جس پر جادو کر دیا گیا ہو...... اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو، باقی رات میں نے کروٹیں بدل بدل کر گزار دی، ایک لمحہ کے لئے بھی نیند نہیں آئی، صبح کو دس بجے مطب پر اس کا فون موصول ہوا......

"آپ کو میرا خط مل گیا تھا......؟"

"جی ہاں......" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"پھر آپ تشریف کیوں نہیں لائے؟ جب سے آئی ہوں آپ کی ہی منتظر ہوں......"

میں نے سوچا کہ اسے رات والی بات یاد دلا دوں۔ مگر مطب میں مریض موجود تھے اس سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اسے بتایا کہ "ایک گھنٹہ کے اندر اندر حویلی پہنچ رہا ہوں......

جب میں اس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ حسب معمول اپنی آبنوسی مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائی اور اس طرح میرا خیر مقدم کیا جیسے سفر کے بعد پہلی مرتبہ مجھے دیکھ رہی ہو......

اس نے مجھ سے عزت نگر کے بارے میں سوالات کیے، ان لوگوں کا مزاحیہ انداز میں ذکر جن سے سفر کے

دوران میں پہلی دفعہ اس کی ملاقات ہوئی...... وہ بالکل ویسی ہی تھی، رقص کرتی ہوئی آواز، پیار بھری ہنستی مسکراتی آنکھیں...... مگر اچانک اس کی آنکھوں میں تبدیلی آگئی۔ اس نے مضبوطی سے میرے ہاتھوں کو پکڑلیا اور انتہائی عجیب اور سنجیدہ آواز میں کہنے لگی......

''آسمان اور زمین ہم دونوں کے دشمن ہیں، میں کب تک تمہاری تلاش میں ماری ماری پھروں گی، صدیاں کتنی گزر گئی ہیں، تم مجھ سے ملتے ہو پھر کھو جاتے ہو آخر کب تک یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل جاری رہے گا میرے احسان......''

میں نے اسے تسلی دی۔

''سب ٹھیک ہوجائے گا...... آپ پرواہ نہ کریں......''

''ارے احسان۔'' وہ ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''آج میں نے اپنی ساری سکھیوں، سہیلیوں کو ڈرادیا...... تم فوجی سپاہی ہو...... تم کیا جانو، یہ لڑکیاں اپنی چالاکی سے سب کچھ قبول کروالیتی ہیں، مگر میں نے...... میں نے انہیں ایسا دھوکہ دیا ہے کہ یاد کریں گی وہ بھی...... یہ تم نے فرنگیوں جیسے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں...... فرنگی تو ہمارے دشمن ہیں ناں......؟''

میں آہستہ آہستہ اسے تھپکیاں دیتا رہا، پھر اچانک وہ جس طرح بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی، اسی طرح اچانک ہوش میں آگئی۔

''اتنے طویل سفر کے بعد بہت تھک گئی ہوں۔'' اس نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''گھر آگئی ہوں مگر ایسا معلوم ہورہا ہے جیسے نئی جگہ کی سیر کرتی پھر رہی ہوں، آپ جایئے مریض آپ کا انتظار کررہے ہوں گے...... لیکن شام کو ضرور تشریف لائیں......''

شام ہونے کی نوبت نہیں آئی، دوپہر کو خادمہ کا فون موصول ہوا۔ ''فوراً آجایئے ڈاکٹر صاحب۔ مہارانی صاحبہ کی حالت بہت خراب ہے۔ میرا خیال ہے کہ بھگوان نہ کرے، مر رہی ہیں......'' پھر اچانک فون پر اس کی چیخ سنائی دی اور ایسا معلوم ہوا کہ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا ہے......

میں بہت تیزی کے ساتھ حویلی کی طرف لپکا اور وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ مہارانی کا سانس ٹوٹ چکا ہے اور وہ اپنی آخری جدوجہد کررہی ہے کہ موت کو شکست دے سکے، میں نے فوراً ایک انجکشن بیگ سے نکال کر اسے لگایا، ایسا لگتا تھا کہ جسم کا سارا خون نچوڑا جاچکا ہے...... انجکشن لگتے ہی اس کا سارا جسم تھر تھرایا۔ پھر مہارانی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں۔ آنکھ کی پتلیاں اس کے قابو میں نہیں تھیں۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے......

''میں جیت گئی ہوں ڈاکٹر صاحب۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''اب وہ میرا جسم ہرگز نہیں چھین سکتی۔ مجھے اپنے بازوؤں میں چھپالیجئے...... اور مجھے پیار کیجئے۔ میں آپ سے پیار کرتی ہوں۔ دل ہی دل میں آپ کی پوجا کرتی رہی ہوں......''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا، ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں نے اپنا چہرہ آگے بڑھا کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر زندگی کا پہلا اور آخری پیار کیا۔ اس کے دونوں ہونٹ مسکرا اٹھے، آنکھیں بند ہوگئیں، ایک معمولی سی ہچکی منہ سے نکلی اور وہ بے حس و حرکت ہوگئی۔

اس کے بعد میں عزت نگر میں نہ ٹھہر سکا۔ اپنے مطب واپس چلا گیا۔

اس دوران پاکستان بن گیا اور میں ہجرت کرکے یہاں منتقل ہوگیا۔ مگر آج تک مہارانی اوشا دیوی کی یاد میرے دل میں جوں کی توں باقی ہے، اور اب بھی مجھے اس کا انتظار ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی روز کسی نہ کسی گلی سے وہ مسکراتی ہوئی آہستگی سے ضرور آئے گی۔ پچھلے چار جنم سے وہ میری تلاش میں ہے۔ لیکن پانچویں جنم میں...... اسے مایوسی نہیں ہوگی، جو آگ صدیوں سے اس کے دل میں سلگ رہی ہے۔ اب وہ میرے دل کو بھی جلارہی ہے۔ اس کی ''یادیں'' ہی تو میرا سب کچھ ہیں......

جادوئی بساط

آصفہ سراج-لاہور

خوبرو حسینہ عمل کے ورد کے لئے کمرے میں گئی اور باہر کھڑے لوگوں نے باہر سے دروازے کی کنڈی لگادی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب کمرے مین کھٹکے کی آواز سنائی دی تو دروازہ کھولا گیا مگر یہ کیا خوبرو حسینہ غائب تھی۔

سینے میں سلگنے والی حسد کی آگ اکثر حاسد کو جلا کر بھسم کردیتی ہے-ثبوت کہانی میں ہے

گرمی سے نڈھال، یونیفارم میں ملبوس وہ کالج سے گھر لوٹی تو سامنے ڈرائنگ روم میں خالہ آمنہ اور ازمیر بیٹھے تھے۔ ازمیر کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی جو اکثر فاریہ کو دیکھتے ہی عود کر آیا کرتی تھی۔ اب کی بار بھی فاریہ نے وہ چمک دیکھی اور دل مسرور ہوگیا۔ ''السلام علیکم۔'' اس نے اندر جا کر سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' خالہ اٹھیں اور فاریہ کا ماتھا چوم لیا۔

''کیسی ہے میری بیٹی؟''

''میں ٹھیک ہوں خالہ، اف کتنی گرمی ہے آج۔ میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔''

''مما، فاریہ، فاریہ۔'' تنزیلہ آپی اسکے پیچھے چلی آئیں۔

''یہ کیا حرکت ہے۔ اب میں نے کیا کردیا۔'' وہ جھنجلا کر بولی۔

"فاریہ، یہ تم کس طرح کی بات کررہی تھی، تم کیوں سمجھ نہیں رہی ہو کہ خالہ کس مقصد سے آئی ہیں۔"

"اب مجھے کیا پتہ کہ وہ کس مقصد سے آئی ہیں؟"

"بے وقوف ہو تم اور کچھ نہیں، ارے میرے پیاری بہنا اور کچھ نہیں یہ تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔" آپی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بتایا۔ جب کہ فاریہ یکدم خاموش ہوگئی۔

"کیا۔"

"ہاں...... اور ہم سب جانتے ہیں کہ ازمیر تم سے کتنا پیار کرتا ہے اور اس لئے ہم اور خالہ چاہتے ہیں کہ......"

"آپ نے یہ کیسے سوچا کہ میں ان سے شادی کروں گی۔" وہ بولی۔

"کیوں؟ نہیں کروگی شادی۔" ازمیر میں کیا کمی ہے، گڈلکنگ ہے ویل ایجوکیٹڈ ہے۔ کیئرنگ اور لونگ اور سب سے بڑی بات کہ وہ تمہیں بے انتہا چاہتا ہے۔" تنزیلہ نے بتایا۔

"میں مانتی ہوں، لیکن ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس پرپوزل میں ایک رکاوٹ ہے۔ اور وہ ہے ان کی بھابی راحیلہ۔" وہ سلگ کر بولی۔

تنزیلہ حیران رہ گئی۔ "کیا...... وہ تو اتنی کیئرنگ ہیں تم سے اتنا پیار کرتی ہیں۔"

"ہاں یہی تو مصیبت ہے، تم سب کو تو وہ اتنی ہی پیاری لگے گی، کیوں کہ اس نے جادو جو کررہا ہے، سب لوگوں پر جسے دیکھو وہ اسی کے گن گاتا پھرتا ہے۔ سب گھر والوں کو پتہ نہیں کیا گھول کر پلایا ہے، کہ ہر کوئی اس کی تعریفیں کرتا نہیں تھکتا۔" اس کے لہجے میں راحیلہ بھابی کے لئے اتنی کڑواہٹ تھی کہ تنزیلہ سن رہ گئی۔

"اب دیکھنا ڈرائنگ روم میں راحیلہ بھابی کے گن گایا جارہا ہوگا۔ خالہ کو تو اس پوری دنیا میں اپنی بہو کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔ میری راحیلہ ایسی میری راحیلہ...... یہ...... راحیلہ، مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ کیسے جادوگرنی نے سب کو اپنے پیچھے لگایا ہوا ہے۔"

"تنزیلہ...... تنزیلہ......" کچن سے آتی امی کی آواز نے اسے کچھ کہنے کا موقع نہ دیا اور وہ تاسف سے فاریہ کو دیکھتے ہوئے کھڑی ہوگئی اور کچن میں چلی گئی۔

فاریہ کے بدلتے رویے سے وہ بے حد پریشان تھیں، فاریہ کے لبوں پر ایک سنجیدہ سی مسکراہٹ آگئی دراصل فاریہ انتہادرجے کی مغرور اور گھمنڈی لڑکی تھی۔ مگر دل ہی دل میں ازمیر سے پیار کرتی تھی۔ مگر ازمیر کرن نام کی لڑکی میں انٹرسٹڈ تھا یہ جان کر تو جیسے فاریہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ وہ ازمیر کو پانے کے لئے کسی بھی حد تک جاسکتی تھی۔

ایک دن کالج سے واپس آتے ہوئے اس نے فٹ پاتھ پر ایک بورڈ لگا دیکھا۔ بنگالی بابا (پامسٹ) ہر قسم کی دل کی آرزو پوری ہوگی۔ پتھر دل محبوب کا دل آپ کے قدموں میں...... اس قسم کی اور بھی باتیں...... بس پھر تو اس کے ذہن اور دل نے اس راستے کو تسلیم کرلیا۔ جسے اپنا لینے سے ایمان خراب ہوجاتا ہے وہ دو دن بعد ہی بنگالی بابا کے آستانے پر جا پہنچی اور اپنی آرزو بتائی...... وہ ہر روز جاتی رہی اور بابا اس سے اچھی خاصی رقم بٹورتا رہا اور پھر ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں اس کے ان تعویزات نے اثر دکھانا شروع کردیا جو اس نے ازمیر کو کھانے پینے کی چیزوں میں ملا کر کھلائے تھے۔

جس لڑکی سے ازمیر پیار کرتا تھا اس نے ازمیر کو اپنے ایک لندن کے کزن کے لئے ٹھکرادیا تھا، جس پر ازمیر نہایت دلبرداشتہ ہوگیا تھا۔ مگر جیسے سب لوگ سمجھ رہے تھے کہ یہ کرن کے پیار کا روگ لے لے گا، حقیقت اس کے بالکل الٹ ہوئی، وہ اس صدمے سے بہت نارمل انداز میں نکل آیا اور آہستہ آہستہ فاریہ کے پیار میں کھو گیا سب بہت خوش تھے۔

مگر نجانے کیوں فاریہ کو خالہ کی بہو راحیلہ سے سخت چڑ تھی۔ جب خالہ کے گھر کے لوگوں کے علاوہ خود اس کے گھر والے بھی راحیلہ کی تعریف کرتے تو وہ مزید چڑ جاتی اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگتی۔

بنگالی بابا کے پاس جانے سے اس کا ازمیر والا مسئلہ تو حل ہوگیا مگر اسے راحیلہ سے سخت پریشان تھی

اور وہ اسے سب کی نظروں سے گرانا چاہتی تھی۔ جس پر اس نے بنگالی بابا سے ایک خاص عمل سیکھنے کا ارادہ کیا۔ بنگالی بابا نے اسے سمجھایا کہ بچی تمہارا مقصد پورا ہوگیا ہے۔ بس اب اس سے زیادہ کوئی تمنا نہ کرو۔

مگر وہ نہ مانی اس طرح ایک بھاری رقم کے عوض وہ اسے ایک خاص عمل سکھانے پر راضی ہوگیا، جس کے ذریعے وہ جو چاہے اچھا برا کرسکتی تھی۔

بنگالی بابا نے اسے اس کام کے لئے ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس دیا جس میں کچھ چیزیں تھیں، ایک شطرنج کے جیسی ہی بنی ہوئی عجیب سی بساط تھی، جس پر چھوٹی چھوٹی ڈبیاں بنی ہوئی تھی، جس میں عجیب عجیب سی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ چند لیموں اور سرخ رنگ کا ایک سفوف تھا جس کو اس نے عمل کے دوران استعمال کرنا ہے۔ جس کے ساتھ جو کرنا ہو وہ بساط کو بچھا کر درمیان والی ڈبی کے اوپر اس شخص کا نام اس چوک سے لکھنا ہے، جو بابا نے اسے دیا تھا اور پھر جو اس شخص کے بارے میں دل میں سوچے گی وہ بات پوری ہوجائے گی۔

''مگر یاد رکھنا کہ اگر کوئی شخص ان چیزوں کی وجہ سے موت کے دہانے پر پہنچ جائے تو پھر اس کی جان بچانے کے لئے تمہیں بہت بڑی قربانی دینی ہوگی اس لئے ان چیزوں کو استعمال کرنے میں اس حد تک نہ جانا کہ یہ نوبت آجائے۔'' بنگالی بابا نے ان چیزوں کو دیتے ہوئے فاریہ کو خاص ہدایت کی تھی۔

فاریہ ان چیزوں یعنی اس بکس کو بڑی احتیاط کے ساتھ گھر لے آئی تھی، اور اپنے کپڑوں والی الماری کے پیچھے بنے خفیہ کیبن میں اس بکس کو چھپادیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھی، وہ جو چاہتی تھی وہ ہوگیا تھا۔

ازمیر اس کے پیچھے دیوانہ وار پاگل تھا۔ مگر اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی وہ یہ کہ ازمیر بھی اپنی بھابھی راحیلہ سے بہت محبت کرتا تھا اور ان کا بہت احترام اور عزت کرتا تھا۔ جس سے فاریہ کے دل میں بہت جلن ہوتی تھی، مگر بظاہر وہ ان سے مسکرا کر ملتی تھی، کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اتنے معصوم چہرہ کے پیچھے

آخر کیوں؟

☆ ایڈیٹر جو اپنے مراسلہ نگاروں اور اپنی بیوی بچوں کی رائے سے کبھی متفق نہیں ہوتا۔

☆ عورت جو اپنے آپ کو مرد سے زیادہ عقل مند تصور کرتی ہے جبکہ عورت کے دماغ کا وزن 14.52 اور مرد کا 15.21 اونس ہوتا ہے۔

☆ آج کا نوجوان ٹریفک سنگل پر سبز بتی ہونے کا انتظار نہیں کرسکتا مگر محبوبہ کے گھر کے سامنے سخت دھوپ میں گھنٹوں کھڑا رہ سکتا ہے۔

☆ آج کل لوگ موت سے کم اور بیویوں سے زیادہ اس لئے بھی ڈرتے ہیں کہ موت کا سامنا صرف ایک بار کرنا پڑتا ہے مگر بیوی کا......

☆ آج کے جدید دور میں لوگ شکل کو اہمیت دیتے ہیں جبکہ انسان عقل سے پہچانا جاتا ہے شکل سے نہیں۔

☆ آج کے دور میں ملک الموت کا ذکر اچھی سوسائٹی میں پسند نہیں کیا جاتا۔

(راجہ باسط مظہر۔ حامد جھنگی)

کتنا خوف ناک عزم ہے۔

اس دن بھی خالہ کے گھر والے فاریہ کے گھر آئے ہوئے تھے۔ ازمیر، فاریہ، راحیلہ اور تنزیلہ چاروں لوڈو کی گیم لگا رہے تھے کہ اچانک ازمیر کہہ بیٹھا کہ ''راحیلہ بھابھی سے کوئی نہیں جیت سکتا۔''

بس پھر کیا تھا فاریہ نے چیلنج کر دیا اور یوں فاریہ اور راحیلہ بھابھی میں گیم شروع ہوگئی، شروع شروع میں فاریہ بہت خوش تھی کہ گیم اس کی مرضی کے مطابق چل رہی تھی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ فاریہ کا جوش کم ہوتا گیا کہ راحیلہ بھابھی کی ایک گوٹ نے اس کی دو گوٹ کو اکٹھی مات دے دی تھی مگر اس سے پہلے کہ راحیلہ بھابھی جیت جاتیں فاریہ نے غصے میں لوڈو دور پھینک دی، جس پر ازمیر بہت ہنسا اور کہا۔ ''میں نے کہا تھا ناں کہ راحیلہ بھابھی کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔'' جس پر وہ غصے میں آ گئی اور کمرے سے نکل گئی۔

اس وقت ان سب نے اس کے غصے کی وجہ اس کی ہار کو سمجھ لیا تھا، اور بات آئی گئی ہوگئی تھی۔ مگر اس کے چہرے کے پیچھے مکروہ چہرہ کو کوئی نہ دیکھ سکا۔ اس کے دل میں اور کدورت بھر گئی۔

اس دن بھی وہ چپ چاپ خاموش بیٹھی تھی کہ امی چلی آئیں۔ ''فاریہ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ میں کچھ دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم کچھ اپ سیٹ ہو۔''

''میں ٹھیک ہوں مما۔'' وہ بمشکل مسکرا پائی۔ ''آپ کہیں جا رہی ہیں؟''

''ہاں میں آپا کی طرف جا رہی ہوں۔'' خالہ کا ذکر سن کر فاریہ کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کر گزرا پھر سنبھل کر بولی۔ ''کیوں خیریت تو ہے؟''

''نہیں آپا کو بہت تیز بخار ہے، صبح فون کیا تو راحیلہ سے پتہ چلا سوچا ذرا دیکھ آؤں۔ پھر تمہارے پاپا کے ساتھ گاؤں جانا ہے ان کے ماموں کا انتقال ہوگیا ہے، تعزیت کے لئے جانا ہے۔''

''کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟'' فاریہ خالہ کا سن کر فکر مندی سے بولی۔

''ہاں راحیلہ کافی پریشان تھی۔ ازمیر اور عدنان بھی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ کمپنی کی طرف سے شہر سے باہر گئے ہیں۔''

''میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔'' زبان سے نجانے کیسے نکل گیا جس سے مما خوش ہوگئیں اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

خالہ کے گھر جا کر فاریہ جان بوجھ کر کام میں لگ گئی کہ خالہ کی تعریفیں سمیٹ سکے۔ اب وہ چھوٹے لیکن صاف ستھرے کچن میں کھڑی خالہ کے لئے دلیہ بنا رہی تھی۔ ''لیجیے خالہ میں دلیہ بنا لائی اب پتہ نہیں کیسا بنا ہے کیونکہ مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔''

''اچھا ہی بنا ہوگا کیونکہ میری بیٹی نے خود اپنے ہاتھوں سے جو بنایا ہے۔'' اس کے ہاتھ سے پیالہ لیتے ہوئے خالہ بولیں۔

''تم بھی کیا سوچتی ہوگی کہ گھر میں کام نہیں کیا۔ یہاں خالہ کے گھر کتنے کام کرنے پڑ رہے ہیں۔''

''ارے نہیں خالہ جان میں ایسا نہیں سوچتی۔''

وہ پل بھر میں شرمندہ ہوگئی اس نے نظر بچا کر پل بھر کے لئے راحیلہ کو حقارت کی نظر سے دیکھا، مگر وہ خالہ کو اپنے ہاتھوں سے پانی پلانے میں مصروف تھی اس کی طرف متوجہ نہ تھی ورنہ اس کی نظروں میں اپنے لئے نفرت دیکھ کر حیران رہ جاتی وہ سادہ دل پر خلوص دل لڑکی تھی۔ سب سے خوش ہو کر ملتی تھی۔

آخر وہ دن آ ہی گیا جب فاریہ دلہن بن کر ان کے گھر کے صحن میں اتری سب لوگ بہت خوش تھے خاص کر ازمیر بہت خوش تھا اور اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا، مگر پھر اچانک ہی راحیلہ بھابھی نے ازمیر کو کسی کام کے لئے آواز دی۔ تو وہ اس کو بھول بھال کر ان کی بات سننے چلا گیا جس پر فاریہ شدید پیچ و تاب کھا گئی۔

دن گزرتے رہے۔ اور وہ اندر ہی اندر کڑھتی چلی گئی، ہر کوئی یہاں تک کہ گھر والے کے علاوہ باہر والے بھی سب راحیلہ کے گرویدہ تھے، گھر کے ہر کام میں راحیلہ کی ہی چلتی تھی۔ جو وہ کہتی وہی ہوتا، سب اس

سے بے حد خوش تھے، مگر نالاں تھی تو صرف فاریہ ہی تھی، جو بری طرح حسد میں مبتلا ہوگئی تھی، سچ تو یہ تھا کہ راحیلہ نے واقعی میں گھر کو بہت اچھی طرح سنبھالا ہوا تھا اور فاریہ کو بھی ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھ رہی تھی مگر فاریہ اس کے پیار کو سازش سمجھتی اور سوچتی کہ اس لئے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی کہ پھر اس کی تعریفیں کون کرے گا اور اس کی حکمرانی ختم ہو جائے گی۔

ان سب باتوں کے برخلاف راحیلہ فاریہ کو اپنی چھوٹی بہن سمجھتی تھی اور فاریہ راحیلہ کو اپنی دشمن۔ دن گزرتے رہے اور سسرال میں راحیلہ کی قدر و عزت دیکھ کر فاریہ غصے میں پاگل ہوگئی تھی۔

اچانک اسے اپنے اس بکس کا دھیان آیا جو اس نے بنگالی بابا سے لیا تھا وہ شادی کے 3 ماہ بعد ہی اس بکس کو گھر لے آئی تھی کہ کسی کو اس پر کوئی شک نہ ہوا۔ وہ بکس اس نے اسی گھر کے اسٹور روم میں اپنے جہیز کی ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے چھپا کر رکھ دیا تھا۔ اب اچانک ہی اس بکس کا دھیان آتے ہیں اس کے چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ آگئی جو 7 ماہ سے اس کے چہرے پر سے غائب تھی۔

خالہ کا گھر بہت خوب صورت تھا اور 2 کنال پر محیط تھا۔ اس کوٹھی نما گھر میں اتنے کمرے تھے کہ کسی کو ٹھیک سے پتہ بھی نہ تھا۔ اس گھر کے باہر بنے لان میں سے گزر کر راہ داری کے بیچوں بیچ میں سب کمرے ہی بے مصرف تھے اور بند تھے ان میں سے ایک کمرے کو فاریہ نے اپنے مشن کے لئے چن لیا۔ اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگی جو کہ اسے ملنا مشکل نہ تھا۔

ازمیر اور عدنان اپنے آفس چلے جاتے تھے اور دوپہر میں سب لوگ آرام کی غرض سے اپنے اپنے کمروں میں سو جاتے اس کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا یہ سب کرنا سب ملازم بھی اس وقت اپنے اپنے کوارٹر میں آرام کر رہے ہوتے۔

آخر ایک دن دوپہر کے وقت سب کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ اپنا بکسہ اٹھا کر لان میں سے گزر کر اس کمرے میں آگئی جس کا اس نے انتخاب

زندگی

زندگی ایک امتحان ہے جو نا چاہتے ہوئے بھی ہر کسی کو دینا پڑتا ہے، زندگی نفرت، محبت، خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت ہے۔ زندگی تلخ حقیقتوں کو روشناس کروانے کا نام ہے۔ زندگی موت تک جاری رہنے والا سفر ہے۔ زندگی انسان کو دنیا کے اسٹیج پر کٹھ پتلیوں کی طرح نچوانے کا نام ہے۔ یہ ہے۔ زندگی!

(بلقیس خان۔ پشاور)

کیا تھا اور اندر جا کر دروازہ بند کر لیا، بکس کھول کر بساط بچھائی اور کوڑیاں بساط میں پھینک کر منتر پڑھنا شروع کر دیا حیرانی کی بات یہ تھی کہ 7 ماہ تک کے عرصے میں وہ منتر بھول گئی تھی، مگر جیسے ہی بکسہ کھولا اس کے ہونٹ خود بخود ہی ہلنا شروع ہو گئے، اور وہ دل ہی دل میں کچھ سوچ کر خوش ہوگئی اور اپنا منتر پورا کر کے اٹھ گئی۔

اس منتر کی یہ بات تھی کہ منتر پڑھنے کے بعد انسان جو چاہے کر سکتا ہے، جس چیز کو ٹھیک کرنا ہو اور جس چیز کو خراب کرنا ہو...... وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھی، گھر آ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اس کی ساس یعنی خالہ کا کمرہ تھا وہ احتیاط سے اوپر گئی اور سرف ملا پانی ماربل کی سیڑھیوں پر پھیلا دیا۔ جانتی تھی کہ خالہ اٹھنے والی ہیں اور پھر اپنے کمرے میں واپس آ کر سکون سے لیٹ گئی اور پھر وہی ہوا جو فاریہ چاہتی تھی۔ ساس کی آواز پورے گھر میں گونجنے لگی وہ بری طرح چیخ رہی تھیں۔

فاریہ جلدی سے اٹھی اور باہر گئی تو دیکھا کہ اس کی ساس سیڑھیوں کے پاس گری پڑی ہے۔ اس کے پہلے کہ وہ ان تک پہنچتی راحیلہ بھابھی نے جلدی سے آ کر ساس کو سنبھلنے میں مدد دی اور انہیں سہارے سے لئے ہوئے ڈرائنگ روم میں بچھی چار پائی پر لٹا دیا۔ وہ

وہیں کھڑی رہ گئی مگر راحیلہ بھابھی کے آواز دینے پر وہ ساس کے پاس گئی اور جلدی سے ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ دوائیاں دی انجکشن لگایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا خالہ کی کمر میں بری طرح چوٹ لگی تھی اور وہ ہلنے جلنے سے بھی معذور تھیں راحیلہ بھابھی جیسے ان کی کمر کا مساج کرتیں وہ چیخنے لگتیں پھر بھی راحیلہ بھابھی 3 ٹائم خالہ کی کمر کی مالش کرتی۔ مگر کوئی فرق نہ پڑا۔

ایک دن فاریہ بولی۔ ”آج امی کی کمر کی مالش میں کروں گی اور سفید رنگ کا لیپ جو وہ بکس میں سے لائی تھی ساس کی کمر میں ملنا شروع کیا حیران کن بات یہ تھی کہ فاریہ کے مالش کرنے سے ان کے درد میں حیرت انگیز کمی ہوئی یہ بات نہایت خوش کن تھی اور پھر خالہ نے فاریہ کو دل کھول کر دعائیں دیں کہ فاریہ کے ہاتھ لگانے کی دیر تھی درد رفو چکر ہوگیا وہ فاریہ کے صدقے واری ہونے لگیں اور فاریہ مغرور ہونے لگی وہ بے حد مسرور تھی کہ اس کی ساس اور اس کے سب گھر والے اس سے بے حد خوش ہوتے اور وہ بھی بے انتہا خوش تھی۔

ازمیر تو بار بار اس کا ہاتھ پکڑ کر خوشی کا اظہار کر رہا تھا، وہ بھی جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی، ازمیر عدنان اور باقی سب گھر والے اس سے خوش تھے، آپ پہلی بار سب کے منہ سے اپنی تعریف سن رہی تھی خالہ ساس اگلے ہی دن اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئیں۔

اسی طرح آہستہ آہستہ وہ گھر کے کاموں میں بھی مداخلت کرنے لگی مگر اب کی بار بھی راحیلہ بھابھی کا پلڑا بھاری رہا۔ ایک دن فاریہ کچن میں کام کر رہی تھی اب وہ اکثر و بیشتر منتر کے ذریعے اپنے چھوٹے موٹے کام نکلواتی رہتی تھی اور اپنے اس کام یعنی اس کامیابی پر بے حد نازاں رہتی۔

ایک دن اس کے ساتھ اس کی نوکرانی نازو بھی کچن میں تھی دیگچی میں اس نے آلو ابالنے کے لئے رکھے تھے جو کہ اچھے خاصے ابل چکے تھے۔ اور کھولتا ہوا پانی بھاپ چھوڑ رہا تھا غضب جب ہوا جب اس نے دیگچی کو چولہے سے اتارے بغیر کھولتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک کرکے سارے آلو سلیب پر رکھے اور نوکرانی کو چھیلنے کو کہا۔ مگر وہ یہ سب کچھ دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی اور بھاگتی ہوئی باہر چلی گئی مگر شومئی قسمت اس کا پیر پھسلا اور وہ زور سے منہ کے بل گری اور اس کا سر گلدان سے ٹکرا گیا پورے فرش پر خون پھیل گیا جب نازو کی آنکھ کھلی تو اس کے سر پر پٹی بندھی تھی اور اس کے اردگرد سب گھر والے جمع تھے، سب نے اس کے ہوش میں آنے پر شکر ادا کیا اور ایک ایک کر کے سب چلے گئے، مگر فاریہ نازو کو کھڑی گھور رہی تھی نازو اسے دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگی تو فاریہ نے کہا ”اگر زندگی چاہتی ہے تو کسی سے کچھ مت کہنا۔“ نازو خاموش ہوگئی۔

مگر پھوٹی قسمت ایک دن فاریہ اسی کمرے میں بساط پر موم بتی وغیرہ جلا کر بیٹھی ہی تھی کہ وہاں راحیلہ بھابھی آگئیں فاریہ انہیں دیکھ کر پریشان ہوگئی اور منتیں کرنے لگی کہ کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ انہیں یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا اور انہوں نے فاریہ کو بہت برا بھلا کہا۔ لیکن فاریہ معافی مانگنے لگی کہ کسی سے کچھ نہ کہنا میں یہ سب چھوڑ دوں گی تو راحیلہ بھابھی نے اسے معاف کر دیا، مگر اس کے دل میں راحیلہ بھابھی کے خلاف تنفر بھر گیا پھر اس نے راحیلہ بھابھی کو ختم کرنے کا ارادہ کیا اور پھر کچھ دن سکون سے گزارنے کے بعد پھر سے اپنے گھٹیا کام میں لگ گئی۔

اب کی بار اسے راحیلہ بھابھی کو مارنے کا پلان تھا، اس کے اندر دیورانی اور جٹھانی کا ازلی جلاپا موجود تھا، اور یوں اس نے چوری چھپے اپنے اس گھناؤنے کام کی شروعات کر دی اور آہستہ آہستہ راحیلہ بھابھی کی طبیعت بگڑنے لگی...... سب اسے موسم کی خرابی سمجھتے رہے مگر یہ سب اس تعویز گنڈوں کے اثرات تھے جو فاریہ سب سے چوری چھپے ان پر کرتی تھی۔

آہستہ آہستہ راحیلہ کی طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی گئی سب گھر والے ان کی وجہ سے بہت پریشان تھے ہر ڈاکٹر بڑے سے بڑے شہر کے ڈاکٹر کو دکھایا کئی ٹیسٹ وغیرہ کروائے مگر بیماری سمجھ میں نہ آئی۔ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

راحیلہ بھابھی سوکھ کر کانٹا ہوگئی اب ان کا چلنا پھرنا بھی دوبھر ہوگیا تھا۔

ایک دن نازو چوری چھپے ایک پہنچے ہوئے بزرگ کو لے آئی ازمیر اور عدنان اور خالہ کے سامنے روتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اگر میں آپ لوگوں کو یہ سب کچھ پہلے بتادیتی تو راحیلہ بھابھی کبھی ان حالات کو نہ پہنچتی۔'' سب حیران و پریشان ہوگئے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

بزرگ نے کہا۔ ''پریشان نہ ہوں آپ کی بہو ٹھیک ہوجائے گی اور آنکھیں بند کرکے پڑھائی کرنے لگے پھر یکدم آنکھیں کھول کر بولے۔'' تمہارے ہی گھر کا کوئی فرد ہے جو یہ سب کچھ کررہا ہے گھبراؤ نہیں پتہ چل جائے گا تم سب گھر والے یہاں جمع ہوجاؤ۔''

سب گھر والے اکٹھے تھے مگر فاریہ کا پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے بزرگ نے آنکھیں بند کیں اور اپنے ہاتھ میں ایک رسی لے کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے رہے پھر اچانک ہی رسی زمین پر گرگئی اور چلنے لگی بزرگ نے سب کو اشارہ کیا کہ وہ سب لوگ پیچھے آجائیں۔

اور یہ کیا رسی کے پیچھے چلتے ہوئے سب لوگ آگے بڑھنے لگے لان کے پیچھے بنے ہوئے کمروں کے باہر جاکو رسی رک گئی۔

بزرگ گرجدار آواز میں بولے۔ ''کون ہے اندر؟''

ازمیر نے دروازے کو زور سے دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا۔

مگر یہ کیا سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے سب سکتے میں آگئے فاریہ بوکھلائی ہوئی اپنی بساط اور اس کا سامان سمیٹنے کی کوشش میں تھی۔

سب لوگ یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے ازمیر نے آگے بڑھ کر فاریہ کے منہ پر زوردار طمانچہ مارا خالہ بھی یہ سب کچھ دیکھ کر انتہائی صدمے کی کیفیت میں تھیں۔

ازمیر نے فاریہ کو بری طرح مارنا پیٹنا شروع کردیا۔ ''گھٹیا عورت ذلیل یہ ہے تیری اصلیت...... تو نے ہی ہماری بھابھی کو اس حال تک پہنچانے والی۔''

فاریہ سب کے قدموں میں جاپڑی اور رونے اور معافی مانگنے لگی گڑگڑانے لگی۔ ''اللہ کے واسطے دیئے کہ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔

ازمیر چلایا۔ ''گھٹیا عورت غلطی نہیں گناہ کہو۔ تم مسلمان نہیں رہیں۔''

وہ روتی رہی۔

سب لوگ بزرگ کو دیکھنے لگے اور انہیں کہنے لگے۔ ''راحیلہ کو کسی طرح سے ٹھیک کریں۔ مگر بزرگ نے مایوسی سے نفی میں سرہلادیا'' یہ میں نہیں کرسکتا یہ میرے بس میں نہیں۔

اچانک فاریہ بول اٹھی۔ ''میں انہیں ٹھیک کرسکتی ہوں۔''

ازمیر نے اسے دھکا دیا اور کہنے لگا کہ ''اب ہم تجھ پر یقین نہیں کریں گے۔''

مگر بزرگ کہنے لگے۔ ''ہاں یہ سچ کہہ رہی ہے کہ یہی آپ کی بہو کو ٹھیک کرسکتی ہے۔''

پھر فاریہ بولی۔ ''مجھے ایک موقع تو دیں مجھے معاف کردیں میں نے بہت گناہ کرلئے مگر اب میں ہی راحیلہ بھابھی کو ٹھیک کروں گی۔''

تو بزرگ نے اشارہ کیا تو سارے لوگ بزرگ کے اشارے پر گھر والوں نے راحیلہ کے پاس فاریہ کو اسی کمرے میں رہنے دیا بلکہ باہر سے کنڈی لگادی۔

فاریہ نے سچ کہا تھا کہ راحیلہ کی بیماری کا توڑ بھی صرف اسی کے پاس تھا۔ صرف 15 منٹ بعد ہی راحیلہ بھابھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہوگئیں اور بالکل ٹھیک ہوگئیں۔

مگر جب گھر والے فاریہ کو دیکھنے کے لئے کنڈی کھول کر اس کمرے میں گئے تو فاریہ کہیں نہیں ملی۔

وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، فاریہ کا کوئی اتا پتہ نہیں اور راحیلہ بھابھی آج بھی سب لوگوں کی آنکھ کا تارا بنی ہوئی ہیں۔ سب لوگ یہی سوچتے ہیں کہ اگر فاریہ حسد کی آگ میں نہ جلتی تو آج وہ بھی ان گھر والوں کے ساتھ ہوتی۔

زندہ صدیاں

قسط نمبر:02

ایم اے راحت

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے دریچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

"**کیا** کیا جائے یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔"

"یہ تو اچھا نہیں ہوا بھائی جی مہاراج۔" پنڈا عجیب سے لہجے میں بولا۔

"اس سے تو بہتر تھا کہ ہم اس جنم کنڈلی کو کھول کر ہی نہیں دیکھتے۔"

"نہیں پنڈا اس کا دیکھنا اچھا ہی ہوا، مجھے دکھ ہے کہ یہ بات میری زبانی تمہارے کانوں تک پہنچی۔ بھگوان نے سنسار میں اپنے بہت سے روپ چھوڑے ہیں۔ کبھی کبھی انسان پر برا وقت بھی آتا ہے اور اس کا ستارہ برج میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن پنڈت اشلوک پڑھ کر اور پوجا کر کے بری گھڑی ٹال دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم سارے پنڈتوں کو جمع کرلو اور بھگوان کیرتن شروع کرادو۔"

"ٹھیک ہے بھائی جی مہاراج......"

آشتر چلا گیا لیکن پنڈا کا اطمینان رخصت ہوگیا تھا۔ موت کا خوف اس کی آنکھوں میں پھیل گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے محل کے کونے کونے میں سانپ لہرا رہے ہوں۔ کالے زہریلے سانپ جن کی زبانیں اسے ڈسنے کے لئے باہر نکل آئی ہوں اور جن کی ننھی چمکدار آنکھیں للچائے ہوئے انداز میں اسے گھور رہی ہوں۔

کنڈلی کو واپس خزانے میں رکھ دیا گیا۔ لیکن پنڈا بری طرح پریشان تھا اور دوسری طرف رانی کندھاری کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں دریودھن کے راجا بننے کے خواب لہرا رہے تھے اور وہ اس بات کی شدت سے خواہش مند تھی کہ دیکھیں اب کس وقت راجا پنڈا کے مرنے کی خبر آتی ہے۔ آشتر سے اس نے ساری تفصیل معلوم کرلی تھی۔ پھر وہ بولی۔

"تو کیا آپ نے اس بارے میں راجا پنڈا کو کوئی ہدایت دی۔"

"ہاں! مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ خبر عام ہوجائے......" آشتر نے کہا۔ اور بولا۔

"ہم لوگ بھگوان کی کیرتن کرائیں گے اور اس سے پرارتھنا کریں گے کہ پنڈا اس کشٹ سے نکل جائے۔"

کندھاری نے نفرت بھری نگاہوں سے اس اندھے کو دیکھا جس نے سارا جیون بھائی کے ٹکڑوں پر گزار دیا تھا اور کبھی اپنا حق مانگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اپنے بیٹے گدی پر بیٹھیں اس نے سوچا کہ دریودھن سے بھی اس بارے میں بات کرلی جائے اور اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے دریودھن

کو بلا بھیجا۔ دریودھن اپنی ماتا کے چرنوں کو چھو کر ایک جانب بیٹھ گیا۔

"میں نے تجھے اس وقت ایک ایسے کام سے بلایا ہے دریودھن جسے سن کر میں نہیں جانتی کہ تیرے من میں کیا خیال ابھرے لیکن میری بات غور سے سن۔"

"ایسی کیا بات ہے ماتا جی۔"

"کیا تو نے کبھی یہ سوچا دریودھن کہ تو چتر برج کا سب سے بڑا پوتا ہے۔"

"وہ تو میں ہوں۔"

"راجا پنڈا کے بیٹے بھی تو ہیں جن میں سب سے بڑا ارجن ہے۔"

"ہاں ہیں...... اور ارجن میرا بھائی ہے۔"

"پگلے سنسار میں سارے رشتے اپنے لئے ہوتے ہیں۔ منش سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچتا ہے اس کے بعد رشتے ناطوں کے بارے میں۔ راجا پنڈا کو حکومت صرف اس لئے مل گئی کہ تیرا باپ اندھا تھا۔ ورنہ بڑے ہونے کے ناطے سے حکومت تیرے پتا کو ہی ملنی چاہئے تھی۔ پرانتو میں جانتی ہوں کہ راجا پنڈا نے یہ بات کبھی نہیں سوچی ہوگی کہ حکومت...... حکومت کے اصل حقدار دریودھن کو ملے۔ کیونکہ تو مہاراج چتر برج کا سب سے بڑا پوتا ہے۔ مگر تیرے اندر ایک بہت بڑی خامی ہے دریودھن وہ یہ کہ تو ایک ایسے باپ کا بیٹا ہے جو کسی طور حکومت کرنے کے قابل نہیں ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ دریودھن نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ آج اسے احساس ہوا کہ حکومت کا جائز حقدار واقعی وہ خود ہے اور جب یہ احساس اس کے من میں جاگا تو گرمی کی تیز لہریں اس کے تن بدن میں دوڑ گئیں۔

"آپ نے ٹھیک کہا ہے ماتا جی حکومت ارجن کی بجائے مجھے ملنی چاہئے۔"

"تو غور سے سن اور میں تجھ سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہ میں ہی نہیں بلکہ تیرے نانا جی یعنی راجا کندھار بھی یہی کہتے ہیں کہ راجا پنڈا تجھے حکومت کبھی نہیں دے گا لیکن اگر پنڈا مر جائے تو بھی حکومت اس کے بیٹے کو نہیں ملے گی جب تک کہ آشتر زندہ ہے۔ حکومت آشتر کو ہی ملے گی اور اس کے نام پر تو گدی سنبھالے گا۔ کیونکہ اب تو موجود ہے اور جوان ہو چکا ہے۔ کیا تو اس کے لئے تیار ہے۔ دریودھن۔"

"تیار کیا ہوں ماتا جی یہ کام تو ہونا چاہئے۔ بھگوان کی سوگند اس سے پہلے میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ مگر مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ چاچا جی ہمیں اس طرح نظر انداز کر دیں گے یہ تو انہیں خود کرنا چاہئے۔"

"اس سنسار میں کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کرتا دریودھن، اپنا حق مانگو...... نا ملے تو چھین لو...... وہ لوگ ہمیشہ پیچھے رہتے ہیں جو آگے بڑھ کر اپنا حق نہ چھین لیں۔" کندھاری نے کہا اور دریودھن گردن ہلانے لگا۔ تب کندھاری اس کے کانوں میں آہستہ آہستہ کچھ کہتی رہی اور دریودھن کی آنکھیں خوشی سے چمکتی رہیں۔ آخر میں اس نے گردن ہلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے ماتا جی اب تم دیکھو گی کہ دریودھن ایسا کچا بھی نہیں ہے۔ میں خود کو حکومت کرنے کا اہل ثابت کر دوں گا۔" دریودھن نے کہا اور ماں کے چرن چھو کر باہر نکل گیا۔

پنڈا کا سکون ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا تھا۔ موت کے بھیانک ہاتھ اسے اپنی گردن کی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ایک ایک چیز سے چونکتا تھا۔ بس ہر سمے یہی خطرہ رہتا تھا کہ ابھی کہیں سے کوئی سانپ نکلے گا اور اسے ڈس لے گا۔ اس خوف کی وجہ سے وہ دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ راج پاٹ کے کام بھی صحیح طور پر نہیں کر پا رہا تھا۔ جس کا احساس مہامنتری کو ہو گیا اور انہوں نے اس سے یہ سوال کر ڈالا۔ پنڈا خود بھی ان سے یہ بات کرنا چاہ رہا تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ مہا منتری کو اس نے سارے حالات بتائے اور منتری بھی سوچ میں ڈوب گیا۔

"آپ نے اپنی آنکھوں سے پڑھا ہے مہاراج

کہ جنم کنڈلی میں یہی بات لکھی ہے۔"
"ہاں! پر اس کو ٹالنا ہوگا منتری اور اس کے لئے میرے من میں ایک ترکیب آئی ہے۔"
"کیا مہاراج؟......"
"میں چاہتا ہوں منتری جی کہ ایک ایسا مینار بنایا جائے جو زمین سے بہت اونچا ہو۔ اس مینار پر ایک ایسی جگہ ہو جہاں میں رہ سکوں۔ راج پاٹ کے سارے کام میں وہیں بیٹھ کر کرنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے ممکن ہے مجھے اپنے چاروں طرف سانپ ہی سانپ نظر آتے ہیں۔"
"آپ چنتا نہ کریں مہاراج۔ آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے اسے میں جلد پورا کروں گا۔" مہامنتری نے کہا۔
راجا پنڈا کا حکم تھا۔ دیر کس بات میں ہوتی۔ تھوڑے ہی دن کے اندر اندر راج محل سے کچھ فاصلے پر ایک ایسا مینار تعمیر ہوگیا جس کے اوپر ایک خوب صورت رہائش گاہ بنائی گئی تھی۔ مینار اتنا سپاٹ اور چکنا تھا کہ اس کے اوپر اگر چیونٹی بھی چڑھنا چاہتی تو پھسل کر گر جاتی۔ راجا پنڈا نے اپنے لئے خاصا معقول بندوبست کرلیا تھا۔ پھر وہ مینار کی اوپری رہائش گاہ میں منتقل ہوگیا۔
رانی کندھاری کو بھی یہ ساری معلومات مل رہی تھیں۔ اس نے کنڈلی میں جو تبدیلیاں کرائی تھیں وہ بھی بہت بڑا کام تھا، لیکن یہ کام اس نے بڑی محنت سے کر ڈالا تھا۔ راجا پنڈا کی جنم کنڈلی میں وہی کچھ لکھا تھا جو رانی کندھاری چاہتی تھی۔
دوسری طرف راجا پنڈا اس عمل کو کر کے کسی قدر مطمئن ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی حفاظت کے لئے جو اقدامات کئے تھے اس کے خیال میں وہ کافی تھے۔ مینار کے چاروں طرف سپاہیوں کا پہرہ رہتا تھا اور انہیں ہدایت تھی کہ اگر ننھا سا کیڑا مکوڑا بھی اس طرف آنے کی کوشش کرے تو اسے کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ راجا کے لئے جو غذا لائی جاتی اسے بھی اچھی طرح دیکھ لیا جاتا۔ اس طرح مینار محل کی حفاظت کے اقدامات نہایت اطمینان بخش تھے۔ مینار محل میں جو بھی آتا اسے ہدایت تھی کہ وہ اپنا لباس اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر راجا صاحب کے پاس آنے کی کوشش کرے۔ عام طور سے کھانے پینے کی چیزیں ایک مخصوص ذریعے سے اوپر پہنچ جاتی تھیں۔ ملنے جلنے والوں پر بھی خاص طور سے پابندی تھی۔ یعنی صرف ایسے لوگ راجا سے ملاقات کے لئے آسکتے تھے جن پر راجا کو مکمل بھروسہ ہوتا۔ یہ بات بھی ذہن میں تھی کہ کہیں کوئی سازش نہ کی جائے۔ حالانکہ سازش کرنے والوں کا کوئی تصور راجا پنڈا کے ذہن میں نہیں تھا اس کی حکومت کافی مستحکم تھی۔
یوں وقت گزرتا رہا۔ پنڈا کا خیال تھا کہ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ حکومت صرف مینار تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے علاوہ گنگا کے کنارے پجاریوں کی ایک فوج بیٹھا دی گئی تھی۔ جو دن رات مالائیں جپ جپ کر راجا پنڈا کی تقدیر کا یہ سیاہ داغ دھونے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ راجا پنڈا کا خیال تھا کہ جب یہ جیوتشی کہہ دیں گے کہ راجا پنڈا کا ستارہ برج کی نحوست سے نکل آیا ہے تو وہ مطمئن ہو جائے گا اور معمول کے مطابق اپنے کام جاری کر دے گا۔
لیکن بعض اوقات سب کچھ ایک حقیقت بن جاتا ہے۔ جسے عام حالات میں ایک وہم کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔
راجا پنڈا کی خوراک کے لئے جو کچھ آتا تھا اسے اچھی طرح دیکھ بھال کر لایا جاتا تھا۔ لیکن اس وقت راجا پنڈا نے خوب صورت سیبوں میں سے ایک خوشنما سیب اٹھایا تو اسے اس میں ایک سوراخ نظر آیا۔ ننھا سا سوراخ جس کے گرد کا حصہ خشک تھا۔ سیب کو دیکھ کر راجا کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ لوگوں نے اس کے لئے بھیجے جانے والے پھل پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ورنہ اگر توجہ دی جاتی تو یہ کانا سیب راجا پنڈا کی خدمت میں کس طرح آتا۔ کس کی یہ مجال ہوئی۔ اس نے غصے سے یہ فیصلہ کیا کہ کل سیب لانے والے کو سزا دے گا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ تقدیر خود اس کا فیصلہ کرنے والی ہے۔ کانا سیب اٹھا

کر اس نے ایک جانب رکھ دیا اور پھر ایک دوسرا سیب اٹھا کر اسے دانتوں سے کترنے لگا۔ لیکن اتفاقیہ طور پر ہی اس کی نگاہ کانے سیب کی جانب اٹھ گئی تھی۔ سیب کے سوراخ میں سے کوئی پتلی سی چیز آہستہ آہستہ باہر نکل رہی تھی۔ راجا اس ہلتی ہوئی چیز کو دیکھ کر یہ نا سمجھ سکا کہ یہ کیا ہے۔ وہ پرتجسس انداز میں اس کے پاس آ گیا۔ لیکن دوسرے لمحے اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئی تھیں۔ کانے سیب میں سے ایک ننھا پتلا سا سانپ نکل رہا تھا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے سیب کے سوراخ میں سے باہر نکل آیا اور باہر نکلنے کے بعد دفعتاً ہی اس کا جسم بڑھنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک سیاہ زہریلا سانپ بن گیا جس کے نچلے حصے پر سفیدی نظر آ رہی تھی۔

راجا کے پورے بدن کی قوتیں سلب ہو گئیں۔ وہ چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگے۔ باہر جا کر اپنے آدمیوں کو آواز دے لیکن یوں لگتا تھا جیسے راجا کے تن بدن میں جان نہ رہی ہو۔ سانپ کی پراسرار نگاہیں راجا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی زبان اندر باہر نکل رہی تھی۔ اس کا چہرہ پھیل گیا تھا اور وہ خوفناک انداز میں راجا کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ راجا چند ساعت اسی طرح کھڑا رہا۔ دوسرے لمحے اس کے حلق سے ایک دہشت ناک چیخ نکلی اس نے پلٹ کر بھاگنا چاہا لیکن سانپ اس سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اس نے اچھل کر راجا کی گردن پر دانت گاڑ دیئے۔ راجا نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن چکنا سانپ پھسل کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔

راجا کی گردن سے خون بہنے لگا۔ راجا خوف و دہشت سے چیخنا چاہتا تھا لیکن یہ لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز گھٹ گئی ہو۔ کچھ لمحے اس کے ہاتھ تشنجی انداز میں پھیلے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے جسم میں نیلاہٹ دوڑ گئی اور وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ سانپ اپنا کام ختم کر کے واپس اپنی جگہ آیا۔ پھر اس کا جسم اسی طرح گھٹنے لگا پھر وہ سیب کے اندر داخل ہو گیا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ راجا کی موت اس طرح ہو جائے گی۔

چنانچہ حالات معمول کے مطابق رہے۔ دوسری صبح راجا جھروکوں میں نہ آیا۔ نیچے کھڑے ہوئے پہرے داروں کو تشویش ہوئی پھر جب دیوان اس سے ملنے کے لیے آیا تو اس نے راجا کے بارے میں پہرے داروں سے پوچھا پہرے داروں نے جواب دیا کہ آج صبح سے راجا جھروکوں میں نہیں آیا۔ دیوان کو حیرت ہوئی اور پھر اس نے معلومات کرنے کی غرض سے وہ تیاریاں مکمل کر لیں جن کے ذریعے اوپر جایا جا سکتا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں پورے ہستھراں پور میں کہرام مچ گیا۔ وہی ہوا جو راجا کی جنم کنڈلی میں تھا۔ راجا پنڈا کو سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ مر گیا تھا۔

کنڈلی کا لکھا بھلا کون ٹال سکتا تھا۔ بات ختم ہو گئی۔ دوش کسے جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد راجا پنڈا کے پانچوں بیٹوں نے حکومت کا دعویٰ کر دیا۔ ان دعویٰ کرنے والوں کے نام ارجن، سہدیو، جدہشتر، بھیم سین اور نکل تھے۔ وہ سب اس بات پر متفق تھے کہ اصول کے مطابق پنڈا کی اولاد کو حکومت ملنی چاہئے۔ دوسری طرف آشتر کو کندھاری نے اکسانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں جانتی ہوں تم اپنے بھائی سے بہت پریم کرتے تھے، مگر اب وہ اس سنسار میں نہیں ہے حکومت سنبھالنا تمہاری ذمہ داری ہے اور چتر برج کے خاندان کے سبھی لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت اب تمہاری ہے۔ اور چونکہ حکومت کے کام تم نہیں سنبھال سکتے اس لئے چتر برج کے سب سے بڑے پوتے کی حیثیت سے دریودھن تمہارے نام سے حکومت کرے گا۔ آشتر نے یہ بات مان لی اور راجا بن گیا۔ لیکن اصل راجا دریودھن ہی تھا۔ جو بے حد چالاک، سنگدل اور مکار نوجوان تھا۔ اسے یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ پانڈوں نے سلطنت کے دعویدار ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اور وہ آئندہ اس کی حکومت میں کوئی رکاوٹ بن سکتے ہیں۔

چنانچہ اس نے اس بات پر سوچنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف آشتر کو بھی اروجن، سہدلو، جدہشتر، بھیم سین اور نکل کی کارروائیوں کا علم ہو گیا۔ ان پانچوں نے

وہ رشتے نہیں نبھائے جوان کے اور پنڈا کے درمیان تھے۔ پانچوں ہی باغیوں کی شکل میں نظر آنے لگے اور حکومت کو گرانے کے منصوبے بنانے لگے۔ جن کا علم اکثر آشتر کو ہو جاتا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر ڈالیں گے۔ ادھر دریودھن بھی خاص طور سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ آشتر اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر دریودھن پانڈوں کی تباہی پر اتر آیا تو پانڈوں کو جان بچانا بہت مشکل ہو جائے گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ جنگ کے شعلے بھڑکیں۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ پانڈوں کو شہر بدر کیا جائے۔ لیکن جب دریودھن کو اس بارے میں پتا چلا کہ آشتر پانڈوں کو شہر سے باہر آباد کر رہا ہے تو اس نے معماروں کے سربراہ کو اپنے پاس بلالیا۔ ان میں بلدیو چند سردار تھا۔ دریودھن نے کہا کہ پانڈوں کے لئے شہر سے باہر گھر تعمیر کریں۔ اور جب بلدیو چند اس کے پاس پہنچا تو اس نے کہا۔

''بلدیو میرا پتا اندھا ہے۔ اور اندھا ہونے کی وجہ سے مہاراج چتر برج نے انہیں حکومت سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن جب اس کے پاس دریودھن کی آنکھیں پہنچ گئیں تو پنڈا کی حکومت بھی اس کے پاس آ گئی۔ اگر آشتر حکومت کے قابل ہوتا تو پہلے ہی حکومت اسے کیوں نہ مل جاتی۔ جبکہ وہ حکومت کا حقدار بھی تھا۔ تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ اصل حکومت آشتر کی نہیں بلکہ میری ہے۔''

''اوش مہاراج...... اوش...... یہ بات میں ہی کیا سب جانتے ہیں۔'' بلدیو چند نے کہا۔

''تو پھر تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ راجاؤں کے حکم زندگی کی امانت ہوتے ہیں اور اگر کوئی انسان یہ امانت کھو بیٹھے تو پھر اسے موت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔''

بلدیو چند نے گہری نگاہوں سے دریودھن کو دیکھا۔ چالاک آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ دریودھن کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے۔ اس نے مسکرا کر گردن ہلائی۔ اور بولا۔

''ہاں مہاراج! میں جانتا ہوں۔''

''اور تم ہمارے خاص آدمی کہلاؤ، میں یہ چاہتا ہوں۔''

''جی مہاراج! آپ مجھے بتائیں کہ وہ خاص کام کیا ہے؟''

''سنو! یہاں سے یہ فیصلہ کر کے اٹھو کہ تم کو جو کچھ میں کہوں گا اسے انجام دے سکو گے یا نہیں۔''

''فیصلہ آپ کریں گے مہاراج۔ جب آپ نے بلدیو پر بھروسا کیا ہے تو پھر اس فیصلے کی بات نہ کریں۔ بلدیو کا فیصلہ وہی ہو گا جو مہاراج کے ہونٹوں سے نکلے گا۔''

''بدھائی ہو بلدیو بھائی بدھائی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ پانڈوؤں کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹ جائے اور تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ارجن اور اس کے بھائی راجا پنڈا کی حکومت پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ راجا پنڈا کا بھائی ابھی جیتا ہے اور حکومت کے لئے اس سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ اگر وہ نہیں بھی ہوتا تو مہاراج چتر برج کا سب سے بڑا پوتا میں ہوں اور حکومت مجھے ملنی چاہئے۔ یہ حکومت پنڈا کی اپنی نہیں ہے کہ جو اس کے بیٹوں میں آسانی سے تقسیم ہو جاتی۔ یہ پنڈا کے باپ کی ہے۔ اور پنڈا کو اسی لئے ملی تھی کہ اس کا حقدار آنکھوں سے اندھا تھا۔ اب یہ حق میرا بنتا ہے۔ یہ ارجن حکومت کا حقدار کیوں بن رہا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں مہاراج۔''

''اس کا مطلب ہے وہ باغی ہے۔ باغیوں کی سزا کیا ہوتی ہے بلدیو۔''

''موت سرکار موت۔'' بلدیو چند سفاک لہجے میں بولا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ یہ موت اس طرح واقع ہو کہ ہمارے پتا جی کو بھی پتا نہ چل سکے۔ اسی لئے میں نے تمہیں تکلیف دی ہے۔''

''ایسا ہی ہو گا مہاراج...... بلدیو کے لئے کیا حکم ہے۔ بلدیو وہی کرے گا جو مہاراج چاہیں گے۔''

''سنو! مکان تعمیر کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ جہاں پانڈو جائیں گے۔ تم اس میں جو مصالحہ استعمال کرو گے وہ رال اور راکھ کا ہونا چاہئے۔ یہ دونوں چیزیں چنگاری دکھانے سے ہی بھڑک اٹھتی ہیں۔ پھر یوں ہو گا کہ ایک رات پانڈوؤں کا یہ گھر جلتی ہوئی مشعل

میں تبدیل ہو جائے گا اور پنڈا کی اولاد کو حکومت ملنے کا قصہ ختم ہو جائے گا۔ اور یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ ہاں تمہارے ساتھ کام کرنے والے معمار اور کاریگر تمہارے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہوں گے؟"

"آپ اس کی چنتا نہ کریں مہاراج! بس مجھے من میں رکھیں۔"

"ہاں یہ ہمارا کام ہے کہ ہم تمہیں من میں رکھیں۔"

"ٹھیک ہے مہاراج! آپ جو حکم دیں گے وہی ہوگا۔"

"چنانچہ اس طرح پانڈوؤں کو شہر سے نکالا مل گیا...... لیکن وہ خاموش تھے وہ جانتے تھے کہ حکومت آشتر کی ہے اور دریودھن کا اپنا بھائی ان کا دشمن ہے۔ وہ ہر طرح سے ان کے خلاف کام کر سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کسی بھی سلسلے میں سرکشی نہیں کی اور خاموشی سے اس گھر میں چلے گئے جو ان کے لئے رال اور راکھ سے تعمیر کرایا گیا تھا۔ لیکن کچھ تجربے کاروں نے مکان سے اٹھنے والی خوشبو اور اس کی تعمیر کے لئے استعمال ہونے والی مصالحوں کو غور سے دیکھا تو انہیں پتا چل گیا کہ مکان کی تعمیر میں رال اور راکھ استعمال کی گئی ہے جو کسی بھی وقت ہلکی سی چنگاری سے بھڑک سکتی ہے اور یوں پنڈا کی تمام اولاد، رال اور راکھ کے بنے ہوئے اس مکان میں راکھ بن سکتی ہے۔

چنانچہ تمام پانڈے چوکنے ہوگئے۔ وہ شدید خوفزدہ ہو گئے تھے اور دن رات خوف سے جاگ کر گزارتے تھے۔ حالانکہ وہ جرأت مند تھے لیکن آشتر کی حکومت نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔

تب ایک رات ارجن نے اپنے چاروں بھائیوں بھیم سین، ہدیشتر، سہدیو اور نکل کو جمع کیا اور اپنی ماں رانی کنتی کو بھی بلایا۔

میں ایک بار پھر تمہیں راجہ دہترآشتر اور دریودھن کے اس خیال سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ ہمارے رشتہ دار ہیں، جو ہمارے باپ کے سگے بھائی ہیں۔ ہم پانڈوؤں کو اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے باپ راجہ پنڈا نے ان لوگوں کے ساتھ کبھی برائی نہیں کی اس کے باوجود وہ لوگ ہمیں صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں اور ان کی پہلی خواہش ہے کہ حکومت کو دشمنوں سے محفوظ رکھا جائے اور ہم لوگوں کو جو سلطنت کے دعویدار ہیں کچل دیا جائے۔ تاکہ سلطنت خطرے سے محفوظ رہ جائے۔ اس سلسلے میں ہم ان کی آنکھوں کا سب سے بڑا کانٹا ہیں۔ چنانچہ ہم لوگوں کو چاہئے کہ اس سلسلے میں خاموشی اختیار کریں اور آنے والے وقت کا انتظار کریں تاکہ ایک مضبوط حیثیت سے ہم اپنے اس دعوے کا اظہار کریں جو ہمیں اس حکومت پر ہے۔"

رانی کنتی جو پنڈا کی بیوی اور پانچوں بیٹوں کی ماں تھی۔ سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے دکھ ہوا تھا کہ اس کے سورگباشی پتی نے کبھی آشتر کے خلاف ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا جو اس کے یا اس کی اولاد کے خلاف ہوتا لیکن دریودھن نے باپ کی شہہ پا کر وہ سب کچھ کر ڈالا تھا جو اپنوں کے ساتھ نہیں کیا جاتا۔ تب اس نے کہا۔

"میرے بیٹوں پہلے مجھے تم یہ بتاؤ کہ تم لوگوں کا ارادہ کیا ہے؟"

ارجن آگے بڑھا اور بولا۔

"ماتا کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس گھر کی تعمیر میں کیا استعمال کیا گیا ہے۔"

"کیا مطلب ارجن؟" رانی کنتی حیران رہ گئی تھی۔

"ماتا جی یہ گھر رال اور راکھ سے بنایا گیا ہے۔ سو اب ہم لوگوں کو چاہئے کہ ہم خود اس گھر کو آگ لگا دیں اور خاموشی کے ساتھ یہاں سے کہیں دور نکل جائیں۔ مجھے جو باتیں معلوم ہوئی تھیں وہ یہ ہیں کہ بھیل نامی ایک عورت ہمارے گھر میں آگ لگانے کے لئے مخصوص کی گئی ہے۔ وہ اپنے پانچ بیٹوں کے ساتھ یہاں آئے گی اور اس گھر کو راکھ کا ڈھیر بنا کر چلی جائے گی۔ مگر ہم اس شہرت سے فائدہ اٹھائیں گے، بھیل اور اس کے بیٹوں کو جلا کر راکھ کر دیں گے۔ تاکہ جب جلے ہوئے گھر سے ان کی لاشیں ملیں تو لوگ یہی سمجھیں کہ پانڈوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔"

رانی کنتی نے یہ بات پسند کی اور یہی ہوا۔ پانڈوں نے بھیل اور اس کے پانچوں بیٹوں کو اس مکان میں زندہ

جلا دیا، پورا مکان آن کی آن میں شعلوں میں گھر گیا اور بھیل اپنے پانچوں بیٹوں کے ساتھ آگ میں جل کر خاک ہوگئی۔ دریودھن کے جاسوس نے اس عورت اور اس کے پانچوں بیٹوں کے جلنے سے یہ سمجھا کہ پانڈے اپنی ماں سمیت جل کر ہلاک ہوگئے ہیں، دریودھن کو یہ سن کر بہت خوش ہوئی، ان کی دلی مراد بر آئی تھی۔ اب روئے زمین پر ان کا کوئی دشمن نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو دشمن کے خوف سے محفوظ سمجھنے لگے۔

دوسری طرف پانڈو اپنی وضع قطع بدل کر اور نام تبدیل کر کے جنگل سے شہر میں آگئے اور کنپلا میں آباد ہوگئے۔ یہ مقام ہندوستان کے ضلع فرخ آباد کی تحصیل قائم گنج میں واقع ہے اور آج کل اس کا نام کنپل ہے۔

کنپل پہنچ کر پانڈوں نے یہاں کے راجہ کی لڑکی دروپدی سے مشترکہ شادی کرلی، یعنی پانچوں بھائی دروپدی کے پتی تھے۔ ان کے نزدیک یہ مشترک شادی باہمی اتحاد و محبت کا سبب تھی۔ دروپدی کے متعلق یہ طے کیا گیا کہ وہ ان بھائیوں کے ساتھ بہتر بہتر روز باری باری سے رہا کرے۔ چنانچہ پانڈو ایک نئی حیثیت سے کنپل میں مشہور ہونے لگے۔ ان کی شجاعت اور اقبال مندی کے قصے دور دور تک پھیل گئے۔ پانڈوؤں کی پیشانی سے اقبال مندی کے آثار نمایاں تھے۔ اس لئے ان کی عظمت اور شان دن بدن بڑھتی رہی۔ ان کی شان کے قصے کنپل سے نکل کر دور دور تک پھیل گئے اور جلد ہی یہ اطلاع کوروؤں تک بھی پہنچ گئی۔

دریودھن کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اب وہ دشمنوں سے محفوظ تھا اور راج پاٹ کے کاموں کو نہایت دلچسپی سے انجام دے رہا تھا۔ رانی کندھاری بھی بہت خوش تھی۔ اس کا باپ راجہ قندھار جو قندھار کا راجہ بھی تھا۔ دریودھن کو حکومت مل جانے کی خوشی میں بے شمار تحائف لے کر پہنچا تھا۔ اس نے تنہا پور راج کی توسیع کے لئے بے شمار منصوبے اور اپنی مدد کی پیشکش کردی۔ رانی کندھاری ہر طرح سے اپنے باپ کے ساتھ تھی اور وہ سب کچھ کرنے کے لئے دریودھن کو مجبور کرتی تھی جو اس کا باپ کہتا تھا۔ آشتر کی حیثیت صرف ایک مہرے کی تھی جو ان ماں بیٹوں کے کہنے پر ایک خانے سے دوسری خانے تک چل رہا تھا۔

دریودھن اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کے چکر میں لگا ہوا تھا۔ اس نے ایک ایسا نظام قائم کیا تھا جس سے اسے قرب و جوار کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں، پانڈوؤں سے تو اب اس کا ذہن صاف ہوگیا تھا۔ ان سب کا سنسار میں اب کوئی وجود نہیں تھا۔ اس لئے ان کی طرف سے وہ بے فکر ہوگیا تھا۔

لیکن یہ بے فکری زیادہ عرصے تک نہ رہی۔ آہستہ آہستہ ایسی خبریں ملنے لگیں جن سے دریودھن متفکر ہونے لگا اسے علم ہوا تھا کہ کنپلا اور اس کے قرب و جوار میں پانچ ایسے بھائی ابھر رہے ہیں جن میں پانڈوؤں کی سی خصوصیات نمایاں ہیں، گو ان کے نام بدلے ہوئے ہیں لیکن یوں لگتا ہے جیسے وہ راجہ پنڈا کی اولاد میں سے ہوں۔ جن کے نام ارجن، بھیم سین، جد ھشتر، نکل اور سہدیو تھے۔

چنانچہ دریودھن نے اس واقع کی تحقیقات کرنے کے لئے چند افراد کو مختص کردیا اور اس کے آدمیوں نے اسے جو اطلاعات دیں وہ بڑی ہی تعجب خیز تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ پانڈوؤں کے جلنے کی اطلاع غلط تھی۔ وہ ابھی تک زندہ ہیں اور کنپل میں مقیم ہیں۔ ان پانچوں بھائیوں نے کنپلا کے راجہ کی بیٹی دروپدی سے باہمی شادی کرلی ہے۔ دریودھن کو یہ ساری تفصیلات سن کر بڑی تشویش ہوئی۔ اس نے سوچا کہ پانڈوؤں نے اپنی جرأت مندی سے حالات کا مقابلہ کر ہی لیا۔ وہ جلنے سے بھی بچ گئے اور انہوں نے ایک ایسی مضبوط حکومت بھی حاصل کرلی جو آگے بڑھ کر تنہا پور پر حملہ بھی کرسکتی ہے۔ چنانچہ اس نے دن رات کوئی نئی چال چلنے کی کوششیں شروع کردیں۔

اس نے اپنے مشیروں سے مشورہ لیا اور اپنے چچا زاد بھائیوں سے دوستانہ مراسم استوار کرنے کی کوشش کی، اور ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور انہیں تنہا پور

آنے کی دعوت دی۔

پانڈوؤں نے کوروں کی یہ دوستی قبول کرلی اور تنہا پور جا پہنچے۔

دریودھن نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور خاصی خاطر تواضع کی۔ دونوں خاندانوں میں حکومت کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ ہوا۔ طے یہ پایا کہ اندر پت جسے اب پرانی دہلی کہا جاتا ہے مع آدھی سلطنت کے پانڈوؤں کے قبضے میں رہے گی اور تنہا پور کوروؤں کے زیر نگین رہے گی۔ حکومت کی اس تقسیم کے بعد سلطنت کے بہت سے امیروں نے پانڈوؤں کی اقبال مندی، جرأت مندی اور بلند ظرفی کو دیکھ کر ان کی اطاعت قبول کرلی۔ اس پر دریودھن بظاہر تو خاموش رہا لیکن اس کے اندر خاصی تشویش پیدا ہوگئی۔ وہ دل ہی دل میں پانڈوؤں کی تباہی کے منصوبے بنانے لگا۔ راجہ آشتر جو صرف نام کا حکمران تھا اور سچ مچ کا اندھا حکمران تھا اس کی حیثیت تو ایک طرح سے ختم ہوکر رہ گئی تھی اور لوگ اب دریودھن کو ہی راجا سمجھنے لگے تھے، لیکن دریودھن کے دل کی حالت بہت خراب تھی۔

پانڈوؤں کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا اس پر اس کا دل ندامت کرتا تھا لیکن حسد کی آگ اس کے وجود کو جلا کر خاکستر کئے دے رہی تھی۔ امیروں اور سلطنت کے بڑے بڑے لوگوں کی اطاعت پر بظاہر وہ خاموش رہا لیکن اس کے دل میں پانڈوؤں کی تباہی کے بہت سے منصوبے تھے۔

دوسری طرف ارجن، جدہشتر اور اس کے سارے بھائیوں نے مل کر سلطنت کو وسیع کرنے کا منصوبہ بنایا اور اپنی فوجوں کو لے کر مختلف علاقوں کی سمت چل پڑے۔ چونکہ بھگوان بھی پانڈوؤں پر مہربان تھا اس لئے پانڈوؤں نے جو سوچا وہی ہوا۔ چاروں باہمت بھائیوں نے بھگوان کی مدد سے ساری دنیا میں اپنا نقارہ بجادیا اور ہر ملک کے فرمانبرداؤں، امیروں اور راجاؤں کو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنالیا۔ یہ چاروں بھائی فتح و نصرت سے کامیاب و کامران ہوئے اور ان علاقوں سے جو انہوں نے فتح کئے تھے بے شمار زر و جواہرات لے کر اپنے دارالحکومت اندر پت میں پہنچے۔ ان کے پہنچنے پر ان کا عظیم الشان استقبال کیا گیا اور ان کے اہتمام میں جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔

دریودھن نے جب پانڈوؤں کی یہ شان، یہ عظمت اور رعب و جلال دیکھا اور ان کی سلطنت کی وسعت پر نظر کی تو اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اپنے دشمنوں کو ختم کرنے کا خیال اس کے دل میں تیزی سے سر اٹھانے لگا اور اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے وہ طرح طرح کی تدبیریں سوچنے لگا۔

دریودھن کے دربار میں بہت سے مکار، حیلہ باز قسم کے لوگ جمع تھے، وہ دن رات ان سے مشورے کرنے لگا۔ اس کے دل میں شدید خواہش تھی کہ کسی طرح پانڈوؤں کا اقتدار اور اقبال ختم کردے اور اپنی سلطنت کو وسیع تر کرے۔

چالاک درباریوں نے بالآخر دریودھن کو ایک مشورہ دیا اور اس مشورے پر عمل کرنے کے لئے دریودھن دن رات غور و خوض کرنے لگا۔

اس زمانے میں جوا کھیلنے کا رواج عام تھا۔ چالاک درباریوں نے دریودھن کو جوئے میں کوروؤں کی قسمت کا پانسہ پلٹنے کا مشورہ دیا اور ایک خاص قسم کی چوسر پر جوا کھیلنے کو کہا۔ اس مقصد کے لئے یہ طے پایا کہ جوا کھیلنے کے لئے ایک ایسا پانسہ بنایا جائے جو ہر بار دشمن کے خلاف پڑے۔

دریودھن کو یہ تجویز بے حد پسند آئی اور اس نے اس خاص قسم کے پانسہ سے جدہشتر، ارجن اور ان کے باقی بھائیوں سے جوا کھیلنے کا ارادہ کیا۔

جب یہ سب کچھ طے ہوگیا تو اس نے بڑی لجاجت اور ملائمت کے ساتھ جدہشتر، ارجن اور ان کے باقی بھائیوں کو تنہا پور آنے کی دعوت دی۔

جدہشتر جو اب اندر پت کا راجہ تھا، اپنے چچا زاد بھائی کی مکاریوں کو نہ سمجھتا تھا، اپنی بے خبری میں تنہا پور پہنچا تو دریودھن نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی اور خوب

اچھی طرح اس کی مدارت کی۔ اس نے ان پانچوں بھائیوں کے اعزاز میں بڑی بڑی دعوتیں کیں اور سارے امراء اور رؤساء سے بڑے بڑے فخر کے ساتھ ملایا۔ جیسے ان سے بڑا اس کا ہمدرد اور کوئی نہیں ہے۔ اس نے بڑی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ یہ پانچوں میرے بھائی ہیں اور اس نے اپنے پانچوں بھائیوں کا حق تسلیم کرتے ہوئے حکومت تقسیم کردی ہے۔

لوگوں نے اس بات کا بڑا چرچا کیا اور خود جدھشتر اور اور کے بھائی بھی اپنی یہ شان و عظمت دیکھ کر پہلے سلوک کو بھول گئے، کیونکہ وہ سچے تھے۔

تفریح کے طور پر دریودھن نے جدھشتر کو جوا کھیلنے کے لئے کہا۔ پانڈوؤں کو چونکہ دریودھن کی عیاری کا معلوم نہ تھا اس لئے وہ بغیر کسی حیل وحجت کے جوا کھیلنے کے لئے راضی ہوگیا۔ اس پر دریودھن نے اپنا وہی مخصوص پانسہ نکالا اور کھیلنا شروع کردیا تھوڑی ہی دیر میں پانڈوا اپنا سب کچھ ہار بیٹھے۔ اور اب بات ملک و مالک پر جا پہنچی۔ لیکن پانسہ جب بھی پڑتا دریودھن ہر چیز کا مالک بنتا چلا گیا۔ لیکن دریودھن نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔

جب پانچوں بھائی اپنی بیوی دروپدی کو بھی ہار گئے تو دریودھن نے ایک آخری بازی اس شرط پر لگانے کو کہا کہ اگر پانڈو جیت جائیں تو انہیں ان کا سب ہارا ہوا مال و ملک اور بیوی واپس کردی جائے گی اور اگر ہار جائیں تو وہ آبادی چھوڑ کر جنگل میں چلے جائیں اور وہاں بارہ سال تک پرندوں اور چرندوں کے ساتھ زندگی گزاریں اور جب جلاوطنی کی یہ رات ختم ہوجائے تو واپس وہ آبادی میں آئیں اور ایک سال تک گمنامی کی زندگی بسر کریں کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیں کہ وہ کون ہیں اور اگر یہ راز کھل گیا تو انہیں پھر بارہ سال جلاوطنی بھگتنی ہوگی۔

بدقسمت پانڈوا اپنی سچائی کی وجہ سے اور دریودھن کی چالاکی، مکاری اور چالبازی کی وجہ سے یہ آخری بازی بھی ہار گئے۔ شرط کے مطابق انہوں نے شہر کی سکونت ترک کرکے جنگل میں بسیرا کرلیا اور یوں بارہ سال کے لئے دریودھن نے پانڈوؤں سے اپنی حکومت کو محفوظ کرلیا۔

اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ دریودھن راج کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بارہ سال گزر گئے۔

بارہ سال پورے ہوچکے تھے۔ پانڈے دکن کے قریب ملک وائن میں آئے اور یہاں انتہائی گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کرنے لگے۔

دریودھن نے اپنے چچازادوں کا کھوج لگانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اسے کہیں ان کا سراغ نہ ملا اور پھر پانڈے جب حسب شرط ایک سال تک گمنامی کی حالت میں رہے اور جب جلاوطنی کی تمام شرائط پوری ہوگئیں تو پانڈوؤں نے اس وقت کے ایک بہت بڑے شخص کو ایلچی بنا کر دریودھن کے دربار میں بھیجا اور ملک کی واپسی کا مطالبہ کیا۔

دریودھن پانڈوؤں کی زندگی کے بارے میں سن کر ششدر رہ گیا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ پانڈے اس طرح واپس آجائیں گے اور پھر اپنے ملک کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ اول تو وہ ان بارہ سالوں میں پانڈوؤں کو بھول ہی گیا تھا۔ اور اپنے دور حکومت میں اس نے بے شمار فتوحات حاصل کی تھیں اور اس کا رواج دور دور تک پھیل گیا تھا۔ اب یہ پانڈے نجانے کہاں سے آگئے تھے۔

چنانچہ دریودھن بھلا اس بات کو کیسے تسلیم کرلیتا۔ اس نے اس مطالبے کو رد کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانڈوؤں نے جنگ کا اعلان کردیا۔

دریودھن کو اپنی فوجوں پر بڑا ناز تھا، اس نے اپنی فوجوں کو سامان جنگ سے آراستہ کرنا شروع کردیا۔

لیکن رانی کندھاری اس جنگ کا سن کر بے حد پریشان ہوگئی تھی۔

راجا کندھار مرچکا تھا اور اس وقت اس کا بھائی کندھار پر حکمرانی کررہا تھا۔ یہ ایک طرح سے دریودھن کا آلہ کار ہی تھا اور ہمیشہ اس کے آگے سر جھکائے رہتا تھا۔

رانی کندھاری اب خاصی بوڑھی ہوچکی تھی لیکن

بہرصورت اس نے بیٹے کو چھپا کر ایک بار پھر سفر کیا۔ دریودھن مہاراج کی تلاش میں انہی غاروں تک گئی تھی۔ غار کے پاس پہنچ کر معلوم ہوا کہ دھن راج مہاراج اسی حجرے میں ہیں۔ حالانکہ تھوڑے عرصے پہلے دھن راج مہاراج اپنے حجرے سے باہر آئے تھے۔ رانی کندھاری ان کے باہر آنے کا سن کر ششدر رہ گئی تھی۔

طویل عرصے کے بعد دھن راج مہاراج کی بات کانوں میں پڑی تھی۔ حالانکہ آخری بار اس نے انہیں ہڈیوں کے پنجر کی شکل میں دیکھا تھا۔ لیکن سادھو سنتوں کی باتیں سادھو سنت ہی جانیں۔ رانی کندھاری کو اندازہ تھا کہ دھن راج مہاراج بہت بڑے رشی اور منی ہیں۔ اس لئے ان کی موت کے بارے میں کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

چنانچہ اس بار بھی وہ دھن راج مہاراج ملنے سے معذور ہیں اور واپس اپنے محل میں آگئی۔

ایک طرف دریودھن اپنی فوجوں کی تیاریوں میں مصروف تھا اور مہا بھارت کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف سے رانی کندھاری سادھو سنتوں سے اور جادو ٹونوں سے اس جنگ کو روکنا چاہتی تھی کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ دریودھن اس جنگ میں مارا جائے گا۔ حالانکہ اس کے باقی بیٹے بھی جنگ میں شریک ہونے کے لئے تیار تھے۔ لیکن اسے سب سے زیادہ دریودھن پیارا تھا اور وہ دریودھن کی زندگی کے بارے میں سخت خلفشار کا شکار تھی۔

انہی حالات میں اس کی ملاقات ایک ایسے سادھو سے ہوئی جس نے انہیں ایک خاص بات بتائی۔

سادھو نے رانی کندھاری کو بتایا کہ اگر رانی کندھاری ایک خاص جاپ کرنے کے بعد اپنے بیٹے کو برہنہ دیکھ لے تو دریودھن کا بدن ان تمام آفات سے محفوظ ہو جائے گا جو اس پر نازل ہونے والی ہوں گی۔

رانی کندھاری اس پر تیار ہوگئی اور اس نے دریودھن کو ہدایت بھیج دی۔

لیکن ایک بہت بڑے شخص نے جوان کے لئے اوتار کی حیثیت رکھتا تھا۔ دریودھن کو مشورہ دیا کہ وہ ماں کے سامنے برہنہ نہ جائے اور کم از کم ستر پوشی کے لئے پھولوں کا ایک ہار پہن لے۔ دریودھن نے اس شخص کے مشورے پر عمل کیا۔

رانی کندھاری نے جاپ مکمل کرنے کے بعد جب دریودھن کو دیکھا تو اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ پھولوں کا یہ ہار جن جن حصوں کو اس کی نگاہوں سے چھپائے ہوئے ہے وہی اس کی موت کا باعث بن سکتے ہیں۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔

عظیم الشان معرکہ جنگ شروع ہونے والا تھا۔ دونوں لشکر آمنے سامنے آگئے تھے۔ یہاں تک کہ وقت آگیا جب انہیں جنگ کرنا تھی۔

یہ عظیم الشان معرکہ جنگ ''کل جگ'' کے شروع کے دور میں برپا ہوا۔ دونوں لشکر اس بری طرح ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے کہ الامان الحفیظ۔

اٹھارہ روز تک یہ جنگ جاری رہی اور اس طرح سے ہوئی کہ دونوں طرف کے لشکریوں کو حریفوں اور حلیفوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔

اس جنگ میں کوروؤں کی طرف سے شامل ہونے والا لشکر گیارہ کشون پر اور پانڈوؤں کی طرف سے شامل ہونے والا لشکر سات کشون پر مشتمل تھا۔ کشون کی اصطلاح کے مطابق ایک کشون اکیس ہزار چھ سو بہتر فیل سواروں، اتنے ہی سانڈ سواروں، پینسٹھ ہزار چودہ سو گھوڑے سواروں اور ایک لاکھ نو ہزار چار سو پچاس پیادہ سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس خوفناک جنگ میں اس بھاری تعداد میں سے صرف بارہ آدمی زندہ بچے تھے۔

چار آدمی کوروؤں کے لشکر میں سے جن کے نام یہ تھے۔

ایک برہمن کرپا چارج جو فریقین کا اُستاد تھا اور مالک سیف وقلم تھا۔ درون نامی ایک عالم کا بیٹا اشوتھا مان جو کرپا چارج کی طرح فریقین کا استاد تھا۔ کرت برماں نامی ایک شخص جو یادو خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور دریودھن کے باپ کا رتھ بان جس کا نام سنجی تھا۔

آٹھ آدمی پانڈوؤں کے لشکر میں سے بچے تھے۔

پانچوں پانڈو بھائی۔ سانک نامی یادو خاندان کا فرد اور دریودھن کا سوتیلا بھائی یویوچھ اور آٹھویں شری کرشن جو اپنی شہرت کی وجہ سے بے نیاز ہیں۔ دریودھن کا سوتیلا بھائی ایک بنئے کی بیٹے سے پیدا ہوا تھا۔

شری کرشن اس زمانے میں سادھو کی حیثیت رکھتا تھا، لوگ اسے اوتار مانتے تھے، اس شخص کے بارے میں بے شمار روایتیں مشہور تھیں۔ ان کے بارے میں مختلف عقیدے مروج ہیں۔ بعض انہیں دنیا بھر کے تمام فریبیوں کا سردار اور حیلہ گردوں کے اعلیٰ مانتے ہیں اور بعض ان کی پیغمبری کے قائل ہیں اور بعض انہیں بھگوان کا اوتار سمجھ کران کی پرستش کرتے ہیں۔

مہا بھارت میں مکاری اور غداری کا انجام سامنے آ گیا تھا۔ دریودھن کا خاتمہ ہو گیا اور اس کے لشکری اور خاندان کے لوگ بھی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

کوروؤں کے خاندان کی تباہی اور دریودھن کے قتل کے بعد پانڈوؤں کے خاندان کا جدھشٹر ممالک ہندوستان کا فرمانروا ہوا اور ساری دنیا میں اس کی سلطنت کا شہرہ ہوا، مہا بھارت کے پورے تیس سال تک جدھشٹر نے حکومت کی۔ لیکن وہ درویش منش تھا۔ اس نے خود ہی دنیا کی حقیقت اور ماہیت پر غور کر کے تخت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس نے چاروں بھائیوں کو ساتھ لے کر گوشہ نشینی میں بقیہ زندگی گزار دی اور اسی عالم میں دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔

اس کے بعد جدھشتر کے چچا زاد بھائیوں نے حکومت کی۔ پھر پانڈوؤں کے خاندان میں ارجن کی اولاد میں سے تیسری نسل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ لڑکا ہر طرح کی ظاہری اور باطنی خوبیوں سے مالا مال تھا۔ نہایت عادل اور انصاف پسند تھا اور اس کے دور میں کتاب مہا بھارت لکھی گئی۔ جو ایک شخص بھشم نامی نے لکھی تھی۔

ہندو عقیدہ جو کچھ بھی کہتا ہو ہمارا عقیدہ اس سے مختلف ہے۔ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ دنیا میں حضرت آدم سے پہلے کوئی خاکی نہیں پیدا ہوا اور طوفان نوح کے بعد حضرت نوح کی اولاد یعنی سام، یانث اور حام اس دنیا کی آزادی اور افتخار کا باعث بنے اور ظاہر ہے یہ ہندوستان بھی انہی کی اولادوں سے آباد ہوا۔ طوفان کے بعد حضرت نوح نے اپنے تینوں بیٹوں یعنی یانث، سام اور حام کو ازروئے کھیتی باڑی اور کاروبار کا حکم دے کر دنیا کے چاروں اطراف روانہ کیا۔

سام حضرت نوح کے سب سے بڑے بیٹے اور جانشین تھے۔ ان کے فرزندوں کی تعداد ننانوے تھی۔ عرب کے تمام قبیلے حضرت سام کی اولاد کے نام پر ہیں اور ان کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور فحشہ جو حضرت سام کے بیٹے ہیں ان کا بیٹا عجم کا مورث اعلیٰ ہے اور فحشہ کے اس بیٹے کا نام کیمورث ہے۔ کیمورث کے چھ بیٹے ہیں۔ سیانک، عراق، فارس، شام، تور اور دمنان کیمورث کے بیٹے جس جگہ گئے وہ جگہ ان کے نام سے موسوم ہوئی اور وہاں انہی کی اولاد آباد ہوئی۔ سیانک کے بڑے بیٹے کا نام ہوشنگ تھا اور عجم کے تمام بادشاہ "یزدجرد" تک اس کی اولاد میں سے ہیں۔

حضرت نوح کے دوسرے بیٹے یانث باپ کی ایما پر مشرق اور شمال گئے اور وہیں آباد ہو گئے۔ ان کے ہاں بھی بہت سے بیٹے پیدا ہوئے جن میں سب سے زیادہ مشہور بیٹا ترک نام کا ہے۔ ترکستان کی تمام قومیں یعنی مغل، ازبک ترکمانی سب انہی کی اولاد میں سے ہیں۔ یانث کے دوسرے مشہور بیٹے کا نام چین ہے۔ ملک چین کا نام اسی پر ہے۔ تیسرے بیٹے کا نام آرریسی ہے۔ اس کی اولاد شمالی ملکوں کی سرحد پر بحیر ظلمات تک آباد ہوئی۔ اہل تاجیک بھی اسی کی نسل سے ہیں۔

حضرت نوح کا تیسرا بیٹا حام اپنے والد گرامی کے حکم سے دنیا کے جنوبی حصے کی طرف گیا اور اس کو آباد اور خوشحال کیا۔ حام کے چھ بچے تھے۔ جن کے نام یہ ہیں، ہند، سندھ، حبش، انرج، ہرمز اور بویہ، ان سب بیٹوں کے نام پر ایک شہر آباد ہوا۔ حام کے سب سے بڑے بیٹے ہند نے ہندوستان ملک اپنایا اور اسے خوب آباد اور سرسبز وشاداب کیا۔

حام کے دوسرے بیٹے سندھ نے ملک سندھ میں

قیام کیا۔ٹھٹھہ اور ملتان کو اپنے بیٹوں کے نام سے آباد کیا۔

ہند کے ہاں چار بیٹے ہوئے جن کے نام یہ ہیں۔

پورب، دکن، بنگ، اور نہروال۔

جو ملک اور شہران ناموں سے مشہور ہیں وہ انہی کے آباد کیے ہوئے ہیں۔

ہند کے بیٹے دکن کے گھر تین بیٹے پیدا ہوئے جن کے نام مرہٹ، کنہڑا اور تلنگ ہیں۔ آج کل دکن میں جتنی قومیں آباد ہیں وہ سب انہی کی نسل میں سے ہیں۔

ہند کے چوتھے بیٹے نہروال کے ہاں بھی تین بیٹے ہوئے، جن کے نام بھروج، کنباج اور مالداج ہیں۔ ان تینوں کے نام پر بھی مختلف شہر آباد ہوئے بہت سے شہروں میں ان کی اولادیں آج تک آباد ہیں۔

ہند کے تیسرے بیٹے کی اولاد نے ملک بنگال آباد کیا۔ اس کی اولادیں بھی آج تک بنگال میں آباد ہیں۔

ہندو عقیدے کے مطابق ست یگ، تر تیا یگ، دوا پر یگ اور کل یگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور کسی بھی یگ میں جس شخص کا اختتام ہو، اسی یگ میں اس شخص کی دوبارہ نمود ہوتی ہے اور ان یگوں کے درمیان اتنے طویل برسوں کا فاصلہ طے ہوتا ہے کہ انسان تصور نہیں کر سکتا۔

بہر حال یہ ہندو عقیدہ ہے اور چمپا کلی کی کہانی بھی اس عقیدے سے تعلق رکھتی ہے۔ مہا بھارت ہو چکی۔ ہندوستان میں کوروؤں کا پانڈوؤں کا دور ختم ہو گیا مہاراج کی حکومت آئی۔ جنہوں نے حکومت کے سرداروں اور اپنے بھائی بندوں کی مدد سے اور مشورے سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی، اور ملک کو آباد کرنے اور حکومت کو بہترین طریقے پر چلانے کے لئے سخت محنت کی۔ مہاراج نے زراعت کی طرف بھی بہت زیادہ توجہ دی اور بے شمار نئے شہر آباد کیے۔

ان نئے شہروں میں بہار آباد کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ مہاراج نے دور دور سے اہل علم کو بلوا کر اس شہر کو آباد کیا۔ شہر میں بے شمار مدرسے اور عبادت گاہیں بنوائیں اور نواحی محاصل کی آمدنی کو ان عبادت گاہوں کے معارف کے لئے وقف کر دیا۔ مہاراج نے سات سو برس حکومت کی اور اس کے عہد حکومت میں ہندوستان کی حالت بالکل بدل گئی۔ اس نے شاہان ایران کے ساتھ ہمیشہ خلوص و محبت کا برتاؤ کیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اس کا بھتیجہ ناراض ہو کر فریدون کے پاس چلا گیا اور اس کے اپنے چچا کے خلاف مدد کی درخواست کی۔

فریدون نے ایک بہت بڑی فوج اس کی مدد کے لئے روانہ کی اور جب اس کی فوج کا سربراہ ہندوستان آیا تو اس نے بہت سے آباد شہروں کو ویران کر دیا۔

مہاراج نے جب یہ عالم دیکھا تو اس نے اپنے ملک کا ایک حصہ دے کر اپنے بھتیجے کو راضی کر لیا اور چند عمدہ اور قیمتی اشیاء فریدون کو بطور تحفہ بھیجیں۔

مہاراج کے آخری زمانے میں سنگلدیپ اور کرناٹک کے زمینداروں نے آپس میں مل کر پوری قوت سے اس کا مقابلہ کیا۔ طرفین میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ مہاراج کا بیٹا لڑائی میں مارا گیا۔ مہاراج کی باقی ماندہ فوج زخمی اور پریشان ہو کر بھاگ نکلی اور اپنے مال و اسباب اور ہاتھیوں کو میدان میں ہی چھوڑ گئی۔

مہاراج نے جب یہ خبر سنی تو اسے سخت طیش آیا۔ وہ دم بریدہ سانپ کی طرح پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس پیچ و تاب اور غم و غصہ کا اصل سبب یہ تھا کہ سرکشی دکن کے معمولی زمینداروں کی تھی۔

مہاراج نے اس شکست کا انتقام لینے کا پکا ارادہ کر لیا۔ لیکن اس زمانے میں بادشاہ ایران کے حکم سے ایرانی سردار سام بن نریمان ہندوستان فتح کرنے کے لئے پنجاب کی سرحدوں تک پہنچ چکا تھا اور مال چند سپہ سالار و بقیہ فوج لے کر اس کے مقابلے پر گیا ہوا تھا۔ چنانچہ مہاراج کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑا۔ جب تک کہ مال چند سردار سے صلح کر کے واپس نہ آ گیا۔ مال چند ایک سپہ سالار کی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا ہے، ملک مالوہ ابھی تک اس کے نام سے مشہور ہے۔ جب وہ مہاراج کے پاس واپس پہنچا تو اسے دکن جانے کا حکم ملا۔ اور اس نے بڑے استقلال اور شان و شوکت کے ساتھ ملک دکن کا فوراً رخ کیا۔ جب دشمنوں نے اس کی

آمد کی خبر سنی تو ہراساں ہو کر ادھر ادھر بھاگ نکلے۔
مال چند نے فساد پھیلانے والے گروہ کو بری طرح تہہ کیا کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اس نے جابجا تھانے اور چوکیاں قائم کیں اور فاتح و کامران ہو کر واپس آیا۔ راستے میں اس نے گوالیار اور بیانے کے قلعے تعمیر کروائے اور راگ کا علم جو موسیقی کے نام سے مشہور ہے، دکن اور تلنگا سے لا کر ہندوستان میں مروج کیا۔

مہاراج نے سات سو سال عمر پائی، ان کے چودہ بیٹے تھے۔ جن میں سب سے بڑا اشیشوراج اپنے باپ کا جانشین تھا۔ یوں ادوار بدلتے رہے۔ حکومتیں آتی رہیں، ختم ہوتی رہیں اور ہندوستان میں بت پرستی کا رواج شروع ہو گیا۔

مہاراج ہی کے زمانے میں ایران سے ایک شخص ہندوستان آیا اور اس نے یہاں کے لوگوں کو آفتاب پرستی کی تعلیم دی۔ اس کی تعلیم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ ستارہ پرست لوگ بھی آگ کی پرستش کرنے لگے۔ لیکن اس کے بعد جب بت پرستی کا راج مروج ہوا تو یہی طریقہ سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ بت پرستی کو اس درجہ مقبولیت اس سبب سے ہوئی کہ ایک برہمن نے راجہ کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ جو شخص اپنے بزرگوں کو سونا چاندی یا پتھر کی تشبیہ بنا کر اس کی پرستش کرتا ہے وہ اس سیدھے راستے پر ہوتا ہے۔ اس عقیدے کو لوگوں نے اس حد تک اپنایا کہ ہر چھوٹا بڑا اپنے بزرگوں کے بت بنا کر ان کی پرستش کرنے لگا اور انہیں پوجنے لگا۔

اس زمانے کے راجہ خود راجہ سورج نے بھی دریائے گنگا کے کنارے شہر قنوج آباد کر کے وہاں بت پرستی شروع کی اور اس کی رعیت نے اپنے فرمانروا کی تقلید کی اور ہر کوئی اپنے اپنے طور پر بت پرستی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں بت پرستوں کے نوے گروہ پیدا ہو گئے۔

راجہ سورج نے چونکہ قنوج کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا تھا۔ اس لئے اس شہر کی آبادی میں بے حد اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ شہر کا پھیلاؤ پچیس کوس تک بڑھ گیا۔ راجہ سورج کی مدت حکومت دو سو پچاس برس ہے۔ اس مدت کے بعد اس نے انتقال کیا۔

راجہ سورج ایرانی شاہ کیقباد کا ہم عصر تھا اور ہر سال اسے خراج ادا کرتا تھا۔ راجہ سورج کے ہاں پینتیس بیٹے پیدا ہوئے جن میں سب سے بڑا لہراج تھا اور جو راجہ سورج کے مرنے کے بعد اس کا جانشین ہوا۔

وہ دور جو لہراج کو ملا بت پرستی کا دور تھا۔ لہراج نے اقتدار سنبھالتے ہی اپنے نام کی مناسبت سے ایک شہر آباد کیا۔ جس کا نام لہراج رکھا گیا۔ ہندوستان کے اس بادشاہ کو موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ اپنے اس شغف میں گزارا۔ راجہ سورج نے اپنی زندگی میں شہر بنارس کی بنیاد رکھی تھی لیکن وہ اپنی زندگی میں اس شہر کو بسا نہیں سکا تھا۔ لہراج نے اس شہر کو بسانے کی پوری پوری کوشش کی۔ بہر حال لہراج اپنے بے شمار نشان چھوڑ کر اپنی حکومت چھوڑ کر کیدار برہمن کے ہاتھوں مارا گیا۔ لہراج نے چھبیس سال حکومت کی۔

کیدار نے انیس سال حکومت کی اور اس کے بعد شنکل نے کیدار کو شکست دے کر خود کو ہندوستان کا فرمانروا بنا لیا۔ گور نامی شہر شنکل کا آباد کردہ ہے۔ شنکل نے ہندوستان پر چونسٹھ برس حکومت کی۔

شنکل کے بعد اس کا بیٹا برہٹ تخت نشین ہوا۔ برہٹ نے اکیاسی سال حکومت کی اور مر گیا۔ اس راجہ کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لئے اس کے مرنے کے بعد ملک میں طوائف الملوک کا دور دورہ ہو گیا۔ تب کھواہہ قوم کے ایک شخص مہاراج نے قنوج پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان کا راجہ بن گیا۔

مہاراجہ کچھواہہ نے چالیس سال تک حکومت کی اور وفات پا گیا اور حکومت کی باگ دوڑ مہاراج کی وصیت کے مطابق اس کے بھانجے کیدراج کے ہاتھ آئی۔ کیدراج کی موت کے بعد یہ حکومت جے چند نے حاصل کر لی جو کیدراج کا سپہ سالار تھا۔ اس نے کیدراج کے مرتے ہی قوت و اقتدار حاصل کر کے سلطنت پر

قبضہ کرلیا اور راجہ بن بیٹھا۔ یہ وہی یگ تھا جس میں دریودھن اپنے غلط فیصلے کا شکار ہوا تھا اور رانی کندھاری نے چمپاکلی پر ستم ڈھایا تھا۔

جے چند کے دور حکومت میں بہت بڑا قحط پڑا اور چونکہ وہ شاہی خاندان سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے عوام الناس کی کوئی پروانہ کی اور خود داد عیش دیتا رہا۔ رعایا کی جانیں ضائع ہوئیں اور اکثر گاؤں اور قصبے تباہ ہوئے۔ اس کے نتیجے میں ایک طویل عرصے تک ہندوستان شدید مشکلات کا شکار رہا۔ امراء اور سلطنت کے بڑے بڑے لوگوں نے اس کو خاطر میں لانا چھوڑ دیا اور ملک میں جگہ جگہ بغاوتیں ابھرنے لگیں۔ یوں جے چند ہزار مشکلات میں پڑ گیا۔ وہ اکثر چھوٹی چھوٹی بغاوتیں ختم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن لوگ اس کے سخت خلاف تھے۔ اس کی رانی شردھا جو ایک چھوٹے سے راجہ یدراج کی بیٹی تھی۔ بڑی زیرک اور سمجھدار تھی۔

شردھا جے چند کی پانچویں بیوی تھی۔ اس سے پہلے جے چند چار شادیاں کر چکا تھا۔ ہندو دھرم کے خلاف اس نے بہت سی عورتوں کو یوں بھی رکھ چھوڑا تھا۔

رانی شردھا زندگی میں صرف تین بار جے چند کی خلوت حاصل کر سکی تھی۔

جے چند کی اتنی رانیاں تھیں لیکن اس کے باوجود اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ جب رانی شردھا اس کی بیوی بنی تو اس کے کچھ عرصے بعد اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ یوں رانی شردھا جے چند کی منظور نظر بن گئی۔

جے چند نے بیٹے کی پیدائش پر پورے ملک میں خوشیاں منائی تھیں۔ لیکن اس کی خوشیوں کا ساتھ دینے والے بہت کم لوگ تھے۔ صرف راجدھانی میں کچھ گھرانے ایسے تھے جو جے چند کی خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔ ورنہ زیادہ تر لوگ صرف جے چند کی فوجوں کی وجہ سے اس جشن میں شریک تھے۔

جے چند کا بیٹا گیارہ سال کا ہوا تو جے چند کو ایک بہت بڑے خطرے کا سامنا درپیش ہوگیا۔

یہ خطرہ راجہ کیدو کا تھا جس نے جے چند کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔

جے چند چونکہ اپنی پوری زندگی میں سکون نہیں پاسکا تھا۔ اس لئے وہ صحت کی طرف سے بھی فکرمند تھا۔ اس کی صحت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس کے وزراء اور امراء اسے مشورہ دے رہے تھے کہ وہ بھین و داراب کے علاوہ راجہ کیدو کو بھی خراج ادا کرے۔ لیکن ایک ہندو راجہ کو خراج ادا کرنا جے چند کے لئے بہت ہتک آمیز تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے امراء اور وزراء کی بات نہ مانی اور جنگ کی تیاریاں کرنے میں مصروف ہوگیا۔

رانی شردھا کو یہ امید تھی کہ جے چند نے اپنی زندگی میں اس کے ساتھ جو سلوک بھی کیا ہو یہ الگ بات ہے لیکن کم از کم اس کی موت کے بعد حکومت اس کے بیٹے تلک دیو کو ضرور مل جائے گی اور جب تلک دیو کی حکومت ہوگی تو رانی شردھا یقیناً ایک مطلق العنان رانی بن جائے گی۔

چنانچہ تلک دیو کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ اور تلک دیو کو فنون سپاہ گری میں طاق کرنے کے لئے اس نے بہت سے لوگ رکھے ہوئے تھے۔

رانی شردھا کو پنڈت گردھاری لال سے بہت عقیدت تھی۔ جو دریا پار کے ایک مندر میں جیون بتاتے تھے ان کی عمر بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ سر کے سارے بال اور بھنویں سفید ہو چکی تھیں۔ لیکن لوگ ان کے گیان ان کے علم کے بڑے قائل تھے اور مہینے کے پہلے منگل کو دریا پار کر کے لوگ پنڈت گردھاری لال کے مندر ضرور جاتے تھے اور وہاں جا کر پوجا کرتے تھے۔

جے چند خود بھی گرو گردھاری لال کا بہت بڑا عقیدت مند تھا اور جب بھی اسے فرصت ملتی وہ ان سے مشورہ لینے کے لئے چلا جاتا تھا۔

ایک بار رانی شردھا بھی گرو گردھاری لال کے مندر میں راجہ جے چند کے ساتھ چلی گئی اور اسے پنڈت گردھاری لال سے بے حد عقیدت ہوگئی۔

گرو دیو نے اسے آشیرواد دی تھی اور کہا تھا کہ جلد ہی تیرے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام تو تلک دیو

رکھنا اور رانی شردھا نے گردن ہلا دی۔
چنانچہ جب تلک دیو پیدا ہوا اور رانی چھلے سے باہر آئی تو سب سے پہلے اس نے گرودیو کے مندر کا رخ کیا تھا اور کشتی میں بیٹھ کر ان کے پاس پہنچی تھی۔
پنڈت گردھاری لال نے تلک دیو کو دیکھا اور دیر تک کسی خیال میں گم رہے۔ انہوں نے اسے آشیرواد تک نہ دی تھی۔ جب رانی شردھا نے انہیں چونکایا تو وہ ہڑبڑا کے چونکے۔
''مہاراج کس سوچ میں ڈوب گئے؟'' رانی شردھا نے پوچھا۔
''کچھ نہیں دیوی بس بچے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' پنڈت گردھاری لال نے کہا۔
''کیوں! کوئی خاص بات ہے کیا؟''
''آں......!'' مہاراج جیسے پھر چونک پڑے۔
''نہیں کوئی خاص بات نہیں ہے، بس ایسے ہی نجانے اسے دیکھ کر میرے من میں ایک عجیب سا خیال ابھر آیا ہے۔''
''کیا خیال آیا ہے؟''
''میں اس خیال کو کوئی لفظ نہیں دے سکتا دیوی، لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس گرہ کو توڑ سکوں۔''
رانی شردھا پنڈت گردھاری لال کی بڑی عقیدت مند تھی۔ اس لئے وہ خود بھی یہ سن کر پریشان ہوگئی اور جب مہینے کے پہلے منگل کو وہ دوبارہ ان کے پاس گئی تو اس نے پھر وہی سوال کر دیا۔
''میں جاننا چاہتی ہوں گرو جی کہ آخر وہ کون سی گرہ تھی جو تلک دیو کو دیکھ کر آپ کے من میں پیدا ہوگئی۔''
''تو وشواش کر شردھا کہ ہم خود بھی اس کے سلسلے میں پریشان ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ اسے دیکھ کر ہمارے من میں کچھ مٹے مٹے سے خیالات کیوں پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن تو چنا مت کر اب کہ منگل کو جب تو آئے گی تو ہم اس کے بارے میں تجھے بہت کچھ بتائیں گے۔ ہم اس سلسلے میں جاپ کر رہے ہیں جو ہمیں ہماری کھوئی ہوئی یادداشت واپس دلا دے گا۔'' پنڈت گردھاری لال نے کہا۔
رانی شردھا بھی جے چند کی عدم توجہی کا شکار تھی۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد جے چند کے رویے میں کچھ تبدیلیاں ضرور ہوئی تھیں لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ رانی شردھا کسی خوش فہمی کا شکار ہو جاتی یا کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاتی۔ تاہم اسے یہ امید ضرور بندھ گئی تھی کہ تلک دیو جے چند کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ اگر دوسری رانیوں سے کوئی بیٹا پیدا ہو بھی گیا تو وہ کم از کم حکومت کا دعویدار نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے دل میں بہت سے خیالات تھے اور جس بات نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ پنڈت گردھاری لال کی بات تھی۔ چنانچہ ایک ماہ تک اس نے کانٹوں کے بستر پر لیٹ کر وقت گزارا اور بالآخر پنڈت گردھاری لال کے پاس پہنچ گئی۔
پنڈت گردھاری لال کی عبادت گاہ پر بے پناہ ہجوم تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ یاترا کرنے آئے ہوئے تھے اور پوجا پاٹ کا میدان بھرا ہوا تھا۔
رانی شردھا نے بھی عام لوگوں کی مانند پوجا پاٹ شروع کر دی۔ پنڈت گردھاری لال کی ہدایت تھی کہ مندر میں آنے کے بعد خود کو نہ کوئی راجہ سمجھے گا نہ رانی۔ یہاں آنے والے سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں اس لئے خود کو کوئی بھی بھگوان کے دوار آکر بڑائی نہ دے۔ چنانچہ یہ یہاں کا اصول تھا کہ اگر جے چند بھی یہاں آتا تو عام لوگوں کی طرح آتا اور پوجا پاٹ کر کے چلا جاتا تھا۔
ہاں جب تمام لوگ چلے جاتے تو پنڈت گردھاری لال اگر کوئی خاص بات ہوتی تو جے چند یا رانی شردھا کو کوئی خاص وقت دے دیا کرتے تھے۔ چنانچہ پوجا پاٹ میں خاصی رات بیت گئی۔
کافی دیر ہو چکی تھی۔ یاتری آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے اور رانی شردھا ایک کونے میں بیٹھی ان سب کے چلے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ پرشاد تقسیم ہو چکی تھی۔ تھوڑی سی پرشاد انہیں بھی ملی جس میں ایک ننھا سا حصہ تلک دیو کا بھی تھا جو ابھی رانی کی گود میں ہی تھا۔

جب تمام یاتری چلے گئے تو پنڈت گردھاری لال نے شردھا کو بلا لیا۔

شردھا نے آگے بڑھ کر ان کے چرن چھوئے اور پنڈت گردھاری لال نے اس کے سر پر ہاتھ دیا۔ پھر انہوں نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا اور بولا۔

میں جانتا ہوں شردھا تیرے من میں بھی وہی کشٹ ہوگا جو میرے من میں ہے۔ پرنتو تیرے من میں یہ کشٹ زیادہ ہوگا۔ کیونکہ تو ماں ہے۔ راجکمار تلک دیو کی ماں۔ میں نے پچھلے سات دن جاپ کیا اور اس گرہ کو کھولنے کی کوشش کرتا رہا جو میرے ذہن میں موجود تھی۔ تو شواش کر اس بات کا کہ اس کا تعلق تلک دیو سے نہیں ہے۔ البتہ تلک دیو کسی حد تک ملوث ضرور ہو جاتا ہے۔ پر میری زندگی کے لئے ایک بڑا عجیب ایک بڑا انوکھا انکشاف ہوا ہے۔"

"میں پوچھ سکتی ہوں مہاراج کہ وہ انکشاف کیا ہے؟" رانی شردھا نے پوچھا۔

"کچھ نہیں رانی شردھا میں نے جاپ کیا اور مجھے کچھ ایسی باتیں یاد آئیں کہ میں حیران رہ گیا۔ مجھے ایک گپھا یاد آ گئی جو پہاڑوں میں تھی۔ یہ گپھا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور نا ہی اس کے بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ میں نے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ جیون بتایا ہے۔ پرنتو کبھی کسی نے اس گپھا کا ذکر نہیں کیا۔ پھر وہ گپھا جو جاپ کے درمیان میرے من کی آنکھوں نے دیکھی عالم وجود میں آ گئی تھی۔ چنانچہ رانی میں نے اس کی تلاش میں ایک لمبا سفر کیا اور بالآخر میں ان پہاڑوں تک پہنچ گیا۔ جو مجھے جاگتے میں نظر آئے تھے۔

جاپ کے دوران میں نے ان پہاڑوں کو دیکھا۔ پہاڑ کے دامن میں دریا کے اس کنارے ایک عجیب سی جگہ ہے۔ مجھے اس جگہ سے تھوڑی سی دور ایک بستی کے آثار بھی ملے ہیں، بس ایسے آثار جنہیں کوئی دیکھے تو یہ نہ سمجھ سکے کہ یہاں کوئی بستی آباد تھی۔

لیکن میری آنکھوں نے چونکہ جاپ کے دوران یہ سب کچھ دیکھا تھا اس لئے میں نے ڈھونڈ کر وہ نشانات

اچھی باتیں

زمین انسان کو رزق دیتی ہے لیکن جب انسان مرتا ہے تو پھر وہ اسے اپنا رزق بنا لیتی ہے۔

پرندہ زندہ ہو تو چیونٹیاں کھاتا ہے، مگر جب پرندہ مر جاتا ہے تو چیونٹیاں اسے کھاتی ہیں، وقت کبھی بھی بدل سکتا ہے۔

ایک درخت ایک لاکھ ماچس کی تیلیاں بنا سکتا ہے مگر ماچس کی ایک تیلی ایک لاکھ درخت جلا سکتی ہے۔

تو زندگی میں کبھی کسی کو مت ستانا، اس وقت شیاد آپ طاقتور ہوں، مگر وقت آپ سے زیادہ طاقتور ہے۔

(احسان سحر۔میانوالی)

تلاش کر ہی لئے۔ پھر ان نشانوں سے کچھ دور مجھے وہ پہاڑی بھی نظر آ گئی جو میں نے جاپ کے دوران اپنے من میں دیکھی تھی۔

اس پہاڑی کی گپھا کے سامنے ایک پتھر موجود ہے۔ یہ پتھر اگر کوئی گزرنے والا دیکھے تو اسے ایسی چٹان سمجھے جو عام چٹانوں کی طرح ہو۔ لیکن مجھے چونکہ یہ معلوم ہوا تھا کہ اس پتھر کے نیچے ایک گپھا موجود ہے۔ چنانچہ میں نے اس پر زور لگایا اور رانی شردھا تو شواش کر وہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ پتھر کے ہٹ جانے کے بعد مجھے ایک لمبی سرنگ نظر آئی جس میں سے گزر کر میں ایک ایسے سوراخ میں پہنچ گیا جس کے دوسری طرف سے روشنی اندر آ رہی تھی۔ یہ روشنی سورج کی تھی جو ایک سوراخ سے غار میں پڑ رہی تھی۔

میں غار میں داخل ہوا تو مجھے وہاں صرف چند چیزیں ملیں۔ ایک مرگ چھالہ جو اتنی خستہ اور خراب ہو چکی تھی کہ جسے چھوؤ تو ٹوٹ کر بکھر جائے۔ پانی کا ایک کلسا جو جوں کا توں موجود ہے۔ البتہ اس پر زمانے کی گرد جم چکی ہے۔ ہاں گپھا میں پانی کا ایک کنڈل بھی

موجود تھا اور دو کھڑاویں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے وہ کھڑاویں اپنے پاؤں میں پہن کر دیکھیں تو وہ مجھے بالکل ٹھیک تھیں۔ گو ان کی لکڑی اب اتنی بوسیدہ ہو چکی تھی کہ جونہی میرے پاؤں کا وزن ان پر پڑا وہ ٹوٹ گئیں۔ لیکن وہ میرے پاؤں میں بالکل ٹھیک تھیں۔ کنڈل بھی میرے اٹھانے سے بالکل ٹوٹ گیا۔ صرف پانی کا کلسا رہ گیا۔ جسے میں اٹھا کر اپنے ساتھ لے آیا ہوں، گو یہ چیزیں میری نہیں تھیں۔ لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میرا ہو۔ ان چار چیزوں کے علاوہ گھپا میں کچھ نہیں تھا۔ آ رانی شردھا میں تجھے اس کلسا کا درشن کراؤں۔"

رانی شردھا اٹھ گئی۔ حالانکہ ان تمام باتوں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن پنڈت گردھاری لال کی عقیدت کی وجہ سے اس نے اس کلسے کے درشن کر لئے۔

کلسے کو دیکھ کر نجانے کیوں رانی شردھا کے ذہن میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ایک عجیب سا احساس اس نے پہلے بھی کبھی اس کلسے کو دیکھا ہو۔ لیکن پھر یہ احساس ایک لمحے میں مفقود ہو گیا۔ پنڈت گردھاری لال البتہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ میرے جیون سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔ بہر صورت میں ان گھپاؤں سے واپس آ گیا اور اس کے بعد میں پاتے گیان کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ آخر اس گھپا کا کیا راز ہے۔"

تب رانی شردھا میرے ذہن میں تلک دیو ابھرا اور تلک دیو کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔ اسے دیکھ کر میرے من میں جو گرہ پڑ گئی تھی۔ اس کی گتھیاں الجھتی سلجھتی رہیں۔ بالآخر پھر تلک دیو تک پہنچ گئیں۔ اب میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تلک دیو کا آخر ان ساری باتوں سے کیا تعلق ہے۔"

"مہاراج کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے۔" رانی شردھا نے پوچھا۔

"نہیں رانی ایسی کوئی بات نہیں ہے، میرا گیان کہتا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق کسی بھی طرح تلک دیو سے ہو، لیکن اس میں تلک دیو کے جیون کے لئے کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے خطرناک کہا جا سکے۔"

"بس میں من کی یہی شانتی چاہتی تھی۔" رانی شردھا نے کہا۔

"تو اپنے من کو شانت رکھ شردھا، تیرے لئے چنتا کی کوئی بات نہیں ہے میں موجود ہوں۔ اور پھر میں اس مسئلے کو یوں ہی نہ چھوڑ دوں گا۔ ابھی میں ایک بڑا جاپ کروں گا۔ یہ جاپ اکتالیس دن کا ہوگا۔ لیکن یہ میں اس سے شروع کروں گا جب اس کا صحیح وقت ہوگا۔ چنانچہ اس جاپ کے بعد یہ ممکن ہے کہ مجھے بہت کچھ معلوم ہو جائے۔"

رانی شردھا نے گردن ہلا دی اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مہاراج رات بہت بیت گئی ہے۔ ہمیں ابھی دریا پار کرنا ہے۔ یوں بھی یہ موسم ایسا ہے کہ دریا کے پانی کا بہاؤ کافی تیز ہے۔ چنانچہ اب میں آ گیا چاہتی ہوں۔"

"بھگوان تجھے سکھی رکھیں شردھا۔" پنڈت گردھاری لال نے کہا اور رانی شردھا مندر سے نکل آئی۔ شاہی کشتی کے کشتی بان دریا کے کنارے بیٹھے رانی شردھا کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

شردھا اپنے بچے کو کاندھے سے لگائے باندیوں کے ساتھ کشتی کے نزدیک پہنچ گئی۔ باندیاں اپنی کشتیوں میں بیٹھ گئیں۔

دریا میں کافی شور ہو رہا تھا۔ پانی کی روانی کچھ اور بڑھ گئی اور ملاحوں کے چہرے متفکر تھے۔

"کیا بات ہے تم لوگ کچھ پریشان سے ہو۔" رانی شردھا نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے، رانی جی، بس ندی کا بہاؤ کچھ تیز ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پہاڑوں پر کہیں بارش ہوئی ہو اور بارش کا پانی اکٹھا ہو کر ندی میں اضافے کے باعث بن گیا ہو۔" کشتی بانوں نے

جواب دیا۔

"کیا اس باڑھ میں کشتی کا کھینا خطرناک تو نہیں ہوسکتا۔" رانی شردھا نے پوچھا۔

"نہیں، رانی جی! ابھی باڑھ اتنی تیز نہیں ہوئی ہے۔ ہم اطمینان سے پہنچ جائیں گے۔" کشتی بانوں نے جواب دیا۔ وہ تجربہ کار ملاح تھے اور کشتی کی باڑھ ان کے لئے کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ انہوں نے کشتی دھکیل کر پانی میں ڈال دی۔ رانی شردھا کشتی میں سوار ہوگئی تھی۔

لیکن ابھی کشتی تھوڑی ہی دور چلی تھی کہ پیچھے سے پانی کا ایک خوفناک ریلا آیا اور کشتی اس پر ڈول گئی۔ رانی نے پوری قوت سے بچے کو سینے سے بھینچ لیا تھا۔ پھر وہ متوحش لہجے میں ملاحوں سے بولی۔

"یہ کیا بات ہے، کیا کشتی خطرے میں ہے؟"

ملاحوں کے چہروں پر بھی تشویش کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔ انہوں نے کسی قدر متفکر لہجے میں کہا۔

"نہیں رانی جی! ابھی کوئی بڑا خطرہ تو نہیں ہے لیکن آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ پانی کی ایک بڑی باڑھ اس پانی میں اور شامل ہوگئی ہے۔ اس لئے کشتی کافی پریشانی میں پھنس چکی ہے۔" ملاح نے جواب دیا۔

"میں تم لوگوں سے پہلے ہی پوچھ رہی تھی کہ اگر خطرہ ہو تو اس سے کشتی کو پانی میں نہ ڈالو۔ مگر تم لوگوں نے اپنی حد سے زیادہ تجربہ کاری کا ثبوت دیتے ہوئے مجھے کشٹ میں ڈال دیا ہے۔"

"ہم شما چاہتے ہیں رانی جی! لیکن آپ دیکھ رہی ہیں کہ اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہے پانی اچانک ہی آیا ہے۔" ملاح نے جواب دیا۔

رانی شردھا خاموش ہوگئی۔ لیکن اس کی نگاہیں خوفزدہ انداز میں پانی کو دیکھ رہی تھیں۔ جس میں بڑے بڑے بلبلے اُٹھ رہے تھے اور پانی پوری قوت سے بہتا ہوا آرہا تھا۔ کشتی کی رفتار ملاحوں کے بس سے باہر ہوتی جارہی تھی اور وہ تیز رفتار سے بہنے لگی تھی۔ ملاحوں کے چہروں پر کچھ اور خوف کے آثار نمودار ہوگئے تھے۔

"رانی جی، ایک اور پریشانی آگئی ہے۔ اگر آپ ہمیں جان کی معافی دیں تو بتائیں۔"

"بتاؤ...... بتاؤ۔" رانی شردھا خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"باڑھ اب اتنی تیز ہوگئی ہے کہ کشتی کو اب کنارے کی طرف کاٹنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے اس بات کا۔ کیا کشتی کنارے تک نہیں پہنچ سکے گی؟" رانی شردھا نے کہا۔

"نہیں دیوی جی کشتی کنارے تک پہنچ جائے گی لیکن ہم اسے کاٹیں گے نہیں۔"

"کیا مطلب......؟"

"بادبانوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چپو اس تیز بہاؤ میں ہمارے بازوؤں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ چنانچہ ہمیں ایک ہی ترکیب کرنی ہے۔"

"وہ کیا......؟" رانی شردھا نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا۔

"ہم کشتی کو بائیں سمت آہستہ آہستہ چھوڑے دیتے ہیں۔ یہ اپنی رفتار سے جس تیزی سے آگے بڑھے گی ہم اس وقت اسے پوری قوت سے کناروں کی طرف کاٹیں گے۔ یوں آہستہ آہستہ اس کا رخ بدلتا جائے گا۔ اور کشتی کے ٹوٹنے کا خطرہ بھی نہیں رہے گا۔" ملاح نے جواب دیا۔

"ہائے رام، تو کیا کشتی ٹوٹنے کا بھی خطرہ ہے؟" رانی شردھا نے پوچھا۔

"دیوی جی بھگوان پر بھروسہ کریں۔ بھگوان جو کرے گا اچھا ہی کرے گا۔" ملاحوں نے جواب دیا۔ ان کے چہرے دُھواں دُھواں ہورہے تھے وہ خود زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے چند کو تو اپنی موت کا خیال بھی نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ سوچ رہے تھے کہ اگر رانی شردھا کسی حادثے کا شکار ہوگئی تو ان کے خاندانوں تک کی خیر نہیں ہے۔ وہ اپنے جسم کی پوری قوت سے کشتی کو کنارہ کی جانب کاٹ رہے تھے۔ لیکن بدقسمتی ان کی کہ ان کی کوئی کوشش کارگر ہی نہ ہونے دے رہی تھی۔

کشتی کی رفتار طوفانی ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہی تھی اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پانی پر کسی تنکے کی طرح ڈول رہی تھی۔ بادبانوں سے خاص طور سے خطرہ تھا۔ اگر بادبان میں ہوا بھر گئی اور کشتی ایک طرف ہوگئی تو پانی کی تیز دھار اسے اُلٹ دے گی۔ چنانچہ ملاحوں نے پہلی کوشش یہی کی کہ بادبان اتار دیئے جائیں۔ اس تیز رفتار سفر میں بادبانوں کا اتارنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے لمبے لمبے چاقوؤں سے بادبانوں کے رسے کاٹ دیئے اور بادبان ہوا میں اڑتا ہوا نجانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کشتی کی برق رفتاری اسے آن کی آن میں میلوں دور تک لے گئی اور کشتی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ اصل جگہ سے کتنی دور نکل آئی ہے۔ ملاحوں کی ہر تدبیر ناکام ہو رہی تھی اور جب امید کی آخری ڈور بھی ٹوٹ گئی تو ملاح ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے۔

"رانی جی...... رانی جی، بھگوان کی سوگند اس میں ہمارا کوئی دوش نہیں ہے۔ ہمیں شما کر دیں۔ ہم نے اپنے نمک کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

رانی شردھا ان کے چہروں کی سراسیمگی سے ان کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اپنے خوب صورت بچے کی جانب اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

"ہائے رام، کیا تلک دیو اتنی سی عمر کے لئے اس سنار میں آیا تھا۔" پھر اس نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"ہائے بھگوان اگر تیرا دیا ہو جائے تو میں اپنا جیون اپنے بچے کو دینے کے لئے تیار ہوں۔ تو میرا جیون چھین لے اور میرے تلک دیو کو میرا جیون دے دے۔" رانی شردھا نے درد بھری آواز میں کہا اور باندیوں کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ سب اپنی زندگی سے ہی خوفزدہ تھیں۔

لیکن رانی شردھا کی درد بھری بات سن کر وہ اپنا دکھ بھول گئیں۔ ان سب کے آنسو رواں ہوگئے۔

ملاح جی چھوڑ بیٹھے تھے۔ کشتی اب کسی دم کی مہمان تھی اور کبھی کبھی وہ پوری کی پوری گھوم جاتی تھی۔ جس وقت وہ گھومتی تو باندیاں ایک دوسرے پر گر پڑتیں۔

لیکن اب باندیوں نے رانی شردھا کے گرد اپنا حلقہ بنا لیا تھا۔ تاکہ رانی شردھا ادھر سے ادھر نہ گرنے پائیں۔

پانی کی ایک تیز لہر نے کشتی کو بہت اونچا اٹھا لیا۔ ملاحوں کو یقین ہوگیا کہ اس کے بعد کشتی نیچے آئے گی تو فوری طور پر یا تو بیچ میں سے ٹوٹ جائے گی یا پھر ڈوب جائے گی۔ وہ اپنی موت کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن نجانے کیا ہوا، نجانے کیا ہوا، کشتی کی رفتار ایک دم کم ہوگئی۔

یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی چیز پر چڑھ گئی ہو۔ لہروں کے جو ہلکورے کشتی کے نیچے محسوس ہوتے رہے تھے، یک لخت تھم گئے تھے۔ اور وہ لوگ جو اب کسی بھی لمحہ موت کے منتظر تھے اس اچانک سکوت اور خاموشی پر اس انداز میں ساکت رہ گئے تھے جیسے متوقع ہوں کہ اب زندگی کا وہ آخری لمحہ آن پہنچا ہے جو انہیں موت کی آغوش میں پہنچا دے گا اور وہ زندہ نہ بچ سکیں گے۔ یہ خاموشی، یہ خاموشی اور سکوت موت کی آمد کے استقبال کا سکوت ہے۔

لیکن موت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کب آئے گی کوئی اس کی نشاندہی نہیں کرسکتا۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جب وہ زندگی کی طرف دوڑ رہے تھے تو موت ان کا خوفناک تعاقب کر رہی تھی۔ اور جب وہ موت سے شکست کھا کر اس کے پہلو میں جانے کے لئے تیار ہوگئے تو اچانک زندگی نے موت کے سامنے فولادی دیوار بنا دی۔

ملاحوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کشتی خشکی پر چڑھی ہوئی تھی۔ یہ کیسی خشکی تھی اور کون سا ساحل تھا۔ اس کے بارے میں اس تاریک اور طوفانی رات میں ملاح کچھ نہیں بتا سکتے تھے۔

لیکن یہ یقین کرنے میں انہیں کافی وقت پیش آئی کہ کشتی خشکی پر ہے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس ساحل کو دیکھ رہے تھے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے یہ کون سی جگہ ہے۔

بہر صورت جگہ کوئی سی بھی ہو۔ لیکن چند ساعت کے بعد وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ اس وقت جب انہیں یہ یقین ہوگیا یہ درحقیقت یہ کوئی واہمہ نہیں ہے بلکہ وہ ساحل سے آلگے ہیں اور تیز رفتار دریا اس ساحل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

رانی شردھا بھی آنکھیں بند کئے اپنے بچے کو سینے سے بھینچے بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس بات کا شدید دکھ تھا کہ وہ اپنے نونہال کی بہاریں نہ دکھا سکی اور اس حادثے کا شکار ہوگئی۔

لیکن اسے بھی جب کچھ سکوت محسوس ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور ملاح کو آواز دی۔

''کیا ہوا، یہ اچانک کشتی کا بہنا کیسے بند ہوگیا؟'' اس نے پوچھا۔

''بدھائی ہو مہارانی بدھائی ہو۔ بھگوان نے ہمارا جیون بچالیا ہے۔'' ملاح نے خوشی سے کہا اور رانی شردھا بھی بچوں کی مانند خوش ہوگئی۔

''سچ۔'' اس نے تحیر بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں رانی جی۔ بھگوان نے ہماری لاج رکھ لی۔ ورنہ ہم تو موت کے بعد بھی اس بات پر شرمندہ رہتے کہ رانی جی کو ہمارے ہاتھوں تکلیف پہنچی۔''

''اب فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ جلدی سے کشتی سے اترو میری طبیعت بگڑ رہی ہے۔'' شردھا نے کہا اور اس کے نزدیک بیٹھی باندیاں چونک پڑیں۔

سب کے سب موت کے خوف کا شکار تھے اور چند ساعت کے لئے وہ سب حفظ و مراتب بھول گئے تھے۔ باندیاں یہ بھی بھول گئی تھیں کہ وہ رانی کے ساتھ سفر کر رہی ہیں اور ان کی ذمہ داری کیا ہے۔ موت بڑی خوفناک چیز ہے۔ اور زندگی بھر آدمی اقتدار کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے۔ لیکن جب موت نزدیک آجائے تو سارے اقدار، سارے حفظ و مراتب، سمندر میں بہہ جاتے ہیں، باندیوں کا بھی اس وقت تک یہی حال تھا، لیکن اب جبکہ انہیں زندگی کی امید ہوگئی تو انہیں یہ بھی خیال آیا کہ رانی شردھا کی خدمت ہی ان کا جیون ہے

اور اگر انہوں نے رانی شردھا کے لئے کچھ نہ کیا تو پھر جیون میں بھی ان کے لئے کانٹے ہی کانٹے ہوں گے۔

چند باندیوں نے جلدی جلدی خشکی پر کود کر رانی کو سنبھالا۔ رانی نے اپنے بچے کو سینے سے جدا نہ کیا تھا۔ ایک باندی نے اسے لینے کی کوشش کی تو رانی نے اسے منع کر دیا۔

''نہیں۔ میں اسے کسی کے حوالے نہیں کروں گی۔ بھگوان نے اسے دوبارہ میرے پاس بھیجا ہے۔ تم مجھے ایسے ہی سہارا دے کر اتارو۔'' اور باندیوں نے اسے سہارا دے کر نیچے اتار دیا۔ ملاحوں نے کشتی کو کچھ اور اوپر کھینچ لیا تھا۔

یہ تو بعد میں دیکھنے کی بات تھی کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ کون سا ساحل ہے۔ فی الوقت تو انہیں زندگی بچ جانے کی بے حد خوشی تھی۔

کشتی کو محفوظ جگہ لانے کے بعد وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ رانی باندیوں کے ساتھ جا بیٹھی تھی۔ وہ اب تک اپنے بچے کو سینے سے بھینچے ہوئے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ باندیوں نے اس کے گرد حلقہ قائم کرلیا تھا۔

ملاح ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ کونسی جگہ ہے۔ کشتی تو دریا کے بیچوں بیچ بہہ رہی تھی۔ پھر یہ ساحل اچانک کہاں سے آگیا اور ساحل بھی ایسا کہ اتنا ڈھلان تھا کہ کشتی اس پر باآسانی چڑھ گئی۔ ورنہ دریا کے ساحل تو ناہموار تھے۔

وہ رات کی تاریکی میں آگے بڑھے تو ان کے قدموں کے نیچے حسین سبزہ زار آگئے۔ گھاس کا یہ میدان دور تک چلا گیا تھا۔ گو تھوڑی سی چڑھائی تھی۔ لیکن اتنی نہیں کہ وہ کسی تکلیف کا شکار ہو جاتے۔

پھر انہوں نے درختوں کی قطاریں دیکھیں، درخت سرسبز و شاداب تھے، یہ حسین جگہ ان کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی اس حسین جگہ کو نہیں دیکھا تھا۔

گو درختوں کے سوکھے ہوئے پتے اور اس جگہ کی

حالت سے یوں لگتا تھا کہ یہاں انسانی وجود نہیں ہے جو اس جگہ کو صاف ستھرا کرتا۔ لیکن بہر صورت یہ انوکھی جگہ ان کی سمجھ میں بالکل نہ آئی۔

کافی دور تک جانے کے بعد بھی جب انہیں کوئی اندازہ نہ ہوا تو وہ واپس پلٹ کر رانی کے پاس چل پڑے اور رانی شردھا کے پاس پہنچ گئے اور پوچھا۔

''رانی جی کیا آپ اس جگہ کو پہچانتی ہیں؟''

''نہیں، کیوں کیا بات ہے؟''

''ہماری تو سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ کونسی جگہ ہے۔'' ملاحوں نے جواب دیا۔

''اوہ۔'' رانی شردھا کے ہونٹ سکڑ گئے۔ پھر وہ بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ اگر رات یہاں بیت جائے تو ہم یہاں بتالیں گے۔ صبح کو پتہ چل جائے گا کہ یہ کونسی جگہ ہے تم لوگ چنتا مت کرو۔'' رانی شردھا نے کہا۔

''جو آگیا مہارانی جی۔ پھر اب ہمارے لئے کیا حکم ہے۔''

''تم خود سمجھتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے، یوں کرو۔ اگر یہاں خشک ٹہنیاں ملیں تو انہیں ایک جگہ اکٹھا کرکے آگ جلادو۔ ممکن ہے یہاں خطرناک جانور بھی ہوں، ساری رات ہمیں جاگنا ہوگا، ہم اس سے تک سو نہیں سکتے جب تک کہ ہمیں یہ معلوم نہ ہوجائے کہ یہ کونسی جگہ ہے۔''

''آپ نے ٹھیک کہا مہارانی جی۔'' ملاحوں نے کہا اور پھر وہ رانی کی مرضی کے مطابق کام کرنے لگے۔

ساری رات رانی نے وہیں بیٹھ کر گزاری تھی۔ جگہ جگہ الاؤ روشن کردیئے گئے۔ اور ملاح ساری رات الاؤ میں خشک لکڑیاں ڈالتے رہے تھے۔ اور مختلف چیزیں ہاتھوں میں لے کر پہرہ دیتے رہے تھے کہ اگر کہیں سے کوئی جنگلی جانور نکل آیا تو اس کی حفاظت کی جاسکے۔

لیکن یہاں کسی جانور کا وجود نہیں تھا۔ ساری رات گزر گئی اور صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ پچھلی رات کا وہ خوفناک سفر اور پھر وہ حادثہ جس سے نجانے کس طرح زندگی بچ گئی تھی۔ رانی کے اعصاب پر بری طرح اثر انداز ہوا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ لیکن اس کے سینے سے گوشت کا جو لوتھڑا چپٹا ہوا تھا وہ اس میں زندگی کی حرارت دوڑا رہا تھا۔ اور اولاد جب ماں کی آغوش میں ہو تو ماں کی آغوش کبھی تھکن محسوس نہیں کرتی۔ خاص طور سے اس وقت جبکہ بچہ خطرے میں ہو۔

صبح کی روشنی ہوئی تو ملاح دوڑ کر دریا سے پانی لے آئے اور اس پانی سے رانی نے منہ ہاتھ دھویا۔ بال وال سنوار کر جب وہ تیار ہوئی تو باندیاں اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئیں۔

''اب تو راجکمار کو ہمیں دے دیجئے مہارانی، آپ تھک گئی ہوں گی، اب تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

اور رانی شردھا نے تلک دیو کو اپنی خاص خادمہ کی آغوش میں دے دیا۔ پھر بولی۔

''اس کا خیال رکھنا۔''

''آپ چنتا نہ کریں رانی جی۔'' باندی نے جواب دیا اور رانی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''پتا نہیں کونسی جگہ ہے اس سے پہلے تو ہم نے کبھی یہ جگہ نہیں دیکھی، یوں لگتا ہے جیسے ہم کافی دور نکل آئے۔'' رانی شردھا نے کہا۔

''ہاں رانی جی۔'' ایک باندی نے جواب دیا۔

''لیکن یہ فاصلہ اتنا ہے کہ کبھی ہم نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔'' دوسری باندی نے کہا۔

''ہاں ہم کافی دور آچکے ہیں اور میرا ابھی یہی خیال ہے کہ دور ہونے کی وجہ سے ہم اس راستے پر کبھی نہیں آئے۔'' رانی شردھا نے جواب دیا پھر بولی۔

''لیکن اب کیا ہوگا۔''

''کچھ نہیں ہوگا رانی جی، اب تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ رات کی بات دوسری تھی، آپ فکر نہ کریں ہم کسی نہ کسی طرح راستہ تلاش کرلیں گے، اور اس کے بعد اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔'' ملاحوں نے رانی کو یقین دلایا اور رانی سر ہلانے لگی۔

(جاری ہے)

حسد

ضرغام محمود-کراچی

دعا کے ختم ہوتے ہی برگد کے درخت کے نیچے دودھیا روشنی پھیل گئی تو دو سائے نظر آئے پھر ان دونوں کی حقیقت آشکار ہوگئی جسے دیکھ کر جسم و جاں پر سکتہ طاری ہونے لگا اور پھر اچانک......

کیا یہ حقیقت ہے کہ حسد انسان کو تہہ و بالا کر کے سکون چھین لیتا ہے-ثبوتِ کہانی میں ہے

میں ہمت کر کے بستر سے اٹھی، میرا سر بے حد بھاری ہو رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے سر پر منوں بوجھ لاد دیا ہو۔ میرا پورا بدن ٹوٹ رہا تھا حالانکہ رات میں ٹھیک ٹھاک سوئی تھی مگر صبح مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ میں ہمت کر کے اٹھی اور صحن میں لگے نل تک پہنچی، میرا مقصد وضو کرنا تھا کیونکہ فجر کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ میں نے نل کھول کر وضو کرنا شروع کیا پتہ نہیں مجھے کیا ہو رہا تھا کہ میں بار بار وضو کر کے بھول رہی ہوں۔ منہ دھونے جاتی ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ میں نے کلی نہیں کی، میں نے بار بار سر کو جھٹک کر پریشان کن خیالات سے پیچھا چھڑانا چاہا خیر جیسے تیسے وضو کر کے میں نے جائے نماز بچھائی اور نماز کے لئے کھڑی ہوئی کہ شدید بدبو کے بھبکے میری ناک میں گھسنے لگے تو میرا دم گھٹنے لگا اور مجھے ابکائی آ گئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر میں نے ابکائی روکی، مجھے ایسا لگا جیسے کسی انجانی قوت نے مجھے جکڑ لیا ہو، میں اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہل سکی۔

اچانک مجھے سامنے سے کوئی آتا دکھائی دیا وہ حلیہ سے خوبصورت اور دراز قد عورت لگتی تھی مگر...... مگر اس کے جسم سے اٹھتی بدبو میری سانس روک رہی تھی، اس عورت کی آنکھوں میں شرارے بھرے ہوئے تھے، اس نے اپنا

ہاتھ آگے کیا تو اس کے ہاتھوں سے اتنی بدبو آرہی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔

وہ عورت میرے اور قریب آگئی اس کے سنہری بال میرے گالوں سے ٹکرا رہے تھے، اچانک اس عورت کی صورت بدلنے لگی۔ اس کے موتی جیسے دانت باہر کو نکلنے لگے ذرا سی دیر میں اس کی شکل بدل گئی۔ وہ ایک خوبصورت عورت سے ایک کریہہ صورت چڑیل بن چکی تھی اس کے پاس سے تعفن کی ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ نہ جانے کتنے دنوں پرانا گوشت سڑ گیا ہو جس میں کیڑے لگ گئے ہوں؟ مگر وہ عورت نہایت اطمینان کے ساتھ میرے پاس کھڑی تھی، بدبو سے میرا دماغ پھٹا جارہا تھا پھر میرا سر اتنی زور سے چکرایا کہ میں جائے نماز پر ہی گر گئی اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو تمام گھر والے میرے اطراف کھڑے تھے۔ ابا جان امی، چاچو چچی، دانیال بھائی قمر اور مہک سب کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمایاں تھے۔

”کیا ہوا کنول بیٹا۔“ امی نے فکر مندی سے پوچھا۔

”امی...... امی...... وہی خواب جو میں کئی دن سے دیکھ رہی تھی مگر آج تو جاگتی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ وہ عورت میرا گلا دبانا چاہتی تھی۔“ میں نے جواب دیا۔

”بیٹا...... یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے آپ کا وہم ہوگا۔“ چچی سلمیٰ نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ سے کب سے کہہ رہی ہوں کہ میری بچی کو کسی اللہ والے کے پاس لے جائیں یہ ڈاکٹروں کے بس کی بات نہیں ہے۔“ ابو کی جانب مڑتے ہوئے امی بولیں۔

”کیسی احمقوں والی بات کر رہی ہو۔ اس کو دوا پلاؤ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ابو نے جواب دیا اور کمرے سے چلے گئے۔

امی نے مجھے ڈاکٹر کی دی ہوئی کڑوی دوا پلائی ان ہی کی زبانی پتا چلا کہ میں جائے نماز پر بے ہوش پائی گئی اور تقریباً دس گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا تھا دوا پی کر مجھ پر پھر غنودگی چھانے لگی اور میں سوگئی۔

جائے سکون، اس سے آپ کیا سمجھے، کچھ نہیں...... یہ میرے گھر کا نام ہے ”جائے سکون“ یہ بڑا سا گھر دادا جان نے بنوایا تھا کہ ان کی تمام اولاد سکون سے ایک گھر میں رہے مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دادا جان کی سات میں سے پانچ اولادیں جوان ہونے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں، بس میرے ابا جان حاجی منظور احمد اور میرے چاچو ضمیر احمد ہی باقی بچے، دادا جان کے انتقال کے بعد بھی ابو اور چاچو نے دادا کی خواہش کا احترام کیا اور اس گھر میں ساتھ ساتھ رہے۔ اس ”جائے سکون“ میں ابو امی اور میرے علاوہ میرے بڑے بھائی دانیال بھائی رہتے ہیں جبکہ چاچو اور سلمیٰ چچی کے دونوں بچے قمر اور مہک بھی ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ قمر مجھ سے دو ماہ بڑا تھا اور مہک مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ہمارا گھر واقعی جائے سکون ہے اس گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا کوئی چخ چخ نہیں ہے حالانکہ ابو اور چاچو کا کاروبار الگ الگ ہے مگر گھر میں سب شیر و شکر کے ساتھ رہتے ہیں ابو کی مارکیٹ میں چلتی ہوئی بڑی سی گارمنٹس کی دکان ہے دانیال بھائی ابو کے ساتھ ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتے ہیں جبکہ چاچو گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کا کام کرتے ہیں۔

میری اس گھر میں ایک الگ شان ہے...... وجہ کیا ہے یہ آپ سوچ رہے ہوں گے۔ چلئے میں بتاتی ہوں...... ہمارے گھر میں تعلیم کا کوئی زیادہ رواج نہیں ہے۔ امی اور چاچی نے تو شاید اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی، ابو اور چاچو بھی پرائمری تک ہی پڑھ سکے۔ دانیال بھائی نے جیسے تیسے میٹرک کیا اور کاروبار میں ابو کا ہاتھ بٹانے لگے، قمر نے بھی دو سال فیل ہونے کے بعد اس سال میٹرک کیا ہے جبکہ مہک ابھی نائن کلاس میں ہے مگر وہ بھی پڑھائی میں اتنی اچھی نہیں ہے۔ اگر اس خاندان میں کوئی پڑھائی میں اچھا ہے تو وہ میں یعنی کنول منظور احمد ہے۔

میں نے میٹرک بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اب انٹر میں بھی میری پوزیشن آئی ہے۔ مجھے ڈاکٹر بننے کا بے حد شوق ہے اور اسی شوق کی خاطر میں بے حد محنت کر رہی ہوں۔ دو ہفتوں بعد میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ ہونے والے ہیں مگر پچھلے تین دن سے میری حالت بہت

ہاتھ آگے کیا تو اس کے ہاتھوں سے اتنی بدبو آرہی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔

وہ عورت میرے اور قریب آگئی اس کے سنہری بال میرے گالوں سے ٹکرا رہے تھے، اچانک اس عورت کی صورت بدلنے لگی۔ اس کے موتی جیسے دانت باہر کو نکلنے لگے ذرا سی دیر میں اس کی شکل بدل گئی۔ وہ ایک خوبصورت عورت سے ایک کریہہ صورت چڑیل بن چکی تھی اس کے پاس سے تعفن کی ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی ایسا لگتا تھا کہ نہ جانے کتنے دنوں پرانا گوشت سڑ گیا ہو جس میں کیڑے لگ گئے ہوں؟ مگر وہ عورت نہایت اطمینان کے ساتھ میرے پاس کھڑی تھی، بدبو سے میرا دماغ پھٹا جارہا تھا پھر میرا سر اتنی زور سے چکرایا کہ میں جائے نماز پر ہی گرگئی اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب مجھے ہوش آیا تو تمام گھر والے میرے اطراف کھڑے تھے۔ ابا جان امی، چاچو چچی، دانیال بھائی قمر اور مہک سب کے چہرے پر فکر مندی کے آثار نمایاں تھے۔

''کیا ہوا کنول بیٹا۔'' امی نے فکر مندی سے پوچھا۔

''امی...... امی...... وہی خواب جو میں کئی دن سے دیکھ رہی تھی مگر آج تو جاگتی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ وہ عورت میرا گلا دبانا چاہتی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''بیٹا...... یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے آپ کا وہم ہوگا۔'' چچی سلمٰی نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ سے کب سے کہہ رہی ہوں کہ میری بچی کو کسی اللہ والے کے پاس لے جائیں یہ ڈاکٹروں کے بس کی بات نہیں ہے۔'' ابو کی جانب مڑتے ہوئے امی بولیں۔

''کیسی احمقوں والی بات کررہی ہو۔ اس کو دوا پلاؤ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' ابو نے جواب دیا اور کمرے سے چلے گئے۔

امی نے مجھے ڈاکٹر کی دی ہوئی کڑوی دوا پلائی ان ہی کی زبانی پتا چلا کہ میں جائے نماز پر بے ہوش پائی گئی اور تقریباً دس گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا تھا دوا پی کر مجھ پر پھر غنودگی چھانے لگی اور میں سوگئی۔

جائے سکون، اس سے آپ کیا سمجھے، کچھ نہیں...... یہ میرے گھر کا نام ہے ''جائے سکون'' یہ بڑا سا گھر دادا جان نے بنوایا تھا کہ ان کی تمام اولاد سکون سے ایک گھر میں رہے مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دادا جان کی سات میں سے پانچ اولادیں جوان ہونے سے پہلے ہی اللہ کو پیاری ہوگئیں، بس میرے ابا جان حاجی منظور احمد اور میرے چاچو ضمیر احمد ہی باقی بچے، دادا جان کے انتقال کے بعد بھی ابو اور چاچو نے دادا کی خواہش کا احترام کیا اور اس گھر میں ساتھ ساتھ رہے۔ اس ''جائے سکون'' میں ابو امی اور میرے علاوہ میرے بڑے بھائی دانیال بھائی رہتے ہیں جبکہ چاچو اور سلمٰی چچی کے دونوں بچے قمر اور مہک بھی ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ قمر مجھ سے دو ماہ بڑا تھا اور مہک مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ہمارا گھر واقعی جائے سکون ہے اس گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا کوئی چیخ چیخ نہیں ہے حالانکہ ابو اور چاچو کا کاروبار الگ الگ ہے مگر گھر میں سب شیر و شکر کے ساتھ رہتے ہیں ابو کی مارکیٹ میں چلتی ہوئی بڑی سی گارمنٹس کی دکان ہے دانیال بھائی ابو کے ساتھ ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتے ہیں جبکہ چاچو گاڑیوں کے اسپیئر پارٹس کا کام کرتے ہیں۔

میری اس گھر میں ایک الگ شان ہے...... وجہ کیا ہے یہ آپ سوچ رہے ہوں گے۔ چلئے میں بتاتی ہوں...... ہمارے گھر میں تعلیم کا کوئی زیادہ رواج نہیں ہے۔ امی اور چاچی نے تو شاید اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی، ابو اور چاچو بھی پرائمری تک ہی پڑھ سکے۔ دانیال بھائی نے جیسے تیسے میٹرک کیا اور کاروبار میں ابو کا ہاتھ بٹانے لگے، قمر نے بھی دو سال فیل ہونے کے بعد اس سال میٹرک کیا ہے جبکہ مہک ابھی نائن کلاس میں ہے مگر وہ بھی پڑھائی میں اتنی اچھی نہیں ہے۔ اگر اس خاندان میں کوئی پڑھائی میں اچھا ہے تو وہ میں یعنی کنول منظور احمد ہے۔

میں نے میٹرک بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اب انٹر میں بھی میری پوزیشن آئی ہے۔ مجھے ڈاکٹر بننے کا بے حد شوق ہے اور اسی شوق کی خاطر میں بے حد محنت کررہی ہوں۔ دو ہفتوں بعد میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ ہونے والے ہیں مگر پچھلے تین دن سے میری حالت بہت

بری ہے میں کتاب اٹھاتی ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے میرا دماغ جکڑ لیا ہو...... دو دو گھنٹے پڑھنے کے باوجود میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا...... مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے کچھ پڑھا ہی نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

ایک دن آرام کے بعد میری طبیعت کچھ بہتر ہوئی۔ میڈیکل کے ٹیسٹ میں چند دن رہ گئے تھے۔ میں نے اپنی تمام کتابیں صاف کیں اور یکسوئی کے ساتھ پڑھنے کے لئے کمرہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے ایک کتاب اٹھائی ہی تھی کہ میری ناک میں بدبو کی زبردست لہر گھس گئی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا وہی عورت تھی جس نے میری زندگی جہنم بنادی تھی وہ کھلی کھڑکی سے کسی دھوئیں کی مانند کمرے میں آئی اس کے جسم سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا وہ اپنی انگارہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

"کیا پڑھ رہی ہو......؟" اس کی آواز گونجی میں نے کسی معمول کی طرح کتاب اس کی طرف بڑھائی مگر پھر بے اختیار چیخ پڑی میرے ہاتھ میں کتاب نہیں تھی بلکہ میرے ہاتھ پر انتہائی گندے اور غلیظ کیڑے رینگ رہے تھے۔ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور دونوں ہاتھوں کو جھٹک جھٹک کر کیڑوں کو خود سے دور کرنا چاہا...... یہ دیکھ کر اس عورت نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ "اب اگر تم نے کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کی تو......!"

"خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔" میں چیخی مگر وہ قہقہہ لگاتی رہی پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے اس کے ہاتھوں سے نکلنے والی گندی بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا میرے منہ سے چیخ نکل گئی، اس عورت نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میری گردن پکڑلی اور میری جیسے گردن کی ہڈی چٹخنے لگی۔ اس عورت کی گرفت بہت سخت تھی مجھے لگا میرا آخری وقت آ گیا ہے، میں نے کلمہ پڑھنا چاہا مگر مجھے کلمہ یاد ہی نہیں آرہا تھا، میں نے پوری کوشش کی تو میرے منہ سے کلمہ طیبہ بلند ہوا۔

کلمے کے الفاظ جیسے ہی میرے منہ سے ادا ہوئے تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے زور سے دھکا دیا ہو۔ اس عورت کے ہاتھوں سے میری گردن چھوٹ گئی اور اس عورت کی شکل تبدیل ہونے لگی وہ ایک خوبصورت عورت سے بھیانک اور کریہہ چہرے والی چڑیل بن گئی۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے سے بہت بڑی اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں اس کے جبڑے انتہائی حد تک بڑے تھے کہ اس کا حلق تک نظر آرہا تھا اس کے سر کے بال نہ سفید تھے نہ کالے وہ انتہائی کریہہ صورت تھی اس نے اپنے ہاتھ میں ایک لاٹھی پکڑی ہوئی تھی جس سے ایک سانپ لپٹا ہوا تھا اس کے منہ سے پھر ایک قہقہہ نکلا اس کا قہقہہ میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی مانند گھس رہا تھا، میں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیا پھر بھی اس چڑیل کی آواز میرے کانوں میں گھس رہی تھی۔ "نہیں چھوڑوں گی تجھے ہرگز نہیں۔"

یہ آخری الفاظ تھے جو میں نے سنے اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

☆......☆......☆

"خدا کے لئے میری بچی کو کسی اللہ والے کے پاس لے کر جاؤ۔" امی ابو سے بولیں تو ابو فکر مندی کے انداز میں سر ہلا دیا۔

"دیکھو ذرا دو دن میں کیسی ہلدی کی طرح پیلی ہوگئی ہے کہاں تو اس گھر میں اس کے قہقہے گونجتے تھے اور اب قبرستان سی خاموشی چھا گئی ہے۔" امی مسلسل بڑبڑا رہی تھیں ان کی بڑبڑاہٹ سے تنگ آ کر ابو کمرے سے باہر چلے گئے۔

"ہائے اللہ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں...... میں کیا کروں۔" امی رونے کے انداز میں بڑبڑائیں۔ میں انتہائی نقاہت کی حالت میں بستر پر لیٹی تھی اسی وقت قمر کمرے میں داخل ہوا اور امی کو سلام کرتے ہوئے بولا۔ "تائی امی ...... کنول کے ماموں آئے ہیں۔"

"ہاشم بھائی...... ہاشم بھائی...... آئے ہیں۔" امی نے قمر سے پوچھا، اسی وقت ہاشم ماموں کمرے میں داخل ہوئے اور سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔"

"کیسی طبیعت ہے کنول کی؟" ماموں نے پوچھا۔

"بھائی جان......" امی دوپٹہ منہ پر رکھ کر رونے لگی۔

"ماموں...... کنول کی حالت کئی دن سے خراب ہے مگر دو دنوں سے تو اس کی طبیعت میں کوئی سدھار نہیں آرہا۔" امی سے جب بات نہ کی گئی تو قمر نے ماموں کو ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔

"کنول کی طبیعت کئی دن سے خراب ہے اور مجھے خبر تک نہیں کی، اگر آج صبح قمر مجھے فون کر کے کنول کے بارے میں نہ بتاتا تو مجھے پتا بھی نہیں چلتا۔" ماموں نے امی سے گلہ کیا۔

"ہم لوگ اس کی طبیعت کی وجہ سے اتنے پریشان تھے کہ کچھ یاد ہی نہیں رہا۔" امی نے عذر پیش کیا۔

"کیسا ہے میرا بیٹا؟" ماموں نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا تو میں ہلکے سے مسکرادی۔ ماموں جان بغور میرے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے، پھر انہوں نے میری آنکھوں کا معائنہ کسی ڈاکٹر کی طرح کیا...... پھر ہولے ہولے کچھ پڑھ کر مجھ پر پھونکنے لگے۔

"بھائی جان کنول کو کیا ہوا ہے؟" امی نے ماموں سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کسی نے اس پر گندا علم کروایا ہے جیسے جادو ٹونا سفلی وغیرہ...... میں نے یہاں آنے سے قبل اپنے پیر و مرشد سے بات کی ہے انہوں نے کہا کہ "کنول کو ان کے پاس لے کر آؤں لہٰذا میں کنول کو لینے آیا ہوں۔"

"ہاں...... ہاں...... بھائی جان ضرور لے کر جائیں اسے...... اللہ اس کو تندرستی دے۔" امی بولیں۔

"ماموں ...... کیا جادو وغیرہ ہوتا ہے؟" قمر نے پوچھا میرے اور دانیال بھائی کی وجہ سے قمر مہک بھی ہاشم ماموں کو ماموں ہی کہتے ہیں۔

"اصل میں ہر اچھے اور برے الفاظ کا انسان پر اثر ہوتا ہے مثال کے طور پر ابھی میں کہوں کہ تم بہت اچھے لڑکے ہو بڑے سمجھدار ہو تو تمہارے چہرے پر خوشی اور اطمینان کا ایک رنگ آئے گا اور اگر میں غصے سے کہوں کہ تم ایک نالائق اور برے لڑکے ہو تو ان الفاظ کا بھی تم پر اثر ہوگا اور تمہاری کیفیت بدل جائے گی لہٰذا الفاظ کا اثر ہوتا ہے اور جادو تو قرآن سے بھی ثابت ہے معوذتین یعنی سورہ الفلق اور سورہ الناس جادو کے توڑ کے لئے ہی نازل فرمائی گئی ہے جیسا کہ سورہ الفلق کا ترجمہ ہے۔

"مم...... مجھے ترجمہ یاد ہے......" قمر نے ماموں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اچھا......" سناؤ" ماموں بولے۔

"کہو کہ میں صبح کے مالک کی پناہ مانگتا ہوں۔ ہر چیز کی برائی سے جو اس نے پیدا کی، اور شب تاریک کی برائی سے جب اس کا اندھیرا چھا جائے، اور گنڈوں پر پڑھ پڑھ کر پھونکنے والیوں کی برائی سے، اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب وہ حسد کرنے لگے۔"

"شاباش...... اس سورۃ میں اللہ سے پناہ مانگی گئی ہے۔ حسد کرنے والوں سے، گنڈوں پر پڑھ کر پھونکنے والوں یا والیوں سے، اسی طرح سورۃ الناس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں یعنی لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبود برحق کی، شیطانی وسوسہ کی برائی سے جو اللہ کا نام سن کر پیچھے ہٹ جاتا ہے جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔"

"یعنی دلوں میں وسوسہ ڈالنے والوں یا والیوں سے پناہ مانگی گئی ہے یہ جادو ٹونا کرنے والے انسان بھی ہوسکتے ہیں اور دیگر مخلوقات بھی ہوسکتی ہے۔"

"ماموں یہ جادو وغیرہ کرتے کیسے ہیں؟" قمر نے پھر پوچھا۔

"جادو وغیرہ میں عموماً شیطان سے مدد مانگی جاتی ہے کسی دوسرے انسان کو نقصان پہنچانے کے لئے، اسی لئے جادو کو شرک کہا گیا ہے اور یہ بہت بڑا گناہ ہے۔" ماموں نے کہا پھر امی جان کی جانب مڑے اور گویا ہوئے۔ "جلدی سے کنول کو تیار کردو میں اسے ابھی حیدرآباد اپنے مرشد کے پاس لے کر جاؤں گا۔"

"حیدرآباد...... اتنی دور۔"

"دو گھنٹے کا راستہ ہے حیدر آباد کا...... شام تک واپس آجائیں گے۔" ماموں جان نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں، قمر، ماموں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھے حیدر آباد کی جانب جا رہے تھے۔ راستے میں ماموں نے بتایا کہ ان کے مرشد جنہیں سب شاہ جی کہتے ہیں بڑے اللہ والے بزرگ ہیں۔ حیدر آباد پہنچنے کے بعد ماموں نے گاڑی شاہ جی کے گھر کے سامنے روکی اور گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اترے اور گھر کی اطلاعی گھنٹی بجائی، میں قمر کا سہارا لے کر گاڑی سے اتری اور گھر کی جانب بڑھی۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کسی طاقت نے میرے قدم جکڑ لئے ہوں مجھ سے ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہوگیا، میں مضبوطی سے قدم جما کر ایک جگہ کھڑی ہوگئی۔

"کیا ہوا...... آگے کیوں نہیں بڑھ رہی ہو۔" قمر بولا پھر اس کی نظر میرے چہرے پر پڑی تو وہ گھبرا گیا میرا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا میری آنکھیں انگارہ بنی ہوئی تھیں۔

"ماموں......" قمر زور سے چیخا تو ماموں نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا اسی وقت گھر کا دروازہ کھلا اور ایک نورانی صورت بزرگ جن کی لمبی سفید داڑھی تھی سفید کرتا پاجامہ پہنے اور سر پر سفید کروشے کی ٹوپی پہنے گھر سے باہر نکلے مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ساری صورتحال سمجھ گئے انہوں نے قمر سے میرا ہاتھ چھوڑنے کا کہا اور قرآنی آیات پڑھ کر مجھ پر پھونکنے لگے، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے میرے قدم چھوڑ دیئے ہوں، میرے قدم خود بخود گھر کی جانب اٹھنے لگے۔

شاہ جی نے گھر کی طرف منہ کرکے کسی کو آواز دی تو ایک بڑی عمر کی عورت گھر سے نکلی شاہ جی نے اسے کچھ کہا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گھر کے اندر لے گئی گھر کے اندر پہنچ کر اس نے مجھے ایک کمرے میں بیٹھایا کمرے میں ہر چیز سفید تھی در و دیوار سے لے کر کمرے کا فرنیچر تک سفید تھا کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے پاکیزگی کا احساس ہوا مجھے ایسا لگا جیسے میں ایک دم ہلکی پھلکی ہوگئی ہوں تھوڑی دیر میں شاہ جی بھی کمرے میں داخل ہوئے اور با آواز بلند سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا، شاہ جی زمین پر بچھی فرشی دری پر بیٹھ گئے، میں، ماموں اور قمر ان کے سامنے ادب سے دوزانوں ہو کر بیٹھ گئے۔

"کنول بیٹا...... پہلے تو یہ بات آپ سمجھ لیں کہ میں آپ کا مسئلہ حل نہیں کرسکتا جو مسئلہ آپ کے ساتھ پیش آرہا ہے وہ آپ کو خود حل کرنا ہوگا، میں آپ کو صرف راستہ بتا سکتا ہوں اس راستے پر چلنا، مشکلات اٹھانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ اگر آپ نے میرے بتائے ہوئے طریقہ کار پر عمل کیا تو انشاء اللہ آپ کا یہ مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔"

میں غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی مجھے جو بات ان کی طرف کھینچ رہی تھی وہ ان کے چہرے کا تقدس تھا ان کی شخصیت میں عجیب طرح کی کشش تھی انہوں نے تفصیل سے مجھ سے سارے حالات سنے۔

"آپ کا خیال ہے کہ مجھ پر کسی نے جادو وغیرہ کروایا ہے؟" تمام حالات بتانے کے بعد میں نے سوال کیا۔

"یقیناً جادو برحق ہے، ہمارے پیارے رسولؐ پر بھی جادو کیا گیا تھا اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے امت کو معوذتین کا تحفہ دیا، معوذتین یعنی سورہ الفلق اور سورہ الناس اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کے لئے تحفہ ہے جادو اور سفلی کا توڑ ان دو سورتوں میں موجود ہے۔"

"شاہ جی جادو کیسے ہوتا ہے؟" قمر جو اتنی دیر سے خاموش تھا بول اٹھا۔

"جادو میں عموماً شیاطین سے مدد مانگی جاتی ہے مطلب غیر اللہ سے مدد طلب کی جاتی ہے اسی لئے جادو کو شرک جیسے گھناؤنے گناہ میں شمار کیا جاتا ہے مگر یہ اہم بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ کسی پر جادو یا سفلی کروانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ عموماً قریبی لوگ ہی مہیا کرسکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ کنول پر ہمارے اپنوں میں سے ہی کسی نے جادو کروایا ہے؟" قمر نے حیرت سے پوچھا۔

"ضروری نہیں ہے اکثر کوئی گھر والا نادانی میں کسی باہر والے کی مدد کر بیٹھتا ہے۔ تم بلاوجہ شک نہ کرو۔" شاہ جی نے قمر سے کہا پھر میری جانب متوجہ ہوئے

اور بولے۔ ’’باقاعدگی سے نماز پڑھا کرو اور باوضو رہنے کی کوشش کرو، معوذتین پڑھتی رہو جو خصوصاً اسی مقصد کے لئے اتاری گئی ہے رات کو سوتے وقت باوضو سونے کی کوشش کرو اور آیت الکرسی پڑھ کر سویا کرو اور کوشش کیا کرو کہ فجر کی نماز کے بعد قرآن ضرور پڑھا کرو اس سے تمہارا دماغ روشن ہوگا اور تمہیں سکون میسر آئے گا اور اٹھتے بیٹھتے آیت الکرسی اور معوذتین کی تلاوت کی عادت ڈال لو، اللہ تمہارے سامنے سارے بھید کھول دے گا، بس پورے یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ وہی ہمارا رب ہے، وہی ساری کائنات کا رب ہے وہی سب مخلوق کا خالق و مالک ہے وہی پیدا کرنے والا اور مارنے والا ہے اس کے سوا کوئی ہمارا مددگار پالن ہار نہیں ہے۔ اس یقین کے ساتھ دعا مانگو گی تو کبھی بارگاہ الٰہی سے خالی ہاتھ نہیں لوٹائی جاؤ گی۔ ہر تکلیف میں صبر اور کلام الٰہی سے مدد حاصل کرو یقیناً کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔‘‘

شاہ جی نے دعا دے کر ہمیں رخصت کیا، میرا دل جو ایمان سے خالی ہو رہا تھا آج پھر بھر گیا، جب میں شاہ جی کے گھر سے باہر نکلی تو ایک دم ہلکی پھلکی تھی شاہ جی کی رہنمائی نے مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا تھا۔

شاہ جی کے گھر سے لوٹنے کے بعد میں ذہن میں ان کی ہر بات دہرا رہی تھی اب میری کوشش ہوتی تھی کہ میں ہر وقت باوضو رہوں کبھی آیت الکرسی پڑھتی اور کبھی معوذتین کی تلاوت کرتی، قمر اور مہک نے میرا بہت ساتھ دیا جب میں خاموش ہوتی تو مہک باآواز بلند قرآن کی تلاوت کرنے لگتی۔ میں نے پنج وقتہ نماز کو اپنی عادت بنالیا میری کوشش ہوتی کہ میں زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کروں۔

☆......☆......☆

ایک رات مجھے نیند نہیں آرہی تھی، میں تھوڑی دیر ہی سوئی تھی کہ میری آنکھ کھل گئی مجھے بے انتہا بے چینی محسوس ہو رہی تھی جب سے میں شاہ جی کے پاس سے واپس آئی تھی میری طبیعت بہت بہتر تھی اس چڑیل نے تنگ نہیں کیا تھا۔ مگر آج رات بے چینی اپنے عروج پر تھی میں تھوڑی دیر خالی الذہن بستر پر لیٹی رہی پھر کچھ سوچ کر اٹھی اور وضو کر کے تہجد کی نماز کے لئے جائے نماز پر کھڑی ہوگئی اب میں نماز مکمل یکسوئی اور خلوص کے ساتھ پڑھتی تھی قرآن کا ایک ایک لفظ پوری طرح سمجھ کر ادا کرتی تھی اب مجھے نماز میں لطف آنے لگا تھا۔ مجھے نماز میں سکون ملتا تھا میں سورہ فاتحہ پڑھ رہی تھی سورہ فاتحہ جس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنی بڑائی بیان کی ہے کہ وہ رب ہے تمام جہانوں کا وہ رحمٰن والرحیم ہے، وہ مالک ہے یوم حساب کا۔ اور پھر سورہ فاتحہ کے آخر میں انسان اپنے لئے دعا کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے سیدھے راستے پر چلانا۔ اس راستے پر جو تیری خوشنودگی کا راستہ ہے۔

نماز ادا کر کے میں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ ’’اے اللہ اپنی اس ناچیز بندی کو معاف فرما...... اے اللہ تو دلوں کا حال خوب جانتا ہے، دل میں موجود راز تیرے سامنے آشکار ہے۔ اے اللہ تو ہماری شہ رگ سے زیادہ ہم سے قریب ہے۔ اے اللہ تو ستر ماؤں سے زیادہ اپنی مخلوق سے پیار کرنے والا ہے۔ اے اللہ اگر مجھ ناچیز بندی سے کبھی دانستگی یا نادانستگی میں کوئی غلطی، کوتاہی لغزش ہوگئی ہو تو تو معاف فرما...... اے اللہ مجھے ہر قسم کی تکلیف سے نجات دے اور جو میرے لئے بہتر ہو ویسا میرے لئے ماحول پیدا فرما دے۔ اے اللہ مجھ پر سچائی ظاہر کردے۔ اے اللہ مجھ پر سچائی ظاہر کردے۔ اے اللہ مجھ پر سچائی ظاہر کردے۔‘‘

میرا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا آنسو میرے چہرے سے ٹپک ٹپک کر جائے نماز پر گر رہے تھے اسی وقت مجھے کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ رات کے اس پہر کون ہو سکتا ہے؟ میں نے سوچا اور جائے نماز سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا۔

ایک سایہ جو مکمل طور پر سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا ہمارے گھر کے پیچھے کی طرف بڑھ رہا تھا ہمارے گھر کے پیچھے ایک بڑا سا میدان تھا مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے وہاں جابجا خودرو جھاڑیاں اگ آئی تھیں میں دبے قدموں جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے اس سائے کا پیچھا

کرنے لگی۔

"یہ شخص کون ہے اور ہمارے گھر میں کیا کر رہا تھا اور اب کہاں جا رہا ہے۔" میرے ذہن میں مختلف سوالات کلبلا رہے تھے میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے اس سائے کا پیچھا کرتی رہی۔ وہ سایہ کچھ دور ایک برگد کے درخت کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ اسی وقت ایک اور سایہ اس درخت کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا، میں نے خودرو جھاڑیوں کی آڑ میں خود کو اچھی طرح چھپا لیا، چاند کی گیارہ یا بارہ تاریخ تھی اس لئے روشنی اتنی تھی کہ منظر واضح نظر آ رہا تھا۔

برگد کے درخت کے پیچھے سے نکلنے والا سایہ ایک بڑھیا کا تھا اور اس کے ہاتھ میں کپڑے کی بنی ایک گڑیا تھا۔

میں نے اس بڑھیا کو بغور دیکھا تو میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی اس بڑھیا کی شکل اس چڑیل سے کافی حد تک ملتی جلتی تھی جس نے میرے دن کا سکون اور رات کی نیند حرام کر دی تھی۔

بڑھیا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی گڑیا کے سر پر چند پنیں لگائیں اس دوران وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی، تھوڑی دیر میں بڑھیا نے وہ گڑیا اس دوسرے شخص کو دے دی اور اس شخص نے ایک ہاتھ میں گڑیا پکڑی اور دوسرا ہاتھ چادر میں ڈال کر جب باہر نکالا تو اس ہاتھ میں نوٹوں کی ایک گڈی تھی، دور سے مجھے اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ کتنی رقم تھی۔ بڑھیا رقم لے کر وہاں سے چلی گئی۔

وہ شخص جو ہمارے گھر سے یہاں آیا تھا وہ گڑیا لے کر برگد کے درخت کے پاس بیٹھ گیا اور مسلسل کچھ پڑھتے ہوئے گڑیا کے سر میں سوئیاں لگاتا جا رہا تھا۔ "نہ جانے یہ کون ہے؟" میرے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھر رہا تھا۔

"عموماً ہمارے قریبی لوگ ہی ہم پر جادو یا سفلی کرواتے ہیں۔" شاہ جی کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے وہ شخص جو بھی تھا پوری طرح چادر میں لپٹا ہوا تھا اس کی پیٹھ میری جانب تھی۔

"اے اللہ ...... اے مالک کائنات ...... اے ہماری جانوں کے مالک، تو مجھے یہاں تک لایا ہے تو یہ بھید بھی کھول دے۔" میں نے صدق دل سے دعا کی۔ آیت الکرسی کا ورد مسلسل میرے منہ سے جاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس شخص نے گڑیا کو برگد کے درخت کی جڑ میں مٹی ہٹا کر دفنایا اور واپسی کے لئے مڑا تو اس شخص کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔

"اور تو پھر ...... مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ساری شیطانی کارستانی کے پیچھے یہ شخصیت ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ نے آج مجھ پر سچ آشکار کر دیا تھا میں لرزتے وجود کے ساتھ کمرے میں واپس آئی میرے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ یا اللہ یہ کیسا بھیانک سچ ہے، آگہی کا عذاب مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا، آج احساس ہوا کہ اچھا ہے اللہ نے ہر چیز پوشیدہ رکھی ہے کل کیا ہوگا ہمیں نہیں معلوم اگر ہمیں کل کی آگہی ہو جائے تو شاید ہم آج مر جائیں۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ نے آگہی کا ذرا سا دروازہ کھولا تو میں یہ برداشت نہ کر سکی کیسا درد اٹھ رہا ہے سینے میں...... میں بے اختیار کتنی دیر بستر پر بیٹھی رہی اس کا مجھے اندازہ نہیں جب موذن نے فجر کی اذان دی تو میں چونکی۔

اللہ اکبر ...... اللہ اکبر ...... اللہ سب سے بڑا ہے اللہ سب سے بڑا ہے۔

بے شک ...... بے شک اللہ سب سے بڑا ہے وہ عظیم ترین ہے۔

حی علی الصلوۃ ...... حی علی الفلاح ...... آؤ نماز کی طرف ...... آؤ بھلائی کی طرف۔

بے شک ...... بے شک یہی بھلائی کا راستہ ہے یہی سچا راستہ ہے۔

میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی میرے سجدے کتنے لمبے ہو گئے اس کا مجھے اندازہ نہیں میں جائے نماز پر بیٹھی خدا کی کبریائی بیان کرتی رہی آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے اسی وقت امی کمرے میں داخل ہوئیں اور مجھے اس طرح جائے نماز پر روتا دیکھ کر گھبرا گئیں اور جلدی سے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔

"کیا ہوا ...... کیا ہوا ...... میرا بچہ۔"

''امی ...... امی......'' میں باآواز بلند رونے لگی، میرے رونے کی آواز سن کر تمام گھر والے دوڑے چلے آئے۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا......؟'' سب کے منہ سے نکلا۔

''ابو...... امی...... اللہ تعالیٰ نے مجھ پر راز کھول دیا۔'' میں امی سے لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

''اللہ تعالیٰ نے مجھے سب کچھ دکھا دیا...... دانیال بھائی...... قمر ہمارے گھر کے پیچھے جو برگد کا پرانا درخت ہے اس کی جڑ میں ایک گڑیا دفن ہے اسے لے آؤ۔''

دانیال بھائی تو میری بات سن کر خاموش کھڑے رہے مگر قمر بجلی کی تیزی سے بھاگا جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں واقعی ایک گڑیا تھی گڑیا دیکھ کر سب کے چہروں پر خوف دوڑ گیا۔

''اس گڑیا کے ذریعے مجھ پر جادو کیا گیا ہے اس گڑیا کے پیٹ میں میرے کٹے ہوئے ناخن، بال اور میرے استعمال میں رہنے والی چیزیں بھری ہوئی ہیں۔ لاؤ مجھے دو میں اسے جلا دوں گی۔'' میں نے قمر کے ہاتھ سے گڑیا لی، سورہ الفلق اور سورہ الناس کی تلاوت میرے منہ سے جاری تھی، میں نے گڑیا کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا، چاچو نے آگے بڑھ کر لائٹر جلایا اور اس گڑیا کو آگ لگا دی، گڑیا کے جلنے سے ناقابل برداشت بدبو اٹھ رہی تھی، جیسے جیسے گڑیا جل رہی تھی مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی قید سے آزاد ہو رہی ہوں، میرے منہ سے قرآن کی تلاوت جاری تھی۔

''یہ تھی وہ گڑیا جس کے ذریعے مجھ پر جادو کیا گیا تھا۔'' میں نے ایک زخمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''شاہ جی صحیح کہتے تھے کہ ہمارے قریبی لوگ ہی ہم پر جادو کرواتے ہیں۔''

''کس نے کی یہ حرکت کیا تم اسے جانتی ہو۔'' ابا جان دھاڑے۔ ''کاش...... کاش میں یہ نہ جانتی۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''کون ہے وہ۔'' چاچو اور ابا جان ایک ساتھ بولے۔

''آپ خود بتانا پسند کریں گی یا میں سب کو بتاؤں آخر آپ نے ایسا کیوں کیا، میں رات میں آپ کو اس بڑھیا جادوگرنی کے ساتھ دیکھ چکی ہوں لہٰذا آپ ہی سب کو سچ سچ بتا دیں...... چچی جان۔'' میں نے سلمیٰ چچی کو مخاطب کیا۔

''سلمیٰ تم......!!'' امی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''امی...... آپ۔'' قمر اور مہک ہکا بکا رہ گئے۔

''سلمیٰ تم...... تم نے یہ کیوں کیا۔'' چاچو چیخے۔

''نفرت ہے مجھے اس سے جسے دیکھو کنول...... کنول کرتا ہے میرے بچوں کی طرف تو کسی کا دھیان جاتا ہی نہیں۔ سب ڈاکٹرنی صاحبہ ڈاکٹرنی صاحبہ کہتے ہوئے کنول کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ بس اسی جلن اور حسد میں، میں نے یہ سب کیا......'' سلمیٰ چچی نے پہلے نفرت سے پھر بے چارگی سے کہا۔

''امی...... آپ...... آپ کو ذرا احساس ہے کہ اس کی وجہ سے ہم لوگ کتنا پریشان تھے آپ...... آپ کو ذرا رحم نہیں آیا کنول پر۔'' قمر بولا

''میں...... میں حسد میں اندھی ہو گئی تھی۔ میں نے تم دونوں کی محبت میں یہ سب کچھ کیا۔''

''محبت...... آپ کو محبت کا پتا بھی ہے۔ آئی ہیٹ یو امی۔ آئی ہیٹ یو۔'' قمر چیخا۔ ''نہیں۔''

''مجھے نفرت ہو رہی ہے اپنے آپ سے کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔'' مہک بھی بول اٹھی اور روتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بھاگتی ہوئی چلی گئی، اس کے ساتھ ہی قمر بھی چلا گیا ان دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''کنول ...... کنول ...... مجھے معاف کر دو، میں اپنے بچوں کی محبت میں اندھی ہو گئی تھی۔'' سلمیٰ چچی نے میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''سلمیٰ تم محبت میں نہیں حسد میں اندھی ہو گئی تھی، محبت کبھی برے کام نہیں کرواتی، حسد آدمی سے ایسے گھناؤنے کام کرواتا ہے۔ تم اپنا سامان باندھو اور فوراً اس گھر سے چلتی نظر آؤ...... ورنہ میرا ہاتھ بھی اٹھ سکتا ہے۔'' چاچو طیش میں بولے تو سلمیٰ چچی روتی ہوئی اپنے کمرے کی

طرف چلی گئیں۔

☆......☆......☆

فجر کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے قرآن مجید کھولا اور سورہ رحمٰن کی تلاوت کرنے لگی اس واقعہ کے پندرہ دن گزر چکے تھے سلمٰی چچی اسی دن اپنے میکے چلی گئی تھیں میرا میڈیکل کا انٹری ٹیسٹ اچھا ہوا تھا اس واقعہ کے بعد میری طبیعت کبھی خراب نہیں ہوئی میں جو کبھی کبھی نماز پڑھتی تھی میں نے باقاعدہ نماز پڑھنے کو اپنی عادت بنالیا اور ہر روز فجر کے بعد سورج نکلنے تک قرآن کی تلاوت کرنا میرا معمول بن گیا قمر اور مہک نے اس واقعہ کے بعد کئی دفعہ مجھ سے معافی مانگی، میں نے انہیں بتادیا کہ میرے دل میں کسی کے لئے کوئی بدگمانی نہیں ہے۔ میں نے انسانوں سے توقع رکھنی ہی چھوڑ دی ہے جب میرا اللہ میرے ساتھ ہے تو ساری دنیا بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

میں قرآن کی تلاوت کر رہی تھی کہ چاچو کی خوشی سے لبریز چیخ سنائی دی۔ میں نے قرآن مجید بند کیا اور اسے اٹھا کر اونچی جگہ پر رکھا اور کمرے سے باہر نکلی۔

”آیئے...... آیئے ڈاکٹرنی صاحبہ...... آپ کا انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ آیا ہے۔“ چاچو ہاتھ میں اخبار لئے مجھے کمرے سے نکلتا دیکھ کر بولے۔

”کیا ہوا...... کیا رزلٹ آگیا ہے۔“ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”کیا ہوگا...... اب ہماری آپی ڈاکٹر کہلائیں گی۔ ڈاکٹر کنول منظور احمد۔“ مہک نے مجھے گلے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

”سچ۔“ میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

”بالکل سچ۔ یہ رہا اخبار۔“ چاچو نے اخبار میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا تو میں نے جلدی سے اخبار میں اپنا رول نمبر ڈھونڈا۔ سب سے اوپر میرا نام اور رول نمبر تھا۔

”اس خوشی میں گھر میں پارٹی ہونی چاہئے۔“ چاچو بولے۔

”نہیں چاچو پارٹی وارٹی نہیں۔“ میں نے فوراً انکار کیا۔

”اچھا پارٹی نہیں مگر آج رات کا کھانا میری طرف سے پیزاہٹ میں ہوگا۔“ چاچو پھر بولے۔

”ہرے۔“ قمر، مہک اور دانیال بھائی نے نعرہ لگایا۔

”چاچو...... آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میرا داخلہ میڈیکل کالج میں ہوگیا تو آپ میری ایک خواہش پوری کریں گے۔“ میں نے چاچو سے کہا۔

”ہاں...... ہاں...... مجھے اپنا وعدہ یاد ہے...... کہو...... تمہیں کیا چاہئے کپڑے۔ گاڑی یا کچھ اور......“ چاچو نے جواب دیا۔

”مجھے سلمٰی چاچی چاہئے۔“ میرے جواب کے ساتھ ہی گھر میں سناٹا چھا گیا تھوڑی دیر پہلے سب لوگ خوش ہو رہے تھے اب سب کی ہنسی کو بریک لگ گیا تھا، چاچو نے مجھے عجیب سی نظروں سے گھورا۔

”چاچو...... سلمٰی چچی دل کی بہت اچھی ہیں بس تھوڑی کمزور تاب ہوئیں اس لئے شیطان نے ان پر غلبہ پالیا۔ میں نے انہیں معاف کردیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ”بدلہ لینے سے معاف کرنے والا بہتر ہے۔“

میں نے اللہ کے فرمان کے مطابق انہیں معاف کردیا، آپ لوگ بھی انہیں معاف کردیں۔ اور عزت کے ساتھ گھر لے آئیں۔ پلیز! چاچو۔“ میں نے چاچو کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”اچھا...... ٹھیک ہے سوچیں گے۔“ چاچو نے دامن چھڑانا چاہا۔

”نہیں چاچو۔ وعدہ کریں۔“ میں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا...... اچھا وعدہ۔“ چاچو بولے تو میں نے گھوم کر قمر اور مہک کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ خوشی کے آنسو تھے۔

☆......☆......☆

رات کو ہم سب ابا جان کی گاڑی میں سوار پیزاہٹ کی جانب اڑے جا رہے تھے مگر چاچو ہمارے ساتھ نہیں تھے، میرے پوچھنے پر ابو نے بتایا کہ وہ پیزاہٹ میں ملیں گے۔ پیزاہٹ میں ہماری میز

ریز روتھی۔ ہم سب میز کے گرد پھیلی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"چاچو کہاں ہیں ابو؟" میں نے ابو سے پھر پوچھا۔

"آتا ہوگا۔ تمہارا چاچو۔" ابو نے جواب دیا

"آپ کب سے یہی بات کہہ رہے ہیں۔ آخر چاچو کہیں گئے ہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"لو وہ آگئے تمہارے چاچو۔" ابو نے دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا تو میں نے گھوم کر دروازے کی طرف دیکھا وہاں چاچو کے ساتھ سلمٰی چچی بھی تھیں وہ لوگ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ سلمٰی چچی کو دیکھ کر میں بے اختیار کرسی سے کھڑی ہوگئی سلمٰی چچی میز کے پاس پہنچ کر رکیں اور پھر میری کرسی کی طرف آئیں اور بولیں۔ "کنول بیٹا...... مجھے معاف کردو میں بہت بری ہوں۔" سلمٰی چچی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، میں نے جلدی سے ان کے ہاتھ پکڑے اور ان کو گلے لگالیا۔

"چچی آپ بری نہیں ہیں برا تو شیطان ہے جس نے آپ پر غلبہ پالیا تھا مگر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جس نے آپ کو اس کے چنگل سے رہائی دلائی، اللہ آپ کی اور ہم سب کی حفاظت فرمائے۔" میں نے سلمٰی چچی کو گلے لگاتے ہوئے کہا تو چچی نے مجھے زور سے اپنے ساتھ لپٹالیا۔

"ارے بھئی یہ چچی بھتیجی کا ملاپ ختم ہوگیا ہو تو...... کچھ کھانے وغیرہ کے ساتھ بھی انصاف کیا جائے۔" چاچو نے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سچ مچ بڑی زور کی بھوک لگی ہے۔"

"ہاں کنول باجی...... پیزا ہٹ کی خوشی میں تو میں نے دوپہر میں بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔" مہک بول اٹھی۔ سلمٰی چچی نے مجھ سے الگ ہونے کے بعد اپنے دونوں بچوں قمر اور مہک کو پیار کیا، میں نے سلمٰی چچی کو اپنے پاس ہی بیٹھالیا۔

"ابو...... چاچو نے تو میری خواہش پوری کردی۔ آپ بھی تو میری ایک خواہش پوری کریں۔" میں نے پیزا کھاتے ہوئے ابو کو مخاطب کیا۔

"اور کیا چاہیے تمہیں...... تمہاری چچی گھر واپس آتو گئیں۔" ابو بولے۔

"چاچو نے میری خواہش پوری کرکے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے مگر آپ کو بھی میری کم از کم ایک خواہش پوری کرنی چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب گھر والے میری جانب متوجہ ہوگئے۔

"شکر ہے ہماری بیٹی مسکرائی تو...... اچھا بتاؤ تمہیں اور کیا چاہیے۔" ابو بولے۔

"ابو...... وہ میں چاہتی ہوں کہ ہم سب ایک ساتھ عمرہ کرنے چلیں، ایک ساتھ خانہ کعبہ کی زیارت کریں، ایک ساتھ روضہ رسولؐ پر حاضری دیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمارے گھر کو دوبارہ خوشیوں کا گہوارہ بنادیا۔" میں نے تفصیلاً جواب دیا۔

"سبحان اللہ۔" بے ساختہ سلمٰی چچی کے منہ سے نکلا۔

"سبحان اللہ...... سبحان اللہ۔" ایک ایک کرکے سب کے منہ سے تعریفی کلمات نکلے۔

"ابو پھر ہم سب چلیں گے ناں۔" میں نے ابو سے تصدیق چاہی۔

"انشاء اللہ ضرور۔" تمہاری کلاسز شروع ہونے سے پہلے سب خانہ کعبہ میں حاضری دیں گے۔" ابو نے آمادگی ظاہر کی۔

"تھینک یو...... ابو۔" میں نے ابو کا شکریہ ادا کیا اور پیزا کے ساتھ انصاف کرنے لگی۔

میری آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے مگر یہ تشکر کے آنسو تھے اللہ تعالیٰ نے میری مشکل آسان کی اور ہمارے گھر کو دوبارہ خوشیوں کا گہوارہ بنایا۔ میں جتنا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں کم ہے، اس نے اپنے خزانے سے مجھے کتنی ہی نعمتوں سے نوازا ہے۔ "اے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" میں نے دل ہی دل میں اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا اور پیزا کھانے لگی۔

مجلسِ جنات

رضوان بھٹی۔محراب پور

اچانک نوجوان نے چڑیل نما عورت کو زور کا دھکا دیا اور پھر پلک جھپکتے ہی عورت کے سر پر ایک آہنی سلاخ سے وار کردیا اور پھر اس کے سر پر وار کرتا ہی رہا جب تک وہ ڈھے نہ گئی۔

حوصلہ، ہمت، دیدہ دلیری اور بہادری کی نادیدہ قوتیں بھی قائل ہوتی ہیں، کہانی پڑھ کر دیکھیں

رحمت نے گھر میں چھلانگ لگادی اور کچھ دیر کے لئے وہیں دبکا رہا۔ جب اسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ اس کی اس حرکت کا کوئی ردعمل نہیں ہوا تو وہ دھیرے دھیرے دیوار کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔

اس کی منزل اس چھوٹے سے سرونٹ کوارٹر نما گھر کے ساتھ سیٹھ حشمت کی بلندوبالا حویلی کی فصیل تھی...... آہستہ آہستہ وہ اس کے قریب پہنچ ہی گیا۔ کندھے پر پہنا بیگ اتارا...... رات کی تاریکی کی وجہ سے اس کی آنکھیں دور تک نہ دیکھ سکتی تھیں لیکن تاحدنگاہ اسے کوئی ذی روح نظر نہ آئی تو مطمئن ہوکر اس نے بیگ کھولا۔

دس منٹ کے اندر اندر رحمت نے بلند فصیل پر رسی پھینکی اور اس پر چڑھنے کے لئے پرتولنے لگا...... بس اس کی دولت حاصل کرنے کی ہوس کا یہ آخری مرحلہ تھا...... کیونکہ حویلی مکمل طور پر خالی پڑی تھی۔ سیٹھ

حشمت اور اس کی زائد گوشت سے بھرپور موٹی بیوی ایک پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ رحمت کو اس بات کا بھی علم تھا اور وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف تھا کہ اس دو گھنٹے کے دوران گھر میں کوئی نہیں آئے گا۔ چوکیدار وغیرہ یا گھر کے نوکر چاکر کو اس حصے میں داخل ہونے کی رات کے وقت قطعاً اجازت نہ تھی، جہاں پر رحمت اب اترنے والا تھا۔ رحمت نے ایک بار پھر نہایت محتاط انداز میں اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو اس بار بھی اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ ہاں البتہ باہر گلی میں ایک کتے کے بھونکنے کی آواز ضرور آئی...... لیکن رحمت ایسی آوازوں کی خاطر میں نہ لانے کا عادی تھا...... اس کا شوق اور ہوس اسے اوپر چڑھنے پر مجبور کر رہا تھا...... اور بالآخر رسی کے سہارے وہ بلند فصیل پر چڑھنے لگا۔

چند ہی لمحات میں وہ بخیر و خوبی حویلی کے اندر تھا۔ یہاں بھی احتیاط کا دامن وہ تھامے ہوئے تھا۔ آہستہ آہستہ وہ عمارت کی طرف بڑھا، حویلی کی عمارت کا مین دروازہ تھوڑی سی چرر کے ساتھ کھلا تو ایک خوشگوار خوشبو رحمت کے نتھنوں سے ٹکرائی، ایسی خوشبو اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس کی تھی۔ وہ فوراً اندر داخل ہوگیا......

عمارت کا نہایت خوب صورتی سے جگمگاتا عمدہ و نفیس ہال رحمت کے سامنے تھا۔ ہر شے بیش قیمت تھی۔ رحمت کا دل چاہا کہ دو چار ٹرک لائے اور سارا سامان لاد کر فرار ہو جائے۔ مگر اپنی...... اس حماقت بھری سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دیا......

تھوڑی سی کوشش اور چھان بین سے رحمت اس الماری کے سامنے موجود تھا جہاں سیٹھ حشمت کی ''زوجہ ماجدہ'' کے زیورات پڑے تھے۔ الماری لاک تھی، لیکن رحمت ان کاموں میں ماسٹر جانا جاتا تھا۔ یہ چھوٹے موٹے لاک اس کی تیس سالہ زندگی میں کبھی رکاوٹ نہ بنے تھے۔

الماری کے دونوں پٹ کھلتے ہی رحمت کا منہ بھی کھلا رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا سونا اب اس کا ہونے والا ہے۔ لیکن یہ کیفیت رحمت پر زیادہ دیر نہ رہ سکی۔ کیونکہ نیچے عمارت کا دروازہ کھلنے کی چرر اسے سنائی دے گئی تھی...... ایک سنسنی سی اس کے بدن میں گونج اٹھی...... وہ الماری کے پٹ کھلے چھوڑ کر فوراً اٹھا اور بے آواز طریقے سے کمرے سے باہر نکل کر گیلری میں آیا...... جہاں سے عمارت کے ہال کا سارا منظر بخوبی نظر آتا تھا...... سیٹھ حشمت اور اس کی بیوی دونوں اندر داخل ہو چکے تھے۔

''اوہ خدایا...... یہ کیسے ہوگیا......؟'' رحمت کے منہ سے نکلا۔ اس کے چہرے پر اب واقعی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''عجیب لوگ ہیں تمہارے دوست بھی حشمت......'' حشمت کی بیوی کی آواز گونجی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا پرس لاپروائی سے ایک سمت پھینکا۔ حشمت فوراً اسے اٹھانے کے لئے دوڑا۔

''کسی مہمان کی عزت کا خیال ہے ہی نہیں انہیں...... کوئی کتنا امیج رکھتا ہے، کون وی آئی پی ہے اور کون وی وی آئی پی...... انہیں اس بات کی پرواہ ہی نہیں ہے...... بس پرواہ ہے تو صرف بے عزت کرنے کی...... میں اس پروین نگوڑی کو نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے میرا مذاق خوب اڑایا...... اور اس شائستہ کو بھی...... وہ مجھے دیکھ کر ''پھیلی ہوئی عورت'' کہہ رہی تھی۔ میں کیا عورت لگتی ہوں...... حشمت جواب دو مجھے......!'' اس کی چیخ و پکار کا گویا حشمت پر کوئی اثر نہ ہوا...... حشمت نے نیچے گرا پرس اٹھایا اور صوفے کے سامنے پڑے ٹیبل پر رکھ دیا۔

''تم نے جاتے ہوئے یہ دروازہ لاک کیا تھا......؟'' حشمت نے پوچھا۔

''دروازہ...... ہیں...... میں تم سے کیا پوچھ رہی ہوں...... اور تم...... اوہ...... اوہ...... اب سمجھ آیا...... دروازہ...... ہاں...... ہاں...... نہیں شاید نہیں...... اوہ میرے زیور...... میرے جہیز کے زیور......!'' مسز حشمت کے منہ سے عجیب و غریب آدھے ادھورے الفاظ نکل رہے تھے...... وہ پریشانی کے عالم میں

اٹھی...... اور سیڑھیوں کی سمت دوڑی...... جسامت میں ضخیم ہونے کی وجہ سے وہ ٹھیک طریقے سے دوڑ نہ پائی...... اور لڑکھڑا کر گر پڑی...... حشمت اس سارے واقعے پر نہ تو حیران ہوا اور نہ ہی اس نے اٹھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی ہاں البتہ اس نے آنکھ اٹھا کر گیلری پر ایک نظر دوڑائی...... اسے چھپا ہوا رحمت کا احساس ہو ہی گیا...... سائیڈ ٹیبل کے دراز سے حشمت نے پستول نکالا۔

''ابے...... کون ہے وہاں...... میں کہتا ہوں کہ شرافت سے باہر آ جا......!''

حشمت نے محتاط انداز میں کہا۔ اس کا رخ ٹیلی فون سیٹ کی طرف تھا۔

''اوہ...... کوئی ہے...... واقعی کوئی ہے...... میں کہتا ہوں کہ شرافت سے باہر آ جا......!'' حشمت نے محتاط انداز میں کہا۔ اس کا رخ ٹیلی فون سیٹ کی طرف تھا۔

''اوہ...... کوئی ہے...... واقعی کوئی ہے...... میں نے بھی ایک جھلک دیکھا ہے...... پولیس...... پولیس...... گارڈ...... چوکیدار...... حشمت...... کسی نہ کسی کو تو بلواؤ......'' مسز حشمت فرش پر بیٹھی بیٹھی چیخی۔ اتنی دیر میں حشمت ٹیلی فون سیٹ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے کریڈل اٹھایا...... تو دوسری طرف سے بھی فوراً رابطہ ہو گیا۔

''یس سر حکم......!'' یہ اس کے پرسنل گارڈ کی آواز تھی۔

''عابد...... جلدی سے اندر آؤ...... اور ہاں پولیس کو اطلاع دو کہ ہماری حویلی میں چور گھس آیا ہے...... جلدی کرو جلدی......!'' حشمت نے کہا اور کریڈل رکھ دیا۔

اوپر سے رحمت یہ ساری کارروائی دیکھ اور سن رہا تھا...... اس کا دماغ بھی تیزی سے بچ نکلنے کی سوچ رہا تھا...... لیکن کوئی ترکیب اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی...... کیونکہ اول تو یہ ساری بات اس کے پلان میں شامل نہ تھی کہ حشمت پارٹی سے جلد واپس آ جائے گا...... اسی لئے اس حوالے سے اس نے اس بات پر سوچا نہ تھا......

لیکن اب وہ سوچ رہا تھا۔ اور پھر بالآخر وہ مطمئن ہو گیا...... اس کے ذہن میں ایک پلان آ ہی گیا۔

عابد جیسے ہی اندر داخل ہوا...... تو حشمت نے اشارے سے رحمت کی طرف اس کی توجہ کروائی...... عابد جلدی سے لیکن محتاط طریقے سے سیڑھیاں چڑھنے لگا...... جیسے ہی اس نے آخری سیڑھی پر قدم رکھا رحمت نے چھلانگ لگا کر اسے نیچے کی سمت دھکا دیا...... رحمت نے بہت زیادہ پھرتی دکھائی اور نیچے گرتے ہوئے عابد کے ہاتھ سے نہ صرف پستول چھین لی بلکہ سیڑھیاں بھی چھلانگ کر نیچے آ گیا...... اب اس کا رخ سیٹھ حشمت کی طرف تھا...... پستول کا رخ اس کی سمت کئے وہ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا...... یہ سب یوں پلک جھپکتے ہوئے کہ مسز حشمت کو چیخنے چلانے کا وقت ہی نہ ملا...... اور دیکھا دیکھی رحمت دروازے سے باہر نکل گیا...... لیکن اسی وقت رحمت کو ایک اور افتاد نظر آ گئی۔ پولیس سائرن...... پولیس شاید حویلی کے مین گیٹ پر پہنچ گئی تھی......

رحمت کیلئے ان کے اندر آنے تک کا وقت بہت تھا...... وہ نہایت تیزی سے بلند فصیل کی سمت بڑھا...... جہاں دوسری طرف لٹکی رسی اس کی منتظر تھی۔ اور اپنی پھرتی کو برقرار رکھتے ہوئے رسی پر چڑھ دوڑا۔

''وہ رہا...... وہ بھاگ رہا ہے...... پکڑو......!''

رحمت نے دوسری طرف چھلانگ لگاتے ہوئے یہ آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی ایک فائر کی آواز بھی آئی۔

سرونٹ کوارٹر نما گھر سے نکل کر رحمت ایک سمت کو دوڑنے لگا...... پولیس بھی اس کے تعاقب میں تھی۔ وہ اس ایریے کی تمام پیچیدہ و تنگ گلیوں سے بخوبی واقف تھا...... اور یہی بات اس کے کام آ رہی تھی...... وہ دوڑتا رہا...... پولیس تعاقب میں ہی رہی لیکن پکڑ نہ پائی۔

گھنٹہ بھر دوڑنے کے بعد رحمت قبرستان تک آن پہنچا۔ اس کی منزل تو کچھ اور تھی لیکن بھاگتے بھاگتے اس کا سانس اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ مزید بھاگنا اب اس کی برداشت میں نہ تھا۔ اسی لئے وہ قبرستان میں داخل

ہوگیا..... پولیس کے دو جیالے ہی اب اس کے تعاقب میں تھے۔ قبرستان قریب پاکر خوف کے مارے وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اور واپسی اختیار کی۔

رحمت کے لئے یہ بہت خوش آئند بات تھی.....

لیکن بلا ابھی سر سے ٹلی نہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رات یہیں گزارے..... لیکن یہ واقعہ اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے علم میں تھا کہ رات کی تاریکی میں مردے جاگ جاتے ہیں۔ روحیں قبرستان میں منڈلاتی ہیں..... غرض ایسی سبھی فرضی کہانیاں اس کے خوف میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔ اس نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی کہ شاید سر چھپانے اور رات کا بقیہ حصہ گزارنے کی کوئی جگہ مل جائے..... اور اس کی یہ کوشش کامیاب ہو ہی گئی۔

قبرستان کے دوسرے سرے پر ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی۔ گنتی برابر گھر تھے وہاں سے روشنی نظر آنا کسی سبیل سے کم نہ تھا رحمت کیلئے۔

لڑکھڑاتے ہوئے رحمت بستی میں داخل ہوگیا.....

پہلی جس چار دیواری سے اس کا واسطہ پڑا وہ ایک مسجد تھی۔ رحمت کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ فوراً مسجد میں داخل ہوگیا۔

کمرہ نما مسجد میں تین صفیں نہایت سلیقے سے بچھائی گئی تھیں..... وہ وہیں ایک کونے میں دبک گیا..... مسجد کے اکلوتے گھڑیال نے اپنی ٹک ٹک سے اسے اپنی جانب مبذول کیا تو معلوم ہوا کہ رات کے تین بج رہے ہیں۔ گویا صرف تین گھنٹے تھے سورج نکلنے میں اور یہ وقت ستانے کے لئے بہت تھا۔

آدھے گھنٹے تک رحمت یونہی اکڑوں بیٹھا رہا..... کسی قسم کی کوئی گڑبڑ اسے نظر نہ آئی۔ تو اس نے ذہن کو سوچوں سے آزاد کیا..... ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں موندلیں..... لیکن وہ زیادہ دیر ایسا نہ کر پایا..... دودھیائی سی چمکتی روشنی کی تیزی نے اس کی آنکھیں کھول دیں وہ حیرت کے مارے اس روشنی کے بارے میں پریشانی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ آیا یہ کہاں سے آرہی ہے.....

لیکن روشنی نکلنے کا کوئی بھی ذریعہ اسے سمجھ نہ آیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب اس نے آنکھیں موندی تھیں تب تو سو واٹ کے بلب کی ملگجی روشنی سے کمرہ روشن تھا..... لیکن اب یہ دودھیائی روشنی.....!

خوف کی ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں گویا سرایت کر گئی..... وہ منہ کھولے حیرت سے کونے میں دبکا چھت کو تکے جا رہا تھا..... کہ اچانک ایک آہٹ اسے محسوس ہوئی..... اس نے فوراً آواز کے تعاقب میں نظریں دوڑائیں تو اب واقعی خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی..... وہ ساری فرضی کہانیاں ایک لمحے میں اس کے ذہن میں گردش کر گئیں..... اس کے سامنے والی دیوار سے مکمل طور پر سفید کپڑوں میں ملبوس ایک بزرگ برآمد ہوا..... حالانکہ دیوار میں کوئی دروازہ نہ تھا۔

ایک اور آہٹ نے رحمت کی توجہ اپنی طرف کروائی، دائیں دیوار سے ایسا ہی ایک اور بزرگ سفید لبادہ اوڑھے برآمد ہوا..... پھر تو گویا یہ سلسلہ چل نکلا..... دائیں بائیں آمنے سامنے..... مسجد کی چاروں دیواروں سے اس طرح کے سفید بزرگ برآمد ہونے لگے..... وہ اندر داخل ہوتے جاتے اور صف پر قطار در قطار بیٹھتے جاتے..... رحمت کا حلق خشک ہو چکا تھا..... وہ سانس لینا بھول گیا تھا..... ایسا اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ اس کیلئے غنیمت یہی تھی کہ وہ خاموش بیٹھا تھا.....

تینوں صفیں مکمل طور پر بھر چکی تھیں..... ایک بزرگ رحمت کے بالکل پاس موجود تھا..... لیکن شاید ان سب کو اس کا احساس نہ تھا اور پھر اچانک ممبر پر روشنی سی جگمگائی۔ اور ان بزرگوں جیسا ہی ایک بزرگ نمودار ہوا۔ ہیئت میں وہ ان سے کچھ بڑا تھا..... اور چہرے پر بے پناہ سکون وٹھہراؤ تھا..... اس کے نمودار ہوتے ہی سب سفید بزرگوں نے گردنیں خم کرلیں.....

"مجلس کمیٹی کے معزز ارکانان کو آبور کا سلام.....!" ایک آواز گونجی.....

خوف کی ایک اور لہر رحمت کے بدن میں گھومی۔

"آپ سب کو عبادات سے اس لئے اٹھایا گیا ہے

کہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ آن پڑا ہے۔ اسے حل کرنے کیلئے مشورے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ سب تیار ہیں۔ بارعب سفید بزرگ جو کہ ممبر پر براجمان تھے نے کہا تو نیچے بیٹھے تمام بزرگوں نے گردنیں ہلادیں۔

''بہت بہتر......! مسئلہ یہ ہے کہ ہماری ایک عبادت گاہ پر ایک پلید انسان آشوکا دیوی نے قبضہ جمالیا ہے......اسے بارہا سمجھانے کے باوجود بھی وہ نہ مان رہی ہے اور نہ ہی عبادت گاہ کو چھوڑ رہی ہے......ہم معزز جنات ہیں......انسانوں سے دور رہنے والے، ان کو کوئی نقصان نہ پہنچانے والے......پھر یہ دیوی اپنے جنتر منتر سے ہمیں قابو کرنا چاہتی ہے......اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوگئی تو یہ ایک سلسلہ چل نکلے گا......پھر تو جسے دیکھو دو چار جنتر منتر یاد کر کے ہم پر قابض ہو جائے گا......آپ سب سے مشورہ طلب ہے کہ ایسا کیا کیا جائے کہ نہ اس دیوی کی ہمارے ہاتھوں موت نہ ہو اور ہماری جان بھی چھوٹ جائے......حالانکہ وہ بہت مغرور، گھمنڈی اور سرکش ہے!'' وہ بزرگ خاموش ہوا تو ایک خاموشی مسجد میں پھیل گئی......گویا وہ سب اپنے اپنے مشوروں کے متعلق سوچ رہے ہوں......

''کیا یہ کام ہم کسی انسان سے نہیں کرواسکتے......مطلب ہم میں سے کوئی ایک کسی انسان پر قابض ہو جائے اور اس کے ہاتھوں آشوکا دیوی کو مار ڈالے تو......؟''

''نہیں......!'' بزرگ آبود نے فوراً نفی میں سر ہلادیا۔

''ہم نے ایسا کچھ نہیں کرنا کہ جس سے ہم گناہ گار ثابت ہوں۔ ہاں البتہ یہ بات ثابت ہو سکتی ہے کہ کوئی انسان خود اسے مارے یا راہ راست پر لائے۔ مگر ایسا کرے گا کون......؟'' آبود نے کہا۔ تو سب کے سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

رحمت کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ سانس لینا تک بھول گیا تھا۔ وہ حیرت زدہ تھا کہ ان جنات کو اس کی موجودگی کا علم کیوں نہیں ہوا......اگر ہوا بھی ہے تو یہ سب یوں اسے کیوں نظر انداز کئے دے رہے ہیں!

ڈراپ سین

سسکتی ہوئی آسیبی رات کا سناٹا شکستہ و نیم پختہ قبروں پر کوڑیالے ناگ کی طرح سرسرا رہا تھا......ایک ناقابل بیان سی نحوست پورے قبرستان پر طاری تھی۔

فضا کے ہولناک سناٹے میں ہوائیں بین کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں......میں اس وقت مشینی انداز میں جامد ہو چکا تھا۔ میرا پورا وجود سرتا پا کپکپا رہا تھا۔ چہرے پر دہشت سمٹ آئی تھی، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ اثنائے راہ بادلوں پر بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ ہواؤں کا رخ میری طرف ہوگیا۔ میرے سامنے ایک خوفناک منظر تھا۔ ایک خوفناک سر کٹا انسان میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں تیز دھار کلہاڑی اٹھا رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں اپنا کٹا سر۔ قریب آ کر اس نے اپنا سر زمین پر رکھا اور دونوں ہاتھوں سے کلہاڑی تھام کر میری طرف بڑھنے لگا۔ قریب آ کر اس نے کلہاڑی مارنے کے انداز میں بلندی کی کہ میں......!

میں نے T.V بند کر دیا اور رات کو ہارر موویز دیکھنے سے توبہ کر لی

(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

مجلس کمیٹی کے ارکان کی سوچ بچار میں بہت وقت بیت چکا تھا..... لیکن کوئی بھی حل نہ ملا۔ اچانک آبور چونکا۔

''اوہ..... مؤذن آگیا..... ہمیں چلنا ہوگا.....!''

اور وہ جس طرح نمودار ہوا تھا اسی طرح غائب بھی ہوگیا۔ صفوں پر بیٹھے جنات بھی تیزی سے اٹھے اور دیواروں میں غائب ہوتے گئے۔

مسجد کے کمرے کا دروازہ کھلا، اور ایک نوجوان لڑکا اندر داخل ہوا۔ وہ اپنی آستینیں نیچے کررہا تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی میں سے وضو کے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ وہ اچانک رحمت کو دیکھ کر چونکا۔

''ارے..... آپ..... آپ کون ہیں..... مسافر ہیں شاید.....؟'' لڑکے نے کہا۔

لیکن رحمت نے فی الوقت کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جنات کی مجلس کے خوف میں ہی اب تک کھویا ہوا تھا۔

''کیا آپ سن رہے ہیں مجھے..... صاحب.....!'' لڑکے نے پاس بیٹھ کر اکڑوں بیٹھے ہوئے رحمت کے کندھے کو ہلایا تو جیسے رحمت کو ہوش آگیا۔

''وہ..... وہ..... سیٹھ حشمت..... موٹی بیوی..... پولیس..... اوہ..... جنات..... جنات کی مجلس..... آشوکا..... میں..... تم.....!'' رحمت کو جیسے ہوش آگیا تھا۔ وہ عجیب انداز میں چیخنے لگا اور مسجد میں دوڑنے لگا۔ اس کے منہ سے عجیب وغریب الفاظ نکل رہے تھے۔

لڑکے نے جلدی سے اسے پکڑا۔ اور زمین پر الٹا لٹا کر اس کی کمر پر بیٹھ گیا۔ رحمت کو آخری احساس یہ تھا کہ وہ لڑکا کہہ رہا تھا۔

''آپ نے شاید کچھ عجیب وغریب دیکھ لیا ہے..... آپ کو بخار بھی ہے.....'' اس کے بعد رحمت کو ہوش نہ رہا۔

چہرے پر نمی کا احساس ہوتے ہی رحمت کی آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی رات گئے کے سارے منظر ذہن میں اجاگر ہوگئے۔ ''ڈرنے کی ضرورت نہیں..... اللہ رحم کرنے والے ہیں..... تم اپنے متعلق بتاؤ ہمیں.....!''

ہاتھ میں پانی کا گلاس تھامے مسجد کے امام صاحب رحمت کے سامنے تھے۔ ''آپ اس مسجد کے پیش امام ہیں.....؟'' رحمت نے کمزور آواز میں پوچھا۔ ''جی ہاں..... رات کیا ہوا تھا.....؟ انہوں نے پوچھا تو رحمت نے رات کے متعلق اسے کچھ بتانے سے گریز کیا۔

''کچھ خاص نہیں..... بس میں مسافر ہوں، راہ بھٹک گیا اور ادھر آنکلا..... قبرستان کے خوف کے مارے نجانے کیا ذہن پر سوار ہوا کہ بخار ہوگیا..... اب میں بہتر محسوس کررہا ہوں.....؟'' رحمت نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

سورج کافی چڑھ گیا تھا۔ پیش امام نے اسے ناشتہ کروایا۔ اور علیک سلیک کے بعد رحمت دوبارہ شہر کو روانہ ہوا۔

گزشتہ رات کے سارے مناظر اس کے ذہن میں کسی فلم کی طرح گردش کررہے تھے۔ اور اس کا ضمیر اسے جھنجوڑے جارہا تھا۔ ''وہ اللہ کی نیک مخلوق ہے۔ یہ آشوکا دیوی کون ہے.....؟ کیا اسے میں ختم کرکے جنات کی عبادت گاہ کو آزاد کرواسکتا ہوں..... مگر نہیں..... جو دیوی جنات کے قابو میں نہیں وہ ایک انسان کے قابو میں کیسے آسکتی ہے.....؟'' ضمیر کی بات بجا تھی۔ وہ شاید ایسا نہیں کرسکتا تھا کیونکہ وہ ایک انسان تھا۔

سیٹھ حشمت کے گھر سے ناکامی پر رحمت شدید رنجیدہ بھی تھا۔ اب اسے اگلی چوری کے لئے پورے ایک ماہ کا وقت ضائع کرنا پڑا تھا..... پہلے تو جہاں سے چوری کرنی ہے اس کوٹھی یا حویلی کا انتخاب کرنا، پھر اس کے اندر کے معاملات کی جانچ پڑتال..... یہ ایک لمبا سلسلہ تھا..... اور پیٹ کی خاطر رحمت کو یہ سب کرنا تھا۔

اگلی رات رحمت اپنے گھر میں بڑے آرام سے سو رہا تھا۔ وہ ابھی تک کنوارہ تھا۔ اور ماں باپ سے بھی دور تھا۔ اس لئے اکیلا رہنا اس کی مجبوری تھی۔ رات کے آخری پہر دستک سے اس کی آنکھ کھلی۔

''کون ہے.....!'' دروازے کے قریب جاکر اس نے پوچھا۔

''دروازہ کھولئے.....!'' ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

رحمت کو قدرے حیرت ہوئی کہ رات کے اس پہر کون آیا ہے...... ڈرتے ڈرتے اس نے دروازہ کھولا...... کالی چادر میں لپٹی ایک عورت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ''جی فرمائیں......'' رحمت نے اتنا ہی کہا تھا۔ کہ عورت نے ایک زوردار دھکا اسے دیا...... رحمت اس دھکے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ اوندھے منہ نیچے گر پڑا۔ عورت اندر داخل ہوئی۔ اور عقب سے دروازہ بند کر دیا...... اور جلدی سے نیچے گرے رحمت کی چھاتی پر بیٹھ کر اس کا گلا دبا دیا......

''کل رات...... مجلس جنات کے ارکان نے کیا فیصلہ کیا تھا...... مجھے بتاؤ؟'' اس عورت نے کہا۔ اور چہرے سے چادر بھی ہٹا دی۔

کل رات والے واقعہ کے بعد رحمت کے اعصاب قدرے مضبوط ہو گئے تھے۔ اس نے عورت کے چہرے کو دیکھا...... نہایت بدہیئت اور کریہہ شکل تھی۔ آنکھیں مکمل طور پر لال انگارہ تھیں۔ جیسے جلتا کوئلہ ان میں رکھ دیا گیا ہو۔

''تم آشوکا دیوی ہو......!'' اس نے ہمت جمع کر کے پوچھا۔

''ہاں...... میں ہی آشوکا دیوی ہوں...... مجھے بتاؤ کہ کیا فیصلہ ہوا رات میں۔''

''نہیں بتاؤں گا......!'' رحمت نے مسکراتے ہوئے کہا تو ایک زوردار گھونسہ آشوکا دیوی نے رحمت کے جبڑے پر دھر دیا۔

''بتاؤ...... ورنہ جان سے جاؤ گے......!'' وہ دھاڑی

''اگر جان سے گیا تو فیصلے کے متعلق تمہیں کون بتائے گا دیوی صاحبہ......!''

رحمت نے معنی خیز انداز میں کہا۔ گھونسے کی وجہ سے اس کے منہ سے خون نکل آیا تھا...... لیکن ایسی لاتیں گھونسے اور مار کھانے کا وہ عادی تھا...... اب اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا...... ایک خیال تھا کہ اسے مار کر وہ جنات کی عبادت گاہ کو آزاد کرائے گا......

''ہوں...... ایسے نہیں مانے گا تو...... کچھ کرنا پڑے گا......!'' آشوکا دیوی نے کہا اور رحمت کے سینے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رحمت کو اس بات کا انتظار تھا۔ وہ جیسے ہی کھڑی ہوئی، رحمت نے پاس پڑی لوہے کی سلاخ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری...... آشوکا دیوی اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھی...... وہ درد سے کلبلائی اور زخمی ناگن کی مانند رحمت پر جھپٹی...... لیکن رحمت نے اسے چکمہ دیا اور ایک بار پھر زوردار وار کیا...... یہ ضرب کاری ثابت ہوئی...... آشوی دیوی زمین پر چت لیٹ گئی...... رحمت کو بخوبی علم تھا کہ اگر آشوکا دیوی کو لمحہ بھی وقت ملا تو وہ کوئی جنتر منتر پڑھ کر اپنا دفاع کرے گی اور اسے نقصان پہنچائے گی......

رحمت اندھا دھند سر پر وار کئے جا رہا تھا...... اور چند ہی لمحوں میں آشوکا دیوی اپنی سانسیں کھو چکی تھی......

رحمت کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس عورت سے جنات اتنا پریشان تھے اسے لمحوں میں ہی اس نے مار ڈالا......

اچانک کمرے میں دودھیائی روشنی پھیلی، ویسی ہی روشنی جیسی گزشتہ رات مسجد میں پھیلی تھی...... رحمت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی...... وہ سمجھ گیا کہ اب آبور اور اس کی مجلس کمیٹی کے ارکان جمع ہوں گے...... اور ایسے ہی ہوا...... چند ہی لمحوں میں آبور سمیت گزشتہ رات والے سارے جنات اس کے سامنے حاضر تھے۔

''آدم کی اولاد...... تم نے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے...... ہم اس بات سے گزشتہ رات غافل نہ تھے کہ تم یہاں موجود ہو...... لیکن یہ بھی گویا حکمت تھی...... خیر ہم سب تمہارے شکر گزار ہیں......؟'' آبور نے کہا اور سر خم کیا...... اس کی دیکھا دیکھی تمام جنات نے بھی ایسا ہی کیا...... رحمت نے فاتحانہ انداز میں ایک نظر ہاتھ میں پکڑی سلاخ پر اور دوسری نظر خون میں لت پت آشوکا دیوی پر ڈالی......!

پھر آبور کی آواز سنائی دی۔ ''نوجوان پریشان نہ ہو، ہم تمہاری بہادری اور کارکردگی کا صلہ ضرور دیں گے۔ اور پھر سارے جنات نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

غیبی آواز

ملک فہیم ارشاد- ڈجکوٹ فیصل آباد

قانون قدرت کے گرویدہ صرف انسان ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے جتنی مخلوقات پیدا کی ہیں، سب کی سب قانون قدرت پر عمل پیرا ہیں جس کا اٹل ثبوت اس کہانی میں موجود ہے۔

ایک نادیدہ ہستی کی چاہت خلوص اور محبت کی دل و دماغ سے محو نہ ہونے والی دلکش کہانی

"**حمیرا** اٹھو۔" اچانک حمیرا کے کانوں میں ایک مردانہ آواز پڑی۔ حمیرا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی وہ اردگرد دیکھنے لگی۔ اس کے ماں باپ اپنی اپنی چارپائی پر چادر اوڑھے گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ "کیا ہوا..... مجھے کیوں گہری نیند سے جگادیا؟" حمیرا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"بس ایویں....." حمیرا کے کانوں میں مردانہ آواز آئی۔

"یہ تو اچھی بات نہیں۔" حمیرا نے بدستور منہ بناتے ہوئے کہا۔ ....."اب میں تمہاری باتوں کی طرف بالکل بھی دھیان نہیں دوں گی۔"

"ارے ...... ارے...... سنو تو سہی....." تیز مردانہ آواز اس کے کانوں میں پڑی لیکن حمیرا اتنی دیر میں چادر اوڑھ چکی تھی۔

"اچھا..... سنو تو سہی۔ تمہاری سہیلی فرزانہ خطرے میں ہے.....؟" حمیرا نے یہ سنا تو یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا.....؟" اس کا انداز چلانے والا تھا۔

"ارے... ارے چلاؤ مت..... اٹھو اور جلدی کرو..... اگر چاہتی ہو کہ گاؤں میں شور بھی نہ پڑے اور تمہاری سہیلی کی عزت بھی رہ جائے تو جلدی سے اٹھو۔"

کانوں میں پڑنے والی اس آواز نے بظاہر حمیرا کو ہدایات دی تو حمیرا نے چارپائی سے اپنے دونوں پاؤں لٹکا کر چپل پہنی اور پھر چارپائی سے اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو وہی غیبی مردانہ آواز پھر اس کے کانوں میں پڑی۔ "کوئی ہتھیار نہیں لوگی.....؟"

وہ رکی..... "کیا لوں....." حمیرا نے اردگرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا مردانہ آواز کے مالک کا وجود کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"کچھ بھی لے لو...... جس سے تم اپنا دفاع کرسکو۔" غیبی آواز نے کہا تو حمیرا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اندرونی کمروں کی طرف بڑھی تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک تیز دھار کلہاڑی تھی۔

"خوب..... غیبی آواز میں اس مرتبہ مسکراہٹ شامل تھی۔" چلو اب گھر سے باہر نکلو۔

بیرونی دروازے کے قریب پہنچنے پر حمیرا نے آہستگی سے پہلے دروازے کی کنڈی گرائی اور اسی آہستگی سے دروازہ کھولنے کے بعد باہر نکل آئی اس نے آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا۔ "اب....." حمیرا نے اردگرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"اب سیدھی چلتی رہو......" غیبی آواز نے کہا تو وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے چل پڑی، وہ غیبی آواز کی پیروی میں چلتی رہی کبھی وہ دائیں مڑی تو کبھی بائیں پھر وہ ایک گلی میں پہنچی تو اس نے ایک حیران کن منظر دیکھا سامنے ایک نقاب پوش آدمی اس کی سہیلی فرزانہ کو کندھے پر لادے چل رہا تھا فرزانہ بے ہوش تھی اور اسکے ہاتھ نیچے کی طرف جھول رہے تھے۔

"اب میری بات غور سے سنو۔ اس جوان کو صرف ڈرانا ہے مارنا نہیں۔" غیبی آواز نے کہا تو حمیرا اثبات میں سرہلاتے ہوئے تیزی سے اس شخص کی طرف بھاگی۔ "اے حرام زادے، میری سہیلی کو چھوڑ..... نہیں تو تیرا قیمہ بنادوں گی۔" حمیرا چیختے ہوئے کلہاڑی ہوا میں لہراتے ہوئے بولی، اس اچانک آفت پر وہ نوجوان بوکھلا گیا اس نے کندھے پر موجود فرزانہ کو زمین پر پھینکا اور تیزی سے ایک گلی کا راستہ پکڑ لیا۔

"رک حرام زادے ...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" حمیرا نے کلہاڑی دوبارہ ہوا میں لہرائی اور اس نوجوان کے پیچھے بھاگی۔ "چھوڑ دو اسے اب، اب وہ ڈر چکا ہے۔" غیبی آواز نے کہا۔

"نہیں...... میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" حمیرا نے غصے سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے جاؤ پھر اس کے پیچھے...... اگلی گلی میں اس کے دو تین دوست کھڑے ہیں۔ ہوس کے مارے وہ چاروں تمہاری سہیلی کو چھوڑ کر تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے۔" غیبی آواز نے غصے سے کہا تو حمیرا کے بھاگتے قدم یکدم رک گئے۔

"جاؤ اب رک کیوں گئی بنوان کی ہوس کا نشانہ بنو۔" غیبی آواز کے لہجے میں اس مرتبہ بھی غصہ شامل تھا۔

"وہ واپس تو نہیں آئیں گے۔ حمیرا نے گھبراتے ہوئے پوچھا تو حمیرا کے کانوں میں ایک زوردار قہقہہ کی آواز پڑی۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بڑی شیرنی بن رہی تھی اور اب بھیگی بلی بن گئی ہو۔" غیبی آواز نے اس کا مذاق اڑایا۔

"بتاؤ...... بھی اب کیا کروں" حمیرا نے غصے سے منہ بنایا۔

"اب ڈرنے کی بات نہیں وہ چاروں گھبرا کر جاچکے ہیں۔" "تم اپنی سہیلی کو دیکھو اسے گھر پہنچاؤ۔"

حمیرا نے اطمینان کی ایک گہری سانس کھینچی اور اپنی سہیلی فرزانہ کی طرف بڑھی۔

☆......☆......☆

"عقیلہ...... جلدی سے ناشتہ لے آؤ" میں نے زمینوں کی طرف بھی جانا ہے...... "عقیلہ کا شوہر نواز عرف راجا کمرے کے اندر سے چلایا۔

"آئی بابا......" عقیلہ نے لسی کا گلاس بھرا اور ناشتے کی ٹرے اٹھا کر کمرے میں لے آئی۔ "تم سے تو ایک منٹ کا بھی صبر نہیں ہوتا۔" عقیلہ نے ناشتہ کی ٹرے چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"عقیلہ تو چنگی طراں جاندی اے، چوہدری حشمت بڑا روکھا بندہ ہے، دیر سے آنے پر بولتا ہے۔" نواز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے پھر جلدی روٹی کھالو۔" جواباً عقیلہ مسکرائی تو نواز بھی مسکراتے ہوئے ناشتے میں مصروف ہوگیا۔

"تو کچھ دنوں کے لئے اپنے ابا کے گھر ہوآ۔" نواز نے روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں چلی گئی تو گھر کا کام کاج اور ہانڈی روٹی کون کرے گا۔" عقیلہ نے سوالیہ نگاہوں سے نواز کی طرف دیکھا۔

"میری فکر نہ کرو ویسے بھی میں گھر میں کون سا رہتا ہوں۔ صبح سویرے چلا جاتا ہوں اور شام اندھیرے واپس آتا ہوں۔" نواز نے زمین پر پڑا لسی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"فکر کیوں نہ کروں...... یہ تمہاری مہربانی ہے کہ مجھ سوکھتی فصل کو گھر میں رکھے ہوئے ہو اگر کوئی اور ہوتا تو بہت پہلے مجھے چھوڑ چکا ہوتا۔" عقیلہ نے دکھی دل کے ساتھ کہا۔

"تم دل چھوٹا نہ کرو میری جان، یہ تو رب کے کام ہیں اور شادی تھوڑی اولاد کے لئے کی جاتی ہے ایک

دوجے کا پیار بھی کافی ہوتا ہے۔" نواز نے کہا اور لسی کا گلاس منہ سے لگالیا۔

پھر نواز نے خالی گلاس زمین پر رکھا اور ایک زوردار ڈکار مارا..... "اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اور ساتھ ہی نواز اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری بات تو سنو۔" عقیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں نواز کو مخاطب کیا نواز دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا "بول۔"

نواز نے پوچھا..... "یہی کہ آپا کشور اپنا چھوٹا پتر انور ہمیں دے دے اگر تم کہو تو میں ان سے بات کروں۔" عقیلہ نے کہا۔

"پاگل تو نہیں ہوگئی ہو وہ کبھی نہیں دے گی اپنا بچہ اور اگر اس نے دے بھی دیا تو رہے گا تو اس کا ہی بچہ ناں...... اور تم سے بچے کے لئے کہتا کون ہے" نواز کو یکدم غصہ آگیا تو عقیلہ نے رونا شروع کردیا نواز غصے سے اس کی طرف دیکھنے لگا پھر اسنے پیار سے عقیلہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو عقیلہ اس مسئلے میں زیادہ پریشان تو مجھے ہونا چاہئے لیکن میں تو کبھی اس بارے میں سوچتا بھی نہیں گھر میں اکیلی رہتی ہو اس لئے تو سوچتی رہتی ہوں میں آج شام کو تمہیں ابا کے گھر چھوڑ کر آؤں گا۔"

"میں نے نہیں جانا وہاں...... وہاں اماں مجھے تنگ کرتی رہتی ہیں۔" عقیلہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"چلو ٹھیک ہے پھر اپنی چھوٹی بہن نسرین کو بلالو۔" نواز نے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے کسی کے ہاتھ پیغام بھجوادوں گی۔" عقیلہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں اور نہیں تو چوہدری غصہ ہوگا" نواز نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا اس نے ایک طرف کھونٹی پر لٹکا اپنا رومال اتارا اور اسے کندھے پر ڈال لیا۔

عقیلہ نے چارپائی سے برتن اٹھائے اور انہیں دھونے کے بعد الماری میں رکھ دیا گھر میں جھاڑو دینے کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے چارپائی پر لیٹ گئی۔

عقیلہ اور نواز کی شادی کو چار سال ہوگئے تھے وہ دونوں اپنی زندگی میں بہت خوش تھے لیکن پھر اولاد کی کمی نے انہیں آہستہ آہستہ اپنی طرف متوجہ کیا عقیلہ پریشان سی رہنے لگی گاؤں کی لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا لیکن ابھی اسکی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ گزرتا وقت جب تین کا ہندسہ بھی پار کر گیا تو عقیلہ کی اولاد کی خواہش نے اسے مزید پریشانیوں میں مبتلا کردیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اولاد ان کے مقدر میں نہیں ہے نواز نے اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہونے دیا تھا وہ ان سوچوں کے گھیرے سے باہر آئی تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا سورج آگ برسا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھی اس نے اپنے بال سیٹ کر کے پیچھے کی طرف باندھے اور پھر باتھ روم کی طرف بڑھی باتھ روم سے فارغ ہونے کے بعد وہ چولہے کے قریب بیٹھی وہ مٹی کے تیل کا چولہا تھا عقیلہ نے تیل چیک کرنے کے بعد ماچس کی تیلی جلائی اور چولہے میں ڈالی تو یکدم پیچھے ہٹی اگر عقیلہ بروقت اپنا چہرہ پیچھے نہ کرتی تو آگ کا وہ بڑا سا شعلہ آسمان کی طرف لپکا تھا۔ اس نے عقیلہ کا چہرہ نگل لینا تھا عقیلہ نے اپنے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور حیرت سے چولہے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

چوہدری حشمت علی عورتوں کا رسیا تھا۔ وہ چوہدری رحمت کا اکلوتا بیٹا تھا چوہدری رحمت بھی جوانی میں عورتوں کا خوب رسیا تھا۔ کوئی بھی عورت اس کی نظروں میں آتی تو پھر رات کو وہ چوہدری رحمت کے بستر کا حصہ ضرور بنتی۔ بڑھاپے میں بھی وہ اپنی ان حرکت سے باز نہ آتا اگر اس پر فالج حملہ نہ کرتا...... فالج کی حالت میں بھی اس کا غرور کم نہیں ہوا تھا۔

داناؤں کا قول ہے کہ زمیندار وڈیرے لوگ مرتے مرجائیں گے لیکن اپنی اکڑ آنا اور غرور نہیں چھوڑتے...... چوہدری رحمت تو اپنے نام کے معنوں پر بھی پورا نہیں اترتا تھا۔ وہ پورے گاؤں کے لئے رحمت کی بجائے زحمت بنا ہوا تھا اور ویسے بھی پوری زندگی کا تجربہ ہے رحمت کرنے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے،

وہی ذات ہے جو اپنے بندے کا ہر طریقے اور ہر طرح سے خیال کرتی ہے۔

ایک شادی کی تقریب تھی جس میں چوہدری حشمت گیا ہوا تھا وہ ایک بڑی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور ساتھ والی کرسی پر اس کا منشی مہر علی بیٹھا ہوا تھا، جو اس کا خاص آدمی تھا سامنے لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر ناچ رہی تھیں تھوڑی دیر بعد ایک خوب صورت لڑکی ہاتھ میں ٹرے لئے چوہدری حشمت کے قریب آئی، ٹرے پر شربت کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ لڑکی جیسے ہی ٹرے کو چوہدری حشمت کے آگے کرنے کے لئے جھکی تو اس لڑکی کا دوپٹہ گریبان سے سرک کر نیچے جھول گیا۔ چوہدری حشمت کی آنکھیں چمک اٹھی اور بے اختیار چوہدری حشمت کے منہ سے نکلا۔ ”ارے مار ڈالا۔“

وہ لڑکی چوہدری حشمت کی ہوس کو صاف سمجھ گئی اس نے غصے سے چوہدری حشمت کو گھورا اور الٹے پیروں واپس چلی گئی۔ مہر علی نے شربت پکڑنے کے لئے جو ہاتھ اٹھایا تھا وہ خالی کا خالی رہ گیا۔

”یہ کیا چوہدری صاحب ...... آپ نے میرا شربت کا گلاس واپس بھیج دیا“ مہر علی دکھی لہجے میں بولا۔

”او فکر کیوں کرتا ہے مہر تو میرا شربت کا گلاس لے لے۔“ اتنا کہہ کر چوہدری حشمت نے اپنا شربت کا گلاس مہر علی کی طرف بڑھا دیا اور مہر علی نے جلدی سے گلاس پکڑا اور منہ سے لگا لیا۔

”مہر...... چوہدری حشمت نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے مہر کو آواز دی۔

”جی چوہدری......“ مہر مودبانہ لہجے میں بولا۔

”یہ کس درخت کا پھل ہے؟“ چوہدری حشمت نے پوچھا۔

”یہ شبیر کمہارے کی بیٹی ہے چوہدری صاحب ......فرزانہ۔“ مہر نے بتایا۔

”بڑی سوہنی ہے،“ چوہدری حشمت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہے تو واقعی بڑی سوہنی چوہدری صاحب۔“ مہر نے چوہدری حشمت کی تائید میں سر ہلایا۔

”کب ملاقات کرائے گا۔“ چوہدری حشمت نے مسکراتے ہوئے مہر کی طرف دیکھا۔

”جب آپ حکم کریں چوہدری صاحب......“ مہر علی نے کہا بس تو پھر جلدی ہی یہ پھول ہمارے بستر پر ہونا چاہئے تاکہ میں اس پھول کی پنکھڑیاں نوچ سکوں۔“ چوہدری حشمت دانت بھینچتے ہوئے بولا۔

”حکم کی تعمیل ہوگی چوہدری صاحب......“ مہر علی نے خوشامدی لہجے میں کہا اور چوہدری حشمت اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا کر مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔

☆......☆......☆

حمیرا گاؤں کی سب سے زیادہ خوب صورت لڑکی تھی ...... اس غیبی آواز کا تعلق اس سے بچپن میں ہی جڑ گیا تھا فرزانہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ جب اس نے پہلی مرتبہ اس آواز کو سنا تو اس وقت اس کی عمر سات آٹھ سال تھی۔ فرزانہ اور وہ چھٹی کے بعد گھر جا رہی تھی۔ ”حمیرا، وہ دیکھ کچے آم۔“ اچانک فرزانہ نے چہکتے ہوئے پیڑ پر لٹکے کچے آموں کی طرف اشارہ کیا

”تو کھائے گی آم۔“ حمیرا نے اس سے پوچھا۔

”پوچھ تو ایسے رہی ہے جیسے ابھی درخت پر چڑھے گی اور مجھے آم توڑ کر لا دے گی۔“ فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”تو بول تو سہی۔“ حمیرا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”چل ٹھیک ہے۔ درخت پر چڑھ جا اور میرے لئے آم توڑ لا۔“ فرزانہ نے بظاہر اسے اجازت دی۔

حمیرا نے کندھے پر لٹکا اپنا اسکول بیگ اتار کر فرزانہ کو پکڑایا اور درخت کی طرف بڑھی اس نے اوپر سے نیچے درخت کی طرف دیکھا چھوٹی بڑی ٹہنیوں سے وہ آسانی سے درخت پر چڑھ سکتی تھی۔ اس نے ایک نگاہ درخت سے تھوڑی دور کھڑی فرزانہ پر ڈالی اور پھر اس نے درخت پر چڑھنا شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ اس ٹہنی کے قریب پہنچ گئی جس پر وافر مقدار میں آم لگے ہوئے تھے۔ وہ اس سے نچلی ٹہنی پر بیٹھ گئی۔

"فرزانہ ......" حمیرا نے فرزانہ کو آواز دی تو فرزانہ درخت کے نیچے آگئی۔ "میں آم توڑ کر پھینکتی ہو تو انہیں سنبھال" حمیرا نے نیچے کھڑی فرزانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو فرزانہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی وقت حمیرا کے کانوں میں شاخ کے ٹوٹنے کی آواز پڑی جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔ حمیرا کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اس نے اوپری شاخ کو تھامنا چاہا پر دیر ہو چکی تھی۔ شاخ ٹوٹ چکی تھی اور وہ چیختی ہوئی تیزی سے زمین کی طرف چلی آئی۔

"چیخ کیوں رہی ہو...... کسی شاخ کو تھام لو۔"

اچانک ایک مردانہ آواز اس کے کانوں میں پڑی اس آواز نے اسے ہوش دلایا اور اس نے جلدی سے ایک شاخ کو تھام لیا اس کے بازوؤں کو ایک زوردار جھٹکا لگا تکلیف کے باعث اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور اس نے شاخ کو چھوڑ دیا اب وہ زمین کے کافی قریب تھی۔ اس لئے زمین پر گرنے کی وجہ سے اسے کوئی چوٹ نہ آئی لیکن بازوؤں کو جھٹکا لگنے کی وجہ سے اسکے بازو بری طرح دکھ رہے تھے۔

وہ رونے لگی فرزانہ اب اس کے قریب آچکی تھی وہ ڈر کی وجہ سے درخت سے دور ہوگئی تھی۔ "اللہ کا شکر ہے کہ تجھے کوئی چوٹ نہیں آئی۔" فرزانہ نے کہا۔

"مگر تو گر کیسے گئی......؟"

"شاخ ٹوٹ گئی تھی اس لئے گر گئی تھی......" حمیرا نے روتے ہوئے کہا۔

"لیکن تو اتنی اونچائی سے گری مگر تجھے چوٹ بالکل بھی نہیں آئی...... حیرت ہے۔" فرزانہ واقعی حیران تھی۔

"کسی نے مجھے آواز دی تھی کہ چیخ کیوں رہی ہو...... کسی شاخ کو تھام لو۔" تو میں نے جلدی سے شاخ تھام لی اور حمیرا نے بتایا۔

"کسی نے......؟" فرزانہ حیران ہوئی۔ "پر کس نے یہاں تو میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔"

حمیرا نے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں وہاں واقعی ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ "ہیں! تو پھر مجھے کس نے وہ آواز دی تھی...... اگر وہ آواز میرے کانوں میں نہ پڑتی تو میں نے تو سیدھا زمین پر گرنا تھا......" حمیرا نے حیرانگی سے کہا۔

"وہم ہوگا تیرا۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہوسکتا ہے۔" حمیرا نے کندھے اچکائے۔

اس کے بعد دوبارہ یہ آواز اسے گاؤں میں لگنے والے میلے میں سنائی دی تھی۔ اس کے ماں باپ اسے میلہ دکھانے کے لئے لائے تھے۔

وہ تینوں ایک طرف بیٹھے گرما گرم جلیبیاں کھا رہے تھے۔ "ابا میں بحری بیڑہ دیکھنے جا رہی ہوں۔" حمیرا نے اپنے ابا سے اجازت چاہی۔ "ٹھیک ہے پتر...... پر زیادہ دور نہ جانا۔" ابا نے مسکراتے ہوئے اسے اجازت دی، اور پھر اجازت ملتے ہی وہ تیزی سے اٹھی اور ہوا میں اچھلتے بحری بیڑے کو دیکھ کر خوش ہونے لگی اچانک حمیرا کی نظر ایک روتے ہوئے بچے پر پڑی۔ وہ چھ سات سال کا بچہ جو اماں اماں کہتا ہوا رو رہا تھا، میلے میں گم لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے اچانک ایک آدمی آگے بڑھا اور اس بچے کو اٹھا لیا۔

"ارے...... میرا بیٹا رو رہا ہے،" وہ آدمی پیار سے بچے کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا۔ "نا میرا بیٹا نا رو۔"

حمیرا اس آدمی کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی اس آدمی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور چہرے پر زخموں کے نشانات تھے، لیکن حمیرا نے جو اہم بات نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ اس آدمی نے جب سے بچے کو اٹھایا تھا، اس بچے نے چپ کرنے کی بجائے مزید رونا شروع کر دیا تھا۔ اگر وہ شخص اس بچے کا باپ ہوتا تو وہ بچہ اسی وقت چپ ہو جاتا لیکن بچے نے تو مزید رونا شروع کر دیا تھا۔

"مجھے تو یہ آدمی چور لگتا ہے۔" حمیرا خود سے ہمکلام ہوئی۔

"تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔" ایک جانی پہچانی مردانہ آواز حمیرا کے کانوں میں پڑی۔

"بالکل......" بے اختیار حمیرا کے منہ سے نکلا پھر یکدم حیرت نے اس پر گھیرا ڈالا۔ "کک......

کک...... کون ہو تم۔" وہ ہکلائی ساتھ ہی اس نے اس طرف دیکھا جہاں وہ آدمی بچے کو اٹھائے کھڑا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا حمیرا کا ماتھا ٹھنکا......

"ارے وہ بچہ چور کہاں چلا گیا۔" حمیرا پریشانی سے بڑبڑائی۔

"اپنے دائیں طرف دیکھو......" اس غیبی مردانہ آواز نے اس سے کہا، حمیرا نے دائیں طرف دیکھا تو اسے وہ آدمی نظر آ گیا۔" جاؤ اس کے پیچھے...... سوچ کیا رہی ہو جلدی کرو۔" غیبی آواز نے اس مرتبہ حکم دیا حمیرا تیزی سے اس آدمی کے پیچھے چل پڑی حمیرا نے دیکھا وہ بچہ اب کچھ کھا رہا تھا جو شاید اس آدمی نے اسے دیا تھا۔ حمیرا اس آدمی کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ وہ آدمی اب میلے سے باہر نکل آیا تھا اور ایک طرف بنے لاتعداد خیموں کی طرف بڑھ گیا تھا وہ ایک خیمے میں چلا گیا حمیرا ہلکے ہلکے قدموں سے اس خیمے کے قریب آ گئی۔" نو بچے ہو چکے ہیں۔" خیمے کے اندر سے مردانہ آواز آئی۔

"اور دس پورے کرنے ہیں۔ اس مرتبہ خیمے کے اندر سے نسوانی آواز سنائی دی۔

"چلو...... ایک میں لے آتا ہوں۔" خیمے کے اندر سے مردانہ آواز آئی۔

"میں تو کہتی ہوں الیاس کو بلواؤ اور یہ نو بچے اس کے حوالے کرو۔ خیمے میں اب جگہ نہیں ہے باقی دسواں بچہ کل اٹھالیں گے نہیں تو اس طرح گاؤں کی پولیس چوکنی ہو جائے گی اور ہم پکڑے بھی جا سکتے ہیں۔ بچوں کے وارثوں نے اب تک گاؤں کے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی ہو گی۔ پولیس آئے گی تو ہمیں آسانی سے پکڑے گی ایک دن میں ہی ہم نے نو بچے اٹھالئے ہیں یہ نو بچے الیاس کے حوالے کرتے ہیں دسواں بچہ کل اٹھالیں گے۔" اندر موجود عورت شاید خوف زدہ تھی۔

"ٹھیک ہے میں الیاس کو بلا کر لاتا ہوں تم ان بچوں کو کہیں چھپاؤ...... تمہاری بات درست ہے پولیس چھاپہ بھی مار سکتی ہے۔ اندر سے اس شخص نے کہا جس نے میلے سے وہ بچہ اغوا کیا تھا۔

"میں انہیں کہاں چھپاؤں...... یہاں تو جگہ بھی نہیں ہے، عورت کی آواز آئی۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں کہ انہیں کہاں چھپانا ہے...... مرد نے کہا اور پھر خیمے میں خاموشی چھا گئی شاید وہ دونوں اب آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔

حمیرا نے پریشان نگاہوں سے اردگرد دیکھا پھر اس کی نظر کیچڑ پر پڑی اس نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ کیچڑ میں ڈالا اور اس خیمے پر کراس کا نشان لگا کر میلے کی طرف بڑھی اس کی نظر ایک طرف کھڑے دو کانسٹیبلوں پر پڑی وہ تیزی سے ان کی طرف بھاگی۔" حوالدار چاچا...... حوالدار چاچا......" حمیرا ان کانسٹیبلوں کے قریب جا کر بولی وہ دونوں کانسٹیبل حمیرا کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جی گڑیا پتر...... ان میں سے ایک سیانی عمر کا کانسٹیبل بولا۔

"وہ حوالدار چاچا......" حمیرا نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ایک پولیس جیپ ان کانسٹیبلوں کے پاس آ کر رکی وہ دونوں کانسٹیبل اٹینشن ہو گئے۔ جیپ میں سے ایک عمر رسیدہ انسپکٹر اترا......" چوکنے ہو جاؤ...... میلے سے بچے اغوا ہو رہے ہیں کوئی گروہ ہے جو بڑی تیزی سے بچوں کو اغوا کر رہا ہے۔ سات رپورٹیں تھانے میں درج کرائیں جا چکیں ہیں۔" انسپکٹر نے دونوں کانسٹیبلوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

"سات نہیں پولیس چاچو...... انہوں نے نو بچے اغوا کر لئے ہیں اور دس کرنے ہیں۔ یعنی ایک بچہ انہوں نے اور اغوا کرنا ہے۔" حمیرا نے بتایا تو انسپکٹر تیزی سے حمیرا کی طرف بڑھا۔

"کن لوگوں نے اغوا کئے ہیں وہ بچے بیٹی۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہ...... وہ پولیس چاچو اس طرف خیمے لگے ہوئے ہیں ناں اس طرف۔" حمیرا نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"ہمیں وہ خیمہ دکھاؤ گی بیٹی۔" انسپکٹر بدستور دھیمے لہجے میں بولا۔

"جی ہاں...... میں اسی لئے تو اس طرف آئی تھی۔" حمیرا نے معصومیت سے کہا۔

"چلو پھر......" انسپکٹر اٹھتے ہوئے بولا ساتھ ہی اس نے حمیرا کو بھی اٹھالیا انسپکٹر کی جیپ میں بھی دو کانسٹیبلو بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی جیپ سے نیچے اتر آئے تھے وہ پولیس پارٹی حمیرا کی رہنمائی میں چلنے لگی میلے میں موجود لوگ اب اس طرف متوجہ ہونے شروع ہوگئے تھے خیموں کے جھرمٹ میں پہنچنے کے بعد حمیرا متلاشی نگاہوں سے اپنا مطلوبہ خیمہ ڈھونڈھنے لگی اور پھر وہ چہکی "وہ رہا پولیس چاچو۔"

وہ پولیس پارٹی اس خیمے کی طرف بڑھی خیمے کے قریب پہنچنے پر وہی آدمی خیمے سے باہر نکلا جس نے بچہ اغوا کیا تھا پولیس پارٹی کو دیکھ کر اس کا رنگ اڑ گیا۔ "جج...... جی مائی باپ۔" وہ آدمی ہکلاتے ہوئے بولا۔

"اغوا کیے گئے بچے کہاں ہیں......" انسپکٹر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ک کک...... کون سے بچے ...... مم...... مائی باپ۔" وہ آدمی ایک مرتبہ پھر ہکلایا۔

"وہی بچے جو تم نے میلے سے اغوا کیے ہیں۔" اس مرتبہ حمیرا بولی۔

"میں نے تو کوئی بچے اغوا نہیں کیے مائی باپ...... مم...... میں تو ماڑا بندہ ہوں۔" اس آدمی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو انسپکٹر نے اسے گریبان سے پکڑا اور دھکیلتے ہوئے خیمے میں لے گیا خیمے میں ایک عورت زمین پر بیٹھی ہوئی تھی جو پولیس کو دیکھ کر یکدم اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس خیمے میں ایک بڑا ٹرنک اور دو چار پائیاں پڑیں ہوئی تھیں اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا ایک چار پائی پر بستر ے کپڑے اور رضائیاں پڑی ہوئی تھیں۔

"یہ...... یہ دیکھیں مائی باپ اگر...... اگر یہاں کوئی بچہ ہوتا تو نظر آتا۔" اس آدمی نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا۔

"بیٹی آپ نے تو کہا تھا کہ یہاں تو بچے ہیں...... لیکن یہاں تو ایک بھی نظر نہیں آرہا۔ انسپکٹر حمیرا نے پوچھا تو حمیرا پریشان نگاہوں سے ادرگرد دیکھنے لگی کانسٹیبلوں کو حمیرا پر غصہ آرہا تھا۔

پولیس چاچو...... آپ نے ایک بات غور نہیں کی۔" حمیرا نے سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔ "وہ کیا بیٹی؟" انسپکٹر نے پوچھا اس جگہ دو چار پائیاں اور اایک بڑا ٹرنک ہے۔" حمیرا کہتے ہوئے رکی انسپکٹر حمیرا کے اس ڈرامائی انداز پر حیران بھی ہوا اور مسکرایا بھی۔

"بالکل بیٹی......" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پولیس چاچو چار پائیاں انسان کے لیٹنے یا سونے کے لئے ہوتی ہیں جبکہ ٹرنک کپڑے رضائیوں اور بستروں کے لئے ہوتے ہیں لیکن انسپکٹر چاچو ٹرنک کا سارا سامان تو ان چار پائیوں پر پڑا ہے۔ تو سوچنے والی بات یہ ہے کہ اس ٹرنک میں کیا ہے۔" حمیرا نے ایک حیران کن اور ذہانت بھرا نقطہ اٹھایا انسپکٹر حمیرا کی بات کا مطلب فوری سمجھ گیا۔

"ویری گڈ بیٹی۔" انسپکٹر مسکراتے ہوئے ٹرنک کی طرف بڑھا ٹرنک پر تالا تھا۔ خیمے میں موجود اس آدمی اور عورت کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ اس تالے کی چابی کہاں ہے؟" انسپکٹر نے اس آدمی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"وہ مائی باپ اس میں صرف ہمارے کپڑے ہیں۔" وہ آدمی ہکلاتے ہوئے بولا تو ایک زوردار تھپڑ انسپکٹر نے اس کے گال پر دے مارا۔

"میں نے تم سے پوچھا کہ اس میں کیا ہے؟" انسپکٹر اس آدمی کو کالر سے پکڑتے ہوئے جھٹکے دیتے ہوئے کہا۔

"وہ میرے پاس ہے مائی باپ...... میں آپ کو دیتی ہوں۔" خیمے میں موجود عورت گھبراتے ہوئے بولی شاید وہ اس آدمی کی بیوی تھی۔ اس نے اپنے گریبان سے چابی نکال کر انسپکٹر کی طرف بڑھا دی، انسپکٹر نے تالے میں چابی گھما کر تالا کھولا اور پھر ٹرنک کا ڈھکنا اوپر کیا...... ٹرنک کے اندر ایک دل دہلا دینے والا منظر انسپکٹر کا منتظر تھا ٹرنک کے اندر کئی بچے اوپر نیچے پڑے ہوئے تھے اس آدمی نے بچوں کو ٹرنک میں ایک دوسرے کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر انسپکٹر چکرا گیا اور کانسٹیبلوں سے

کہا کہ وہ ان بچوں کو باہر نکالیں۔

انسپکٹر اس چور کی طرف بڑھا۔ ”حرام زادے اگر یہ بچے مرجاتے تو اور کمینے انسان تیرے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہے کیا۔ انسپکٹر نے بے اختیار اسے مارنا شروع کردیا۔ وہ آدمی مار کھاتے کھاتے زمین پر جا گرا تو انسپکٹر نے اسے اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

”مائی باپ رحم کریں۔“ وہ عورت انسپکٹر کے پاؤں پڑتے ہوئے بولی۔ انسپکٹر نے اسے چھوڑا اور اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تو تو ایک عورت ہے تو بھی اس کمینے کے ساتھ اس گھناؤنے کام میں شامل ہے۔“

پھر ان دونوں کو حوالات میں بند کردیا گیا اور ان بچوں کو ان کے والدین کے حوالے کردیا گیا اور حمیرا کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

☆......☆......☆

وقت پر لگا کر گزرتا رہا۔ حمیرا عمر کے بالنامہ میں تر ہوکر آگے بڑھتی رہی۔ اس کی سہیلی فرزانہ بھی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک روز حمیرا بولی۔

”فرزانہ میری بات سن چوہدری حشمت کا بندہ الیاس ہے نا۔“

”اسے کیا ہوا؟“

”چوہدری حشمت علی نے اس تھانیدار کا تبادلہ کرا تو دیا تھا، مگر الیاس آج بھی آزاد گھوم رہا ہے۔“

”حمیرا یہ جھوٹوں کی دنیا ہے یہاں سچ کو دبایا جاتا ہے۔“ فرزانہ نے دکھی لہجے میں کہا۔

”فرزانہ سچ دب تو سکتا ہے پر مٹ نہیں سکتا۔ اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں...... جیت آخر کار سچ کی ہی ہوتی ہے۔“ حمیرا نے کہا۔

”اس دنیا میں تو ایسا نہیں ہوتا۔“ فرزانہ نے نفی میں سر ہلایا۔

”فرزانہ ہوتا ہے ایسا بالکل ہوتا ہے اور اسی دنیا میں ہوتا ہے نیکی اور بدی اس دنیا کا حصہ ہیں۔ جس دن اس دنیا پر بدی راج کرے گی ناں۔ اس دن اس دنیا کا نام و نشان ختم ہوجائے گا۔ کیونکہ یہ دنیا نیکی کی وجہ سے...... نیک لوگوں کی وجہ سے آباد ہے۔“ حمیرا نے کہا۔

”اچھا میں جو پوچھ رہی ہوں وہ بتا۔“ فرزانہ نے بات کا موضوع بدلنا چاہا۔ ”میں پوچھ رہی تھی کہ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ چوہدری حشمت کا بندہ تجھے اٹھا کر لے جارہا تھا۔“ فرزانہ نے حمیرا کو اصل موضوع یاد دلایا۔

”بس تمہارے متعلق مجھے خواب آیا تھا کہ تم تکلیف میں ہو نیند سے اٹھنے کے بعد میں کافی گھبرا گئی تھی، میں تمہیں دیکھنے کے لئے آئی تو میں نے دیکھا تمہیں کوئی کندھے پر لادے لے جارہا ہے۔“ حمیرا نے جھوٹ موٹ کی کہانی سنائی۔

”اچھا......“ فرزانہ نے حیرانگی سے لفظ اچھا۔ کو عبا کیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”چلو تمہارا خواب میرے کام آ گیا۔“

”ہاں بالکل......“ حمیرا نے اثبات میں سر ہلایا وہ دونوں اپنے اپنے گھڑے بغل میں دبا کر کھیتوں میں بنی پگڈنڈی پر چلنے لگیں۔ حمیرا اپنے گھر پہنچی گھڑا رکھنے کے بعد حمیرا ہانڈی روٹی میں لگ گئی۔ کھانا پکانے کے بعد اس نے ماں باپ کو کھانا دیا اور خود کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے اپنی کھڑکی کا دروازہ کھولا تو خوشگوار ہوا اس نے اس کا استقبال کیا۔

گاؤں کی فضا رات کے وقت خوش گوار ہوجاتی ہے اور ماحول ویران...... وہ آسمان پر چمکتے خوب صورت چاند کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ”کیا دیکھ رہی ہو؟“ اسی غیبی مردانہ آواز نے اس سے پوچھا۔

”چاند کی طرف دیکھ رہی ہوں۔“ حمیرا نے بتایا۔

”یہ تو روز نکلتا ہے آج کیوں دیکھ رہی ہو؟“ غیبی آواز نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھنڈی ہوا کے لئے کھڑکی کھولی تو چاند پر نظر پڑ گئی۔“ حمیرا نے بتایا۔

”یہ تو چاند کی عید ہوگئی۔“ مسکراتی ہوئی آواز میں کہا گیا تو حمیرا بھی بے اختیار مسکرادی۔

”چاند کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔“

"کیا......؟" غیبی آواز نے پوچھا۔

"یہی کہ ساری انسانیت اجالے کا راستہ چھوڑ کر اندھیرے کی تاریک گلیوں میں بھٹک رہی ہے۔ حالانکہ اندھیرا ہمیشہ برائی کو جنم دیتا ہے اور روشنی...... روشنی ہمیں اپنی اصل منزل کا راستہ دکھا رہی ہے۔" حمیرا اداس لہجے میں بولی۔

"ہر ایک کی سوچ تمہاری جیسی نہیں ہو سکتی۔" غیبی آواز نے کہا۔

"کاش! ہوتی۔" حمیرا نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"خواب دیکھنے چاہئے...... لیکن ان کی تعبیر نہیں۔" غیبی آواز نے بظاہر حمیرا کو سمجھایا۔

"کبھی کبھی خواب بھی سچ ہو جاتے ہیں۔" حمیرا زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

"کبھی...... کبھی...... ہر خواب نہیں۔" خیر اس موضوع کو پھر کبھی چھیڑنا ابھی تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔" غیبی آواز نے کہا۔

"کیوں......؟ کیا میں مرنے والی ہوں؟" حمیرا یکدم گھبراتے ہوئے بولی تو حمیرا کو اپنے کانوں میں ایک زوردار قہقہے کی آواز سنائی دی۔ تو حمیرا کو اپنے کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ "آہستہ...... کان کے پردے پھاڑو گے کیا؟" حمیرا دونوں کانوں میں انگلیاں گھماتے ہوئے بولی۔

"میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا...... تمہارے پاس وقت اس لئے کم ہے کہ آج کی رات تمہیں دو اہم کام کرنے ہیں۔" غیبی آواز نے اسے بتایا۔

"دو اہم کام۔" حمیرا حیران ہوئی۔ "کون سے دو اہم کام؟"

"وہ میں تمہیں بتاتا ہوں فی الحال تم جلدی سے گھر سے باہر نکلو اپنے والد کو بھی ساتھ لو...... تمہیں زیادہ لوگوں کی ضرورت پڑے گی......" غیبی آواز نے کہا۔

"زیادہ لوگوں کی؟" حمیرا ایک مرتبہ پھر حیران ہوئی۔ "تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو؟"

"اگر تفصیل میں پڑ گیا تو بہت برا ہوگا...... تم جلدی کرو۔" غیبی آواز نے کہا۔

☆......☆......☆

اس کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ "تم نے وہ دوائی اسے پلا دی ناں۔" کمرے میں ایک مردانہ سرگوشی سنائی دی۔

"ہاں...... پلا تو دی تھی۔" اس بار ایک زنانہ سرگوشی ہوئی۔

"پلا تو دی تھی...... کیا مطلب؟" مردانہ سرگوشی میں اس مرتبہ حیرت شامل تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ اب اسے دیکھنا تو پڑے گا ناں کہ وہ بے ہوش ہوئی بھی ہے کہ نہیں۔" زنانہ سرگوشی نے وجہ بتائی۔

"ہم دونوں اتنی دیر سے ایک ہی چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں اگر وہ ہوش میں ہوتی تو ہمیں معلوم ہو ہی جاتا تھا۔" مردانہ سرگوشی ہوئی۔

"پھر بھی دیکھنا تو پڑے گا ناں......؟" زنانہ سرگوشی ہوئی

"۔چلو پھر ٹھیک ہے چارپائی سے نیچے اتر کر لالٹین جلا"...... مردانہ سرگوشی ہوئی۔

"ٹھیک ہے۔" زنانہ سرگوشی میں بے زاری شامل تھی۔

"پڑے ہونے کو دل تو نہیں کرتا...... خیر ہونا تو پڑے گا۔" مردانہ سرگوشی میں ہنسی شامل تھی۔ پھر کمرے میں چارپائی سے اٹھنے کی آواز پھر چلنے کی آواز اور پھر اس لڑکی نے کمرے میں پڑی لالٹین روشن کی کمرے میں اس لڑکی کے علاوہ ایک اور لڑکی چارپائی پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھی۔ جبکہ دوسری چارپائی پر ایک مرد لیٹا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے چارپائی پر لیٹی ہوئی لڑکی کو ہلایا جلایا لیکن چارپائی پر لیٹی لڑکی نے کسی قسم کی بھی حرکت نہیں کی تو وہ واقعی بے ہوش ہو چکی تھی، وہ مرد بھی چارپائی سے نیچے اترا اور دوسری چارپائی کے قریب آیا۔

"بے ہوش تو ہو گئی ہے یہ۔" اس آدمی نے

اطمینان کرنے کے بعد کہا اور پھر لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”بڑی ظالم ہے تو۔“

”ظالم...... ظالم...... میں ہوں۔“ اس لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ آدمی بھی ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

پھر اس نے دیوار کے پاس پڑی کدال اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس گھر کا سارا فرش مٹی کا تھا اس آدمی نے زمین کھودنا شروع کردی کافی دیر وہ زمین کھودتا رہا لڑکی اس کے پاس کھڑی اسے زمین کھودتا ہوا دیکھ رہی تھی رات کا وقت تھا لیکن چاند سے سارا علاقہ روشن ہو رہا تھا۔

زمین کھودنے کی آواز سے ماحول میں عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ آدمی اب رکا اور پھر ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کرنے لگا۔ اب وہ اتنا بڑا گڑھا کھود چکا تھا کہ جس میں ایک آدمی با آسانی دفنایا جاسکتا تھا وہ دونوں اب اندر آئے۔ ”باورچی خانے سے ایک چھری لے کر آؤ۔“ اس آدمی نے لڑکی سے کہا اور لڑکی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ آدمی نے چارپائی پر بے ہوش پڑی لڑکی کو اٹھایا اور کندھے پر لاد کر کمرے سے باہر نکل کر اس بے ہوش لڑکی کو اس کھودے گئے گڑھے میں ڈال دیا، لڑکی باورچی خانے سے چھری لے آئی تھی آدمی نے وہ چھری پکڑی اور گڑھے میں بے ہوش پڑی لڑکی کی گردن پر پھیرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر زوردار انداز میں دستک ہوئی وہ دونوں گھبرا گئے۔ ”کک...... کک...... کون ہوسکتا ہے؟“ آدمی نے گھبراتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھا۔

اسی وقت تین چار کانسٹیبل دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے۔ ”خبردار تم دونوں میں سے اگر کسی نے کسی بھی قسم کی حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیں گے۔“ ہیڈ کانسٹیبل نے باآواز بلند کہا۔

”اس آدمی اور لڑکی نے اپنے اپنے ہاتھ بلند کرلئے ایک کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازہ کھول دیا، ایک انسپکٹر اور گاؤں کے چند معزز آدمی اندر داخل ہوئے جن میں حمیرا اور اس کے ابو بھی شامل تھے۔

انسپکٹر اور گاؤں کے لوگ اندر کا ماحول دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ”یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟“ انسپکٹر نے حیرت کے باعث گڑھے میں پڑی بے ہوش لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں بتاتی ہوں انسپکٹر صاحب۔“ ہجوم کا سینہ چیرتے ہوئے حمیرا آگے آتے ہوئے بولی۔ ”انسپکٹر صاحب یہ آدمی نواز ہے گڑھے میں پڑی یہ لڑکی نواز کی بیوی عقیلہ ہے اور یہ لڑکی نواز کی سالی اور عقیلہ کی بہن نسرین ہے۔“ حمیرا نے حیرت انگیز انکشاف کیا۔

”یہ...... یہ کیا چکر ہے؟“ کئی الجھن آمیز آوازیں ابھریں۔

”نواز کی بیوی عقیلہ کی گود پچھلے چار سال سے خالی ہے ایک سال تک تو یہ اپنی بیوی سے محبت کرتا رہا لیکن جب اسے آنگن میں پھول کھلتا ہوا نظر نہ آیا تو اس نے عقیلہ کی بہن نسرین پر ڈورے ڈالنے شروع کردیئے۔ نسرین بھی نواز سے محبت کرتی تھی ایک دن نسرین نے نواز سے کہا اسی طرح اگر ہم ملتے رہے تو ایک دن پکڑیں جائیں گے۔“

”تو پھر تم ہی بتاؤ کیا کروں؟ میں تو خود چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اس گھر کی مالکہ تم بن جاؤ۔ پھر تیری اس بانجھ بہن کا میں کیا کروں۔“ نواز نے بظاہر نسرین سے مشورہ مانگا۔

”تو تم اسے طلاق دے دو۔“ نسرین نے پتھر دلی سے کہا۔

”کام مزید مشکل ہوجائے گا نسرین۔“ نواز نے کہا۔

”مشکل کیسے ہوگا؟“ نسرین نے بظاہر پوچھا۔

”وہ اس طرح کہ اگر میں نے تیری باجی کو طلاق دے دی تو تیرے گھر والے مجھ سے ناطہ توڑ دیں گے۔ پھر ہم دونوں کا بیاہ کیسے ہوگا؟“ نواز نے سوالیہ نگاہ سے نسرین کی طرف دیکھا۔

”تو پھر کیا کریں؟“ نسرین نے پریشان نگاہوں سے نواز کی طرف دیکھا۔ ”ایک مشورہ ہے...... اگر تم ساتھ دو تو۔“ نواز نے نسرین کی آنکھوں میں جھانکتے

ہوئے کہا۔

''کیا کرنا ہوگا مجھے۔''

نسرین نے پوچھا...... تمہیں تو کچھ نہیں کرنا پڑے گا کروں گا سب کچھ میں...... تمہیں بس راضی، راضی میری بات ماننا پڑے گی۔'' نواز نے کہا۔

''کچھ بتاؤ بھی تو سہی۔'' نسرین اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہاری بہن کو راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔'' نواز نے بدستور نسرین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' نسرین الجھن آمیز لہجے میں بولی۔

''تمہاری بہن کو قتل کردیتے ہیں۔'' نواز نے سفاک لہجے میں بولا۔

''لیکن تم کروگے کیا۔'' نسرین نے پوچھا۔

''میں عقیلہ کو ایسی موت ماروں گا کہ وہ موت قدرتی یا حادثاتی لگے۔'' نواز نے کہا۔

''پھر انسپکٹر صاحب نواز نے ایک دن مٹی کے تیل کے چولہے کی بتیاں نکال لیں تاکہ جب عقیلہ کھانا پکانے کے لئے چولہا جلائے تو عقیلہ جل جائے۔ لیکن تھانیدار صاحب جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ عقیلہ بچ گئی لیکن آج اس نے اور نسرین نے یہ منصوبہ بنایا کہ عقیلہ کو قتل کرنے کے بعد گھر میں ہی دفنا دیں گے اور لوگوں اور اپنے سسرال والوں کو یہ کہیں گے کہ عقیلہ گھر سے بھاگ گئی ہے اور جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو یہ اپنے سسرال والوں سے نسرین کے بارے میں بات کرے گا لیکن تھانیدار صاحب جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔''

یہاں تک کہہ کر حمیرا خاموش ہوگئی۔

اور سب حیرت سے کبھی حمیرا اور کبھی ان دونوں نسرین نواز کا منہ تک رہے تھے نواز اور نسرین کے چہرے لٹک گئے تھے۔

''پپ...... پپ...... پر تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا۔'' انسپکٹر نے حیرانگی سے حمیرا سے پوچھا۔

''انسپکٹر صاحب یہ سب کچھ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گی...... پہلے ہمیں ابھی کچھ اور مجرموں کو پکڑنا ہے آپ سب لوگ اب میرے ساتھ چلئے۔''

☆......☆......☆

''رات کے اندھیرے میں ایک گھوڑا بڑی تیزی سے بھاگ رہا تھا گھوڑے پر دو افراد سوار تھے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ''دیکھو ولید تمہارے کہنے پر میں اپنے اماں ابا کو چھوڑ تو آئی ہوں۔ پر تم نے رہنے کے لئے کوئی ٹھکانہ بھی ڈھونڈا ہے کہ نہیں۔'' گھوڑے پر بیٹھی لڑکی نے لڑکے سے پوچھا۔

''وقتی طور پر تو میرے دوست کا ایک مکان ہے فرزانہ۔'' ہم وہاں رہیں گے اور جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو دوبارہ گاؤں کا رخ کریں گے۔'' ولید نے کہا۔

''ولید میں تو چاہتی تھی کہ تمہارا اور میرا بیاہ ابا اور ماں کی رضامندی سے ہوتا پر قدرت کو شاید یہی منظور تھا...... میں نے ابھی بھی انتظار کرلینا تھا پر میں اس کمینے چوہدری حشمت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بھاگی ہوں۔'' فرزانہ کے لہجے میں غصہ تھا۔

ولید نے یکدم گھوڑے کی لگام میں کھینچیں اور گھوڑا ہنہناتا ہوا رک گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو تم؟'' ولید نے حیرانگی سے کہا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں ولید...... اس نے مجھے اٹھوانے کی بھی کوشش کی تھی۔'' فرزانہ کی اس بات پر ولید کی حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

''تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔'' اس مرتبہ ولید کے لہجے میں غصہ شامل تھا۔

''کیا بتاتی...... ؟ تمہارا دماغ تو ہر وقت ہی گرم رہتا ہے۔ وہ بہت اوپر والے لوگ ہیں ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں بنتا۔'' فرزانہ نے کہا۔

پھر ولید نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑے نے دوبارہ بھاگنا شروع کردیا ولید نے گھوڑے کو لہلہاتے کھیتوں میں اتار دیا تھا کھیتوں کے اختتام پر اینٹوں کا بنا ایک پکا مکان تھا، مکان کے دروازے کے باہر دو ہٹے کٹے آدمی ہاتھوں میں لاٹھیاں پکڑے چوکس کھڑے ہوئے

تھے۔

"یہ...... یہ...... آدمی یہاں کیا کررہے ہیں؟" فرزانہ نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا ساتھ ہی وہ گھوڑے سے نیچے اتر آئی۔

"لگتا ہے حاشو نے ہماری نگرانی کے لئے ان دو بندوں کو بھیجا ہے۔" ولید نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"لل...... لل...... لیکن مجھے تو ان آدمیوں کی نیت بالکل بھی ٹھیک نہیں لگتی۔" فرزانہ نے اپنی طرف ہوس بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے ان آدمیوں کو پریشان کن نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں تم گھبراؤ مت...... یہ بندے حاشو نے ہماری نگرانی کے لئے بھیجے ہیں۔" ولید نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ان دونوں آدمیوں نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور ولید اور فرزانہ کے لئے دروازہ کھول دیا وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو ایک چھوٹے سے صحن کے اختتام پر ایک کمرہ تھا اور اس کمرے کے باہر بھی دو آدمی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بھی ان دونوں کے لئے دروازہ کھولا وہ دونوں اس کمرے میں داخل ہوئے تو دھک سے رہ گئے سامنے ایک خوب صورت پلنگ پر چوہدری حشمت تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔

"تت...... تم......؟ ولید غصے سے چلایا فرزانہ کا دل بھی دھک کرنے میں رفتار پکڑ چکا تھا۔

"ہاں ہم...... ہم تمہارا ہی انتظار کررہے تھے۔" چوہدری حشمت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تیرا خون پی جاؤں گا چوہدری۔" ولید آپے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

"ولید...... مم...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ چلو یہاں سے۔" فرزانہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"رکو فرزانہ...... اس نے تجھے اغوا کروانے کی کوشش کی تھی ناں...... کیوں چوہدری؟" ولید نے پہلے فرزانہ اور پھر چوہدری حشمت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل......" چوہدری حشمت نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"سرکار آپ نے زحمت کیوں کی...... میں جو فرزانہ کو خود لے آیا ہوں!" ولید کا لہجہ یکدم مودبانہ ہوگیا فرزانہ نے حیرت سے ولید کی طرف دیکھا۔

"ول...... ولید۔" حیرت کے باعث فرزانہ کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

"یہی تو میرا وہ دوست ہے فرزانہ جس کے کہنے پر میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔ انہی کا نام ہے چوہدری حشمت عرف حاشو......" ولید نے ایک اور انکشاف کیا۔

"کک...... کیا!" فرزانہ جیسے چلائی۔

"اور یہ کیا ولید اسے اغوا میں نے کب کروایا تھا اور اغوا بھی تو تو ہی اسے کرنے گیا تھا۔" جب اس کی سہیلی حمیرا وہاں آ گئی اس دفعہ چوہدری حشمت نے نیا انکشاف کیا۔

"بس جی چوہدری صاحب آپ کے حکم کے غلام ہیں۔" ولید نے چوہدری حشمت کے سامنے ہاتھ جوڑ کر مسکرا کر کہا۔

"ذلیل، کمینے، دغا باز میں تیرا خون پی جاؤں گی۔" حیرت میں ڈوبی فرزانہ نے اچانک آگے بڑھ کر ولید کے چہرے پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کردی ولید نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔

"دیکھ فرزانہ اگر آج کی رات تو نے مجھے خوش کردیا نہ تو میں تیری زندگی بنادوں گا۔" چوہدری حشمت نے اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب آپ کو اللہ کا واسطہ۔" فرزانہ نے روتے ہوئے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا وہ اس وقت کو کوس رہی تھی۔ جب وہ ولید کے ساتھ بھاگی تھی۔ ولید شرافت کا لباس اوڑھے ایک بھیڑیا تھا فرزانہ فریادی نگاہوں سے اوپر کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں اللہ سے التجا تھی۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ زوردار انداز میں کھلا اور لوگوں کا ایک ہجوم سا کمرے میں داخل ہوا چوہدری حشمت نے بانہوں کی گرفت میں پھنسی فرزانہ کو یکدم

چھوڑا اور حیرت سے سب کا منہ تکنے لگا۔

"چ.....چ..... چوہدری صاحب..... آپ ..... "گاؤں کا انسپکٹر ہکلا کر بولا۔

"وہ..... وہ ..... تھانیدار صاحب.....ول .....ولید اس کی عزت لوٹنا چاہتا تھا.....م.....م..... میں نے تو....." چوہدری حشمت ہکلاتے ہوئے بولا لیکن فرزانہ اسے بیچ میں ٹوک دیا۔

"جھوٹ بولتا ہے یہ..... یہ میری عزت لوٹنے کی کوشش کررہا تھا تھانیدار صاحب ولید کمینہ تو اس کے کہنے پر مجھے یہاں لایا تھا۔" فرزانہ نے چوہدری حشمت کو بیچ میں ٹوکتے ہوئے رو کر چلاتے ہوئے کہا۔

"جھو..... ٹ..... بب..... بولتی ہے یہ۔" چوہدری حشمت ہکلاتے ہوئے بولا۔

"جھوٹ تو تو بول رہا ہے کمینے..... تو نے اور تیرے باپ نے پنڈ والوں کی آنکھوں پر شرافت کی جو کالی پٹی باندھ رکھی ہے آج میں گاؤں والوں کے سامنے وہ اتار کر رہوں گی۔" فرزانہ چیختے ہوئے بولی۔

وہ عجیب سا منظر تھا سب حیرت سے کبھی فرزانہ اور کبھی چوہدری حشمت کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"انسپکٹر صاحب یہ سارا کیا دھرا اس چوہدری حشمت کا ہے جس نے ولید کے ذریعے فرزانہ کو یہاں بلوایا اور اس کی عزت تار تار کرنے کی کوشش کی سارے گاؤں والوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا ہے آپ چوہدری حشمت اور ولید کو گرفتار کریں۔" حمیرا نے کہا تو انسپکٹر پریشان نگاہوں سے چوہدری حشمت کی طرف دیکھنے لگا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری صاحب مجھے معاف کردیں ..... سارے گاؤں والوں کے سامنے میں مجبور ہوگیا تھا..... کرسی پر بیٹھے چوہدری حشمت کے پیروں میں بیٹھا انسپکٹر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ چوہدری حشمت حقے کی نال منہ سے لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ "تھانیدار کے بچے تو نے میرے ڈیرے پر آنے کی جرأت کیسے کی۔" چوہدری حشمت بھڑکتے ہوئے بولا۔

"چوہدری صاحب مجھے بالکل بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ آپ کا ڈیرہ ہے وہ تو میں پہلی مرتبہ اس ڈیرے پر گیا تھا۔ میرے پاس تو گاؤں کے چند سیانے لوگ اور پرویز کمہاری کی بیٹی حمیرا آئی اور کہا کہ واردات ہونے والی ہے آپ ہمارے ساتھ چلیں اتنے لوگ تھے چوہدری صاحب کہ مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔

اور جب میں آپ کے ڈیرے پر پہنچا تو آپ کی بانہوں میں فرزانہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا" انسپکٹر نے تفصیلاً ساری بات بتائی۔

"چوہدری جی وہ تو لڑکپن سے بڑی تیز ہے۔ آپ کو یاد ہوگا۔ شوکت اور الیاس کو بھی اسی نے پکڑوایا تھا" ایک طرف بیٹھا چوہدری کا چمچہ مہر بولا۔

"اسے تو میں دیکھ لوں گا۔" چوہدری حشمت نے حقے کی نال کو منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تھانیدار تو ایسا کر یہ سارا کیس نواز یا ولید پر ڈال دے دونوں ہمارے کارندے ہیں مان جائیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے چوہدری صاحب..... پر....." تھانیدار بول ہی رہا تھا کہ چوہدری حشمت نے اسے غصے سے ٹوکا..... "اور پر کیا" تھانیدار تیری یہ زبان کچھ زیادہ ہی میرے سامنے چلنے لگی ہے۔ شاید تو بھول گیا ہے کہ یہ وردی بھی ہماری ہی دی ہوئی ہے۔ تجھے اور تو یہ کیسے بھول گیا کہ ذات کا تو تو نائی ہے ناں۔" چوہدری حشمت نے انسپکٹر کو جھڑکتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب میری کیا مجال کہ آپ سے گستاخی کرسکوں۔" انسپکٹر نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"پر چوہدری صاحب میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدھا گاؤں اس بات کا گواہ ہے کہ آپ فرزانہ کے ساتھ زبردستی کررہے تھے اور کسی طرح۔"

"اس کی فکر تو نہ کر تھانیدار۔" چوہدری حشمت نے ہاتھ فضاء میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ "انہیں میں دیکھ لوں گا مہر تو سمجھ گیا ہوگا کہ تجھے کیا کرنا ہے۔"

"جی چوہدری صاحب۔ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں

۔“ مہر نے کہا۔

☆......☆......☆

کبھی کبھی وقت کے ہیر پھیر کی سمجھ نہیں آتی پورے گاؤں کے دیکھنے کے باوجود چوہدری حشمت عدالت سے باعزت بری ہوگیا۔ کسی نے بھی چوہدری حشمت کے خلاف عدالت میں گواہی نہ دی۔ انسپکٹر نے گواہوں میں حمیرا اور اس کے والد کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ حمیرا کے لئے اس سے بھی حیران کن لمحہ وہ وقت ثابت ہوا جب فرزانہ نے وٹنس باکس میں کھڑے ہوکر یہ گواہی دی کہ چوہدری حشمت نے اس کے ساتھ کسی بھی طرح کی زبردستی نہیں کی بلکہ چوہدری صاحب نے تو مجھے ولید کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچایا تھا۔

چوہدری حشمت نے حمیرا کی طرف دیکھتے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دیا اور جج نے چوہدری حشمت کو باعزت بری کردیا۔ عدالت سے باہر نکلنے پر حمیرا فرزانہ کی طرف بڑھی تو چوہدری حشمت کے آدمیوں نے تیزی سے اسے پیچھے کردیا اور تیزی سے فرزانہ کو چوہدری حشمت کی گاڑی میں بٹھادیا۔ چوہدری حشمت اور مہر حمیرا کے قریب رکے۔ ”مہر۔“ چوہدری حشمت نے مہر کو آواز دی۔

”جی چوہدری صاحب ......“ مہر مودبانہ لہجے میں بولا۔

”کمینوں کو بھی پر لگ گئے ہیں۔“

”جی چوہدری صاحب آپ نے کہاوت تو سنی ہوگی...... کبھی کبھی ٹڈیوں کو بھی زکام ہوجاتا ہے۔“ مہر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میری طاقت تو تو نے دیکھ لی حمیرا تیری سہیلی نے ہی مجھے باعزت بری کروایا ہے حالانکہ سارا گاؤں اس بات کا گواہ ہے کہ میں نے تیری سہیلی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ آج تیری وہی سہیلی میرے بستر پر ہوگی۔“

حمیرا کچھ نہ بولی چوہدری حشمت نے آنکھوں پر بلیک چشمہ لگائے اور اپنی پجارو کی طرف بڑھ گیا جس میں فرزانہ پہلے سے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے حمیرا اور اس کے والدین کو اٹھنے پر مجبور کردیا وہ اٹھ کر بیٹھے۔

”اس وقت کون ہوسکتا ہے ......“ حمیرا کا ابا پریشانی سے بڑبڑایا دروازہ پھر دھڑ دھڑایا گیا تو وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

”حمیرا باہر بہت بڑا خطرہ ہے۔“ وہی مانوس مردانہ غیبی آواز حمیرا کے کانوں میں پڑی اتنی دیر میں اس کا ابا بیرونی دروازہ کھول چکا تھا دروازہ کھلتے ہی انسپکٹر اور اس کے ساتھ دو کانسٹیبل اندر داخل ہوئے۔ ”تھانیدار صاحب خیریت تو ہے۔“ حمیرا کا ابا گھبراتے ہوئے بولا۔

”خیریت ہی تو نہیں ہے پرویز۔“ انسپکٹر نے پرویز کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”کک...... کک ...... کوئی غلطی ہوگئی مائی باپ۔“ پرویز نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

”فرزانہ کا قتل ہوچکا ہے۔“ انسپکٹر نے ان پر بم پھینکا۔

”او میرے اللہ ......“ پرویز ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اس تفتیش کے سلسلے میں تجھے اور تیری چالاک بیٹی کو تھانے چلنا ہوگا۔“

”اگر تم دونوں بے گناہ ہوئے تو چھوڑ دیئے جاؤ گے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”میری بات غور سے سنو...... کسی طرح سے اس تھانیدار کے ہولسٹر سے پستول نکال لو اور اسے ختم کردو اور چلانا مت۔“ غیبی آواز نے سخت لہجے میں اسے تاکید کی ...... تم یہی کہنا چاہتے ہو نہ کہ میں انہیں ختم کروں؟“

حمیرا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ضروری ہے...... کیونکہ یہ تھانیدار تمہیں تھانے نہیں بلکہ چوہدری حشمت کے ڈیرے پر لے جانے کے لئے آیا ہے۔“ غیبی آواز نے ایک اور انکشاف کیا ...... اور چلانا مت۔“

حمیرا نے اپنا منہ بند کرلیا میری باتیں غور سے سنو

یہ انسپکٹر چوہدری حشمت کا پالتو کتا ہے تمہاری سہیلی کا قتل بھی چوہدری حشمت نے کیا ہے اور اسے بے آبرو بھی کیا ہے عدالت میں جھوٹی گواہی بھی فرزانہ نے چوہدری حشمت کے رعب و دبدبے میں آ کر دی تھی کیونکہ چوہدری حشمت نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر تو نے عدالت میں جھوٹی گواہی نہ دی تو اس کے ماں باپ کو قتل کروائے گا باقی گواہوں میں سے بھی آدھے گواہوں کو خریدا اور آدھوں کے لئے دھمکی کام کر گئی۔

کبھی کبھی حمیرا انسان اپنی جان دینے سے نہیں ڈرتا لیکن اس سے جڑتے ہوئے لوگ اسے کمزور بنا دیتے ہیں ...... یہی کچھ فرزانہ اور باقی گواہوں کے ساتھ ہوا۔ چوہدری حشمت ایک رئیس زادہ ہے وہ کبھی یہ بات گوارہ نہیں کرے گا کہ وہ ایک لڑکی کی وجہ سے پورے گاؤں میں ذلیل ہو عدالت نے تو اسے باعزت بری کر دیا لیکن تمہاری وجہ سے اس گاؤں میں جو بدنامی ہوئی ہے وہ اس کا یہ بدلنا چاہتا ہے اس نے اپنے اس پالتو کتے انسپکٹر کو رشورت کی ہڈی پھینک کر تمہارے ماں باپ کو قتل کرنے کے بعد تمہیں اس چوہدری حشمت تک پہنچانا ہے۔ اس کے پیچھے بھی چوہدری کی ایک گیم ہے رات کے اندھیرے میں وہ تمہارے ماں باپ کو ختم کرے گا اور لوگوں کو یہ بتائے کہ کچھ لوگ تمہارے ماں باپ کو مار کر تمہیں اٹھا کر لے گئے۔

پھر کچھ دنوں بعد وہ تمہیں بے عزت کر کے تمہاری لاش کھیتوں میں پھینک سکے۔ چوہدری نے اپنی حویلی کی ساری سیکورٹی ہٹوا کر ڈیرے پر لگا دی ہے کیونکہ وہ تمہارے کارناموں سے بخوبی واقف ہے اب تم اس انسپکٹر کے ہولسٹر سے پستول نکال لو اور جلدی سے اس انسپکٹر اور اس کے کانسٹیبلوں کو ختم کرنے کے بعد گھر پہنچو کیونکہ انسپکٹر نے جو کانسٹیبل تمہارے گھر کی نگرانی پر مامور کیا ہے اس نے تمہاری ماں کا قتل کرنا ہے غیبی آواز نے بتاتے ہوئے ایک اور انکشاف کیا۔

حمیرا کی آنکھوں میں آنسو تھے اسی وقت جیپ رکی۔

''یہ آنسو بعد میں بہانا ...... جلدی کرو۔'' غیبی آواز نے سخت لہجے میں کہا تو حمیرا اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اس نے کمال پھرتی سے حیران بیٹھے انسپکٹر کے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔

''ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے کانسٹیبل کو جلدی سے گولی مارو۔''

''م...... مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔'' حمیرا نے ہکلاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''بے وقوف جلدی سے اسے ختم کرو اگر تم نہیں مارو گی تو تمہیں مار دیں گے۔'' غیبی آواز نے سخت لہجے میں کہا تو حمیرا نے کانپتے ہاتھوں سے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا......

''ٹھاہ......'' کی آواز سے ریوالور سے گولی نکلی اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے کانسٹیبل کا بھیجہ اسٹیرنگ پر جا گرا اتنی دیر میں تھانیدار کے ساتھ بیٹھا کانسٹیبل حرکت میں آ چکا تھا۔ اس نے اپنی رائفل کا رخ حمیرا کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔

پرویز ''بیٹی۔'' کہتا ہوا تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور حمیرا کے لگنے والی گولی پرویز کے سینے میں جا لگی۔

''ابا۔'' حمیرا زور سے چلائی اور اس نے دوسرا فائر کانسٹیبل کے سینے پر کیا انسپکٹر نے موقع غنیمت جانا وہ تیزی سے اٹھا اور حمیرا کو دھکا دیتے ہوئے جیپ سے باہر چھلانگ لگا کر ایک طرف بھاگنے لگا۔

حمیرا اپنے باپ کی موت پر آنسو بہانے لگی۔ ''حمیرا انسپکٹر کو گولی مارو...... وہ تھانے جا کر اور پولیس والوں کو لے آئے گا۔'' غیبی آواز نے چلاتے ہوئے کہا تو حمیرا نے تیزی سے ریوالور کا رخ بھاگتے ہوئے انسپکٹر کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا بھاگتے ہوئے انسپکٹر کی رفتار اچانک کم ہوئی اور پھر وہ لہرا کر زمین پر گرا حمیرا کی گولی نے اپنا کام کر دیا تھا اب حمیرا اپنے باپ کی لاش پر آنسو بہانے لگی تھی روتے روتے وہ یکدم اٹھ کر کھڑی ہوئی۔

''کیا ہوا؟'' غیبی آواز نے غمگین لہجے میں پوچھا۔

''اب اماں کو بچانے جا رہی ہوں۔'' حمیرا نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں حمیرا۔" غیبی آواز نے کے لہجے میں اس مرتبہ دکھ کا عنصر شامل تھا۔

"کیا مطلب؟" حمیرا نے پوچھا۔

"اس کانسٹیبل نے اپنا کام کر دکھایا ہے اس نے تمہاری ماں کو قتل کر ڈالا ہے غیبی آواز نے بتایا۔

"نن...... نہیں" حمیرا زور سے چلائی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

داناؤں کا قول ہے کہ برا وقت یا غم کبھی دستک دے کر نہیں آتے ایسا ہی کچھ حمیرا کے ساتھ ہوا تھا پل بھر میں اس کی ساری دنیا اجڑ گئی تھی ماں اور باپ دونوں کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا تھا اور اس کا قصوروار چوہدری حشمت تھا حمیرا کے سینے میں چوہدری حشمت کا نام کسی نوکیلے تیر کی طرح چبھ رہا تھا اسے تو غیبی آواز نے بچالیا تھا غیبی آواز نے زندگی کے کئی مشکل موڑوں پر اس کی مدد کی تھی اور آج بھی اگر وہ زندہ تھی تو اسی غیبی آواز کی وجہ سے۔

حمیرا کے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا وہ جلد سے جلد چوہدری حشمت کو اس کے انجام تک پہنچانا چاہتی تھی وہ اپنے باپ کو دفنانے کے بعد جب گھر پہنچی تو اس کی ماں کا قاتل طفیل کانسٹیبل وہیں موجود تھا اپنی ماں کی لہو بہتی لاش دیکھ کر وہ طیش میں آ گئی اور ریوالور میں بچی باقی ساری کی ساری گولیاں طفیل کانسٹیبل کے سینے میں اتار دیں وہ اپنی ماں کی لاش پر کافی دیر تک آنسو بہاتی رہی۔

"حمیرا اگر تم اپنے ماں باپ کے خون کا بدلہ لینا چاہتی ہو تو یہ اچھا موقع ہے اور چوہدری اس وقت اپنی حویلی میں گہری نیند سو رہا ہے اور حویلی پر زیادہ پہرہ بھی نہیں ہے اس نے تمام بندے ڈیرے پر بھیجے ہوئے ہیں۔" غیبی آواز نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا "ساتھ میں اس کانسٹیبل کی رائفل لے لینا۔"

حویلی کا دروازہ اتفاق سے بند نہیں تھا وہ حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھی حویلی مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی ایک کمرے میں چوہدری رحمت سو رہا تھا ایک کمرے کا دروازہ اندر سے لاک تھا حمیرا نے رائفل کا دستہ زور سے دروازے پر مارا تو دروازہ اندر کی طرف کھل گیا۔ حمیرا تیزی سے اندر داخل ہوئی اس نے دیکھا دروازہ کھلنے کی آواز سے اندر سوئے افراد جاگ چکے تھے حمیرا نے دیکھا چوہدری حشمت کے ساتھ ایک آٹھ نو سال کا بچہ اور ایک نوجوان لڑکی عورت لیٹی ہوئی تھی جو یقیناً چوہدری کا بیٹا اور بیوی تھے۔

"تت...... تم...... یہاں کیسے پہنچی؟" چوہدری حشمت آگ بگولہ ہو کر بولا۔

"موت کسی نہ کسی طرح اپنا راستہ بنا لیتی ہے چوہدری۔" حمیرا نے انگارہ نکلتی آنکھوں سے رائفل کا رخ چوہدری حشمت کی طرف کرتے ہوئے کہا اور وہ آٹھ نو سالہ بچے چوہدری حشمت سے چمٹتے ہوئے بولا۔ "ابو......"

"ک...... ک ک...... کون ہو تم، اور تم نے میرے شوہر پر رائفل کیوں تان رکھا ہے" چوہدری حشمت کی بیوی نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"یہ...... اسی لائق ہے چودھرائن یہ انسان کی کھال میں چھپا ایک خونی بھیڑیا ہے۔" حمیرا بدستور آگ اگلتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"چوہدری جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا اللہ ہوتا ہے۔ تیرے بھیجے ہوئے خون خوار کتے انسپکٹر اور اس کے ساتھیوں کو تو میں نے جہنم رسید کر دیا ہے اب تیری باری ہے۔" حمیرا نے بظاہر اسے آگاہ کیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔" چوہدری حشمت کی بیوی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں چودھرائن اس کمینے اور ذلیل انسان نے میری ہنستی بستی دنیا اجاڑ دی پہلے تو میری سہیلی کی عزت لوٹی اور پھر اسے مار ڈالا میری بھی عزت کے ساتھ یہ کھیلنا چاہتا تھا میں بچ گئی پھر اس کے بھیجے ہوئے کتوں نے میرے ماں باپ کو مار ڈالا۔" حمیرا نے غمگین لہجے میں چودھرائن کو اپنی روداد سنائی۔

چوہدری حشمت کی بیوی یقین نہ آنے والی نگاہوں سے چوہدری حشمت کی طرف دیکھنے لگی چوہدری

حشمت کا چہرہ شرمندگی کی وجہ سے جھکا ہوا تھا۔
"آپ...... آپ مجھے دھوکا دے رہے تھے۔"
چوہدری کی بیوی روتے ہوئے بولی۔
حمیرا نے رائفل کا رخ چوہدری حشمت کی طرف کیا۔
"نہیں......!" اچانک روتی ہوئی چوہدری کی بیوی چوہدری حشمت کے سامنے آگئی اور چوہدری حشمت کو لگنے والی گولی چوہدری کی بیوی کے سینے میں جا لگی۔
"نہیں!" چوہدری حشمت چلایا۔
"امی۔" چوہدری کا بیٹا تیزی سے اپنی زخمی ماں کی طرف بڑھا۔
"یااللہ...... یہ کیا ہو گیا مجھ سے۔" حمیرا نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رائفل چھوڑ دی۔"
"یہ کیا ہو گیا رضیہ میرے کرموں کی سزا تو نے کیوں لی۔" چوہدری حشمت نے روتے ہوئے کہا۔
"چچ...... چو...... ہری...... صاحب...... ایسا ہی ہوتا ہے آپ نے کئی لوگوں کے گھر اجاڑے جیسا دکھ آج آپ کو ہو رہا ہے ویسا باقی لوگوں کو بھی ہوتا ہوگا۔" رضیہ اکھڑتی ہوئی سانسوں سے بولی۔
"مجھے معاف کر دو رضیہ...... میں نے ایسا ہرگز نہیں سوچا تھا۔ آج مجھے واقعی احساس ہوا کہ میں جن لوگوں کے گھر اجاڑتا تھا انہیں کتنا دکھ ہوتا ہوگا۔ وہ مجھے کتنی بددعائیں دیتے ہوں گے۔ آج ان لوگوں کی آہ مجھے لگ گئی...... میں برباد ہو گیا رضیہ...... میں برباد ہو گیا۔"
چوہدری حشمت روتے ہوئے بولا۔ رضیہ کی مردہ خالی آنکھیں چوہدری حشمت کا چہرہ تک رہی تھیں۔
حمیرا نے بھرائی ہوئی آنکھوں سے چوہدری حشمت کے بچے کو دیکھا اور پھر بوجھل بوجھل قدموں سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

اندھیرے میں ایک شعلہ سا چمکتا اور پھر وہاں دھواں جمع ہونا شروع ہو گیا اور پھر اس دھوئیں نے انسانی خدوخال اختیار کرنے شروع کر دیئے حمیرا کے سامنے ایک خوب صورت لمبا تڑنگا نوجوان کھڑا تھا۔ جس کی خوب صورتی دیکھ کر حمیرا دنگ رہ گئی "تت...... تم...... "حمیرا ہکلائی۔
"میں ایک جن زادہ ہوں حمیرا۔" اس خوب صورت نوجوان نے بتایا۔ میرا نام شاہ مردان ہے۔
"جج...... جن زادہ۔" گھبراہٹ کے باعث حمیرا کے منہ سے نکلا۔
گھبراؤ مت آج کے بعد میں بھی تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔" شاہ مردان نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب؟" حمیرا حیران ہوئی۔
"انسان ہونے کا انمول تحفہ مجھے تمہاری وجہ سے ملا ہے۔" شاہ مردان نے بتایا۔
"میری وجہ سے؟" حمیرا بدستور حیران کن لہجے میں بولی۔
"ہاں تمہاری وجہ سے۔ ہمارا جنوں کا ایک مسلم قبیلہ ہے ہمارے قبیلے کے لوگ انسان سے بہت نفرت کرتے تھے لیکن اب نہیں۔" شاہ مردان نے یہاں تک کہہ کر رکا۔
"کیوں؟" بے اختیار حمیرا کے منہ سے نکلا۔
"تمہاری وجہ سے۔" شاہ مردان ایک مرتبہ پھر مسکرایا۔
"میری وجہ سے۔"
"میں تمہیں شروع سے ساری بات بتاتا ہوں ۔باقی قبیلے والوں کی طرح میرا باپ بھی انسانوں سے شدید نفرت کرتا تھا کیونکہ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی کیونکہ ہمارے بزرگ جن جنہوں نے ہمیں قرآن وحدیث کی تعلیم دی تھی ان کا کہنا تھا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مخلوق میں سے سب سے اہم مخلوق ہے۔ اچھے اور برے لوگ ہر طرح کی مخلوق میں ہوتے ہیں، اسی طرح انسانوں میں بھی ہیں، انسان کا رتبہ اللہ تعالیٰ نے اتنا اونچا کیا ہے کہ انہیں فرشتوں تک نے سجدہ کیا ہے اور اگر انسان کا عمل اور کردار اچھا ہو تو یہ فرشتوں سے اونچا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور اگر برائی کرنے پر اتر آئیں تو ابلیس شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔
ہمارے جنوں میں بھی بہت ظالم جن بھی ہیں،

اور اچھے جن بھی، اچھائی اور برائی ہر مخلوق میں شامل ہے خیر میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں ایک مرتبہ میں چوری چھپے انسانوں کی دنیا میں پہنچا گھومتے گھومتے میں ایک گاؤں میں پہنچا وہاں میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔‘‘ اتنا کہہ کر شاہ مردان رکا۔

’’کیا دیکھا تم نے؟‘‘ حمیرا نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

’’میں نے دیکھا کہ اسکول سے چھٹی ہونے پر ایک بچی گلے میں اسکول بیگ لٹکائے گھر کی طرف جارہی تھی اچانک وہ بچی چلتے چلتے رکی وہ گھومی اس نے دیکھا درخت کے پاس ایک بلی زخمی حالت میں پڑی ہوئی تھی، وہ بچی تیزی سے بلی کی طرف بھاگی بلی کا پاؤں زخمی تھا بچی نے وہ بلی اٹھائی اور گھر لے آئی اور اس کی مرہم پٹی کی مجھے لڑکی کی یہ ادا بہت اچھی لگی...... پتہ ہے حمیرا وہ لڑکی کون تھی؟‘‘ اتنا کہہ کر شاہ مردان نے سوالیہ نگاہوں سے حمیرا کی طرف دیکھا۔

’’م......‘‘ ’’میں......‘‘ حیرت کے باعث حمیرا کے منہ سے نکلا۔

’’ہاں بالکل۔ مجھے تمہاری یہی عادت بہت اچھی لگتی تھی تم بغیر سوچے سمجھے ہر کسی کی مدد کرنے لگتی تھی، جب تم جوان ہوئی تو مجھے تمہاری انہی عادتوں کی وجہ سے مجھے تم سے محبت ہوگئی تھی اور غیبی امداد کیا کرتا تھا۔

انسان سے محبت کا تذکرہ جب میرے والد کو معلوم ہوا تو میرے والد مجھ پر برس پڑے۔

’’تو تم ہمیں دھوکا دے رہے تھے اور یہ نہیں انسانوں سے محبت بھی کر بیٹھے۔‘‘ میرے والد نے غضب ناک لہجے میں کہا میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا ’’تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ یہ انسان کسی کے نہیں ہوتے ہیں۔ یہ خود غرض ہوتے ہیں ان میں سوائے خامیوں کے کچھ نہیں ہوتا۔‘‘ میرے والد نے کہا۔

’’نہیں ابو...... انسان خوبیوں اور خامیوں دونوں کے مالک ہوتے ہیں جس طرح ہم جنات میں اچھے اور برے دونوں طرح کے جنات ہوتے ہیں اسی طرح انسانوں میں اچھے اور برے دونوں طرح کے انسان ہوتے ہیں آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کئی طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں لیکن جن کا مقام سب سے زیادہ اونچا ہے اور وہ ہیں انسان۔

’’ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہئے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تو تم انسانوں کی کچھ زیادہ ہی پاسداری کررہے ہو ہم سے زیادہ اس کائنات کو تم نے دیکھ لیا ہے ٹھیک ہے تمہاری نظر میں انسان بہت اچھے ہیں ناں...... تو ہمیں ان کا کوئی اچھا کام دکھاؤ تم جو کہو گے ہم مانیں گے۔‘‘ میرے والد نے مجھے چیلنج کیا۔

’’ٹھیک ہے ابو مجھے منظور ہے۔‘‘ میں نے اثبات میں سر ہلایا بس تو پھر اس دن سے ہمارے قبیلے کی نظریں تم پر ہیں اور پھر تم نے جنات کا دل جیت ہی لیا شاہ مردان یہاں تک کہہ کر رکا۔ ’’وہ...... وہ کیسے؟‘‘ بے اختیار حمیرا کے منہ سے نکلا۔

’’وہ ایسے کہ طاقت ہونے کے باوجود تم نے چوہدری حشمت کو زندہ چھوڑ دیا...... آج تمہاری وجہ سے وہ انسان بنا ہے، تمہاری وجہ سے ہی اس نے غریبوں کے لئے اچھے اچھے کام کرنے شروع کئے ہیں۔ پورا گاؤں اب اس چوہدری حشمت سے حیران ہے بدلہ لینا تو ہر کوئی چاہتا ہے لیکن کسی کو سدھارنا سب سے اہم بات ہے۔

اپنی ہار پر میرے والد نے شرط پوچھی تو میں نے کہا۔’’ میں جنات سے دستبرداری چاہتا ہوں اور انسان بننا چاہتا ہوں میرے والد نے آخر کار میری بات مان لی اور آج میں ایک انسان کے روپ میں تمہارے سامنے ہوں۔‘‘ اتنا کہہ کر شاہ مردان خاموش ہوگیا۔ ’’آج سے تم اور میں ایک عام انسانوں کی طرح زندگی گزاریں گے۔‘‘

حمیرا نے مسکراتی اور بھرائی ہوئی نگاہوں سے شاہ مردان کی طرف دیکھا اور پھر اس کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔

☠

پرانا قبرستان

سیدہ عطیہ زاہرہ-لاہور

تابوت کا ڈھکن اٹھاتے ہی ایک ہیولہ باہر کو نکلا اور پلک جھپکتے ہی نہ جانے کہاں غائب ہوگیا اور پھر کان پھاڑ دینے والے قہقہے گونجنے لگے، پورے تہ خانے میں جیسے تھلکہ مچ گیا اور پھر ایک منظر......

رات کے پرہول اندھیرے میں جنم لینے والی خوفناک، دہشت ناک، ڈراؤنی کہانی

یونیورسٹی سے ایک ماہ کی رخصت لے کر میں اپنی بیوی سائرہ اور بیٹی مونا کے ہمراہ شمالی علاقہ میں اپنے ایک دوست آغا کے پاس سیر کی غرض سے چلا آیا۔ آغا کی رہائش ندی کے کنارے بنے ہوئے ایک پرانے مکان میں تھی۔ جو دور سے ایک شکستہ قلعہ معلوم ہوتا تھا۔ آغا غیر شادی شدہ تھا اور اپنے دو نوکروں کے ساتھ اس مکان میں رہا کرتا تھا۔ ہم لوگوں نے پہنچ کر ایک کمرہ آباد کر دیا تھا۔ آغا بہت خوش تھا کہ عارضی طور پر ہی سہی۔ بہر حال کچھ تو اس کی تنہائی دور ہوگی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم آغا کے کمرے میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک اس رات کے اسرار شروع ہوگئے۔ جس کا تذکرہ میں کرنے والا ہوں۔ رات کی ابتدا ایک طوفان سے ہوئی تھی۔ طوفان کی تیزی کا اندازہ لگا کر آغا نے اٹھ کر کمرے کی بیرونی

کھڑکیاں بند کردیں۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ محسوس ہوتا رہا کہ باہر طوفان بڑھتا جا رہا ہے۔ اسی اثناء میں تیز بارش شروع ہوگئی۔ بادلوں کی گرج اور ہوا کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے۔

میری ننھی سی بیٹی مونا ان آوازوں سے اتنا ڈر گئی کہ وہ صوفہ سے اٹھ کر میری گود میں آ بیٹھی۔ میری بیوی خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد طوفان رکا، بارش کم ہوئی، اور ہوا کا شور بند ہوا، لیکن اس کے ساتھ اچانک میرے کانوں میں ایک عجیب وغریب آواز آئی، ایک بلند آواز جیسے کوئی شخص جان کنی کے عالم میں بری طرح کراہ رہا ہو۔

آواز میں اتنا درد اور کرب تھا کہ میں چونک سا گیا۔ لیکن ابھی میں آغا سے کوئی سوال نہیں کرنے پایا تھا کہ آغا نے خود ہی کہا۔ ”گھبراؤ نہیں، مکان کے نزدیک ایک بہت پرانا مسیحی قبرستان ہے۔ یہ آواز اکثر اسی طرف سے آیا کرتی ہے۔ شروع میں ان آوازوں نے مجھے ڈرایا تھا۔ لیکن اب میں اس کا عادی ہو چکا ہوں۔“ آغا کا جملہ ختم ہوتے ہی یہ آواز بند ہوگئی اور ماحول پر ایک بھیانک خاموشی مسلط ہوگئی۔ ایک ایسی خاموشی جس نے میری الجھن میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ ایسی الجھن اور گھبراہٹ میں، میں نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ باہر بھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے کھڑکی کے نزدیک کھڑے ہوکر باہر کے ماحول کا جائزہ لینا چاہا، اچانک فضا میں ایک نئی قسم کی چیخ بلند ہوئی، اور چیخ کے ساتھ یوں محسوس ہوا جیسے ایک ساتھ کئی عورتوں نے بین شروع کر دیے ہوں، میں نے لپک کر اپنی ٹارچ اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔

آغا میرا ارادہ بھانپ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”ذکی، اتنی رات میں قبرستان کی طرف جانا میرے نزدیک حماقت ہے۔“

”میں توہمات کو نہیں مانتا!“ میں نے جواب دیا۔ ”میں ان آوازوں کی حقیقت معلوم کر کے رہوں گا۔“ ظاہر ہے کہ آغا مجھے اس اندھیری رات میں قبرستان کی طرف تنہا کیسے جانے دیتا، اس لئے وہ بھی میرے ساتھ ہولیا، پندرہ منٹ کے اندر ہم اندھیرے راستے کو ٹارچ کے ذریعہ روشن کرتے ہوئے قبرستان کے آہنی پھاٹک تک پہنچ گئے۔

پھاٹک میں تالا لگا ہوا تھا، اس لئے ہم اس کی تین فٹ اونچی دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گئے۔ اندر قبرستان کی زمین سے ہمارے پاؤں لگے ہی تھے کہ ایک مرتبہ پھر ویسی ہی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ لیکن اس مرتبہ آواز ہلکی تھی۔ بالکل ایسے جیسے کوئی ہلکے ہلکے سسکیاں بھر رہا ہو۔ ڈرے بغیر میں اس آواز کی طرف بڑھتا رہا۔ میں ڈرتا بھی کیوں؟ یونیورسٹی کا سائنس پروفیسر بھلا ان باتوں کا کیسے قائل ہو سکتا تھا۔

چند لمحوں بعد ہمیں دائرے کی شکل کی ایک منڈیر سی دکھائی دی۔ جس کے اندر زمین کے نیچے جانے والی سنگی سیڑھیاں موجود تھیں۔ ”میرا خیال ہے کہ آواز اس جگہ سے آرہی تھی۔“ آغا نے کہا۔ ”ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ آؤ نیچے چلیں۔“ ہم دونوں ان سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگے۔

تقریباً بارہ سیڑھیوں کے بعد ہمیں لوہے کا ایک دروازہ دکھائی دیا جو میرے دھکیلتے ہی اندر کی جانب کھل گیا۔ میں نے اپنی ٹارچ کی روشنی اندر پھینکی، تاکہ اندر کا جائزہ لے سکوں۔ یہ ایک چھوٹا سا گنبد نما تہہ خانہ تھا۔ جس کے وسط میں لوہے کا ایک بہت بڑا تابوت پڑا تھا۔ چھت کے کنڈے سے ایک باریک سی زنجیر لٹک رہی تھی۔ جس کے آخری سرے پر ایک ڈبیا بندھی تھی۔ ڈبیا اور تابوت کے درمیان صرف ایک فٹ کا فاصلہ تھا۔ ایک ہی نظر میں، میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ کمرے کی دیواریں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ اور جگہ جگہ مکڑی کے بڑے بڑے جالے موجود ہیں۔ جو اس کا ثبوت ہیں کہ یہاں ایک عرصے سے کوئی انسان داخل نہیں ہوا۔

ہم دونوں دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوگئے اور تابوت کے نزدیک پہنچ گئے اور پھر جیسے ہمارے پیر سو سو من کے ہوگئے۔ کیونکہ ہم نے صاف طور پر محسوس کیا کہ کمرے میں کوئی نہ دکھائی دینے والا انسان زور زور سے سانس لے رہا ہے۔ سانس کی یہ آواز بتدریج تیز ہوتی گئی۔ بالکل ایسی آواز تھی جیسے کوئی شخص لمبی دوڑ کے بعد ہانپنے لگے۔

اور پھر ایک چیخ گونجی۔ ایک دل دوز نسوانی چیخ، ایک ایسی چیخ جس نے ہمارے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ چیخ کے ختم ہوتے ہی ہمیں گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

اور اگلے ہی لمحے پتھر کی ایک بڑی سل چھت سے نکل کر ہمارے قدموں کے نزدیک آ گری۔ اتنی نزدیک کہ اگر میں آغا کو اپنی طرف گھسیٹ نہ لیتا تو یہ سیل اس کا بھیجہ نکال دیتی!

ابھی ہم دونوں سنبھلنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ دوسرا پتھر گرا، پتھر تیسرا پتھر، اگر، ہم گھبرا کر دروازے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ دیکھا کہ جس دروازے کو ہم محض چند منٹ پہلے کھلا چھوڑ کر آئے تھے نہ صرف یہ کہ بند ہے بلکہ اس طرح بند ہے جیسے کسی نے اس میں باہر سے کنڈی لگا کر تالا ڈال دیا ہو۔

صورت حال اتنی بھیانک تھی کہ ہمارے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ہم اس زمین دوز کمرے میں قید ہ کر رہ گئے تھے۔ چند منٹ تک چھت سے اس طرح پتھر گرتے رہے پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پتھروں کی یہ بارش بند ہوگئی، یہ دیکھنے کے لئے کہ چھت کس جگہ سے ٹوٹی ہے۔ میں نے ٹارچ کی روشنی چھت پر پھینکی، اور پھر میرا خون رگوں میں جم گیا۔

چھت میں نہ کوئی سوراخ تھا اور نہ ہی کوئی پتھر اب فرش پر موجود تھا۔ کمرے کے وسط میں تابوت اس طرح موجود تھا۔ زنجیر اسی طرح لٹک رہی تھی اور آوازیں اسی طرح آ رہی تھیں۔ لیکن اب ان آوازوں کو سن کر ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کوئی نیند میں خراٹے لے رہا ہو۔

میری آنکھوں نے اب تک جو کچھ دیکھا اور کانوں نے جو کچھ سنا تھا۔ ذہن اسے ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے سوچا۔ ”ہوسکتا ہے یہ سب میرا وہم ہو۔ اگر چھت سے واقعی پتھر گرے تھے۔ تو آخر یہ پتھر گئے کہاں؟“

میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس تابوت کا ڈھکنا کھول کر دیکھنا چاہئے۔ لیکن ابھی میں نے اس آہنی تابوت کو صرف چھوا ہی تھا کہ کمرے میں دوبارہ ایک دل خراش نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

فوراً ہی کمرے میں کسی مرد کے قہقہے گونجے اور اس کے ساتھ ہی چھت سے لٹکی ہوئی زنجیر خود بخود ہلنے لگی اور اس میں بندھی ہوئی ڈبیا میرے سر سے ٹکرائی، میں نے جھپٹ کر اسے دبوچ لیا۔ اور پوری قوت سے جھٹکا دے کر اسے زنجیر سے الگ کردیا۔ مردانہ قہقہوں کی آواز اور بھی بھیانک ہوچکی تھی۔

آغا ایک مرتبہ پھر دروازے کی طرف لپکا۔ اور اسے پیٹنے لگا۔ لیکن یہ سب ہماری دیوانگی ہی تھی۔ کیونکہ اس سینکڑوں سال پرانے قبرستان میں اس وقت کسی کے ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔ کافی دیر تک ہم دونوں مدد کے لئے چیختے رہے اور پھر تھک کر دروازے سے ہی لگ کر کھڑے ہوگئے۔

چند منٹ بعد قہقہے دوبارہ مدھم سی کراہ میں تبدیل ہوگئے اور جیسے پھر ہماری جان میں جان آئی۔ لیکن اس کے باوجود ہم تھر تھر کانپ رہے تھے۔ خوف سے ہمارا حلق خشک ہوچکا تھا۔ ہلکی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔

کمرے میں یخ بستہ سی ٹھنڈک رچی تھی۔ آج بھی مجھے یہ رات یاد آتی ہے تو میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ میں ایک سائنس دان ہوں، میں مافوق الفطرت طاقتوں پر یقین نہیں رکھتا، لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ جو مناظر میں نے اس رات دیکھے انہیں میں اپنی زندگی کی کسی ساعت میں بھی فراموش نہیں کرسکتا۔

میں نے دیکھا کہ رات کے بارہ بجتے ہی اس زمین دوز کمرے میں ہلکی ہلکی زرد روشنی پھیلنے لگی، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس روشنی نے ایک انسانی ہیولے کی شکل اختیار کرلی۔ جس کے سر پر قدیم زمانے کی ایک ٹوپی تھی۔ چند منٹ تک یہ ہیولہ تابوت کے اوپر حرکت کرتا رہا، اچانک دوبارہ قہقہے بلند ہوئے، میں نے خوف زدہ ہو کر بغل میں کھڑے ہوئے آغا کی طرف دیکھا، اس کی حالت مردوں کی سی ہوچکی تھی، خوف سے اس کی پتلیاں پھیل چکی تھیں۔ چہرہ سپاٹ اور بے جان سا ہوچکا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم ڈھیلا ہوا اور وہ فرش پر گر پڑا۔ اس کے منہ سے جھاگ بہہ رہے تھے۔ میں نے تابوت کی طرف دیکھا۔ روشنی کا وہ ہیولا اب تابوت سے اتر کر میری طرف بڑھ رہا تھا۔ خوف ناک چیخیں

میرے بازو نزدیک ہو رہی تھیں۔ میں نے بچنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جیسے میرے پیروں نے جواب دے دیا اور میں اوندھے منہ فرش پر گر پڑا۔

جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ میں اس تہہ خانہ کے فرش پر پڑا تھا۔ چاروں طرف ایک پراسرار خاموشی طاری تھی۔ آغا ابھی تک بے ہوش تھا۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اچانک مجھے رات کے واقعات یاد آ گئے۔ دن کی اس مدھم سی روشنی میں مجھے رات والے سارے مناظر ایک خواب یا خیال کی طرح محسوس ہوئے۔ میں نے تابوت کو چھو کر دیکھا۔ اب اس میں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ''وہم سراسر وہم!'' میں نے رات والے واقعات پر دل ہی دل میں تبصرہ کیا۔ اور پھر تابوت کے قریب کھڑے ہو کر اس کا ڈھکن اٹھا دیا۔

میری اس حرکت سے آغا اتنا خوفزدہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ لیکن اس بار وہ بلاوجہ چیخا تھا۔ تابوت میں پڑی ہوئی لاش کا پنجر بالکل خستہ ہو چکا تھا تھا۔ صرف کھوپڑی اپنی اصلی حالت میں موجود تھی اور پسلیاں اور ہاتھ کی ہڈیاں راکھ بن چکی تھی۔ میں نے ہنس کر تابوت بند کر دیا۔

''میرا خیال ہے رات کو ہم نے کوئی خواب دیکھا تھا۔'' میں نے آغا سے کہا۔

''تم بکواس کرتے ہو، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ دونوں کو ایک ہی طرح کا خواب دکھائی دے؟'' میں خاموش ہو گیا کیونکہ آغا کے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اچانک میری نظریں آہنی دروازے کی طرف اٹھیں، دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا۔ تابوت پر آخری نظر ڈالتے ہوئے ہم دونوں تہہ خانے سے باہر نکل آئے۔ باہر سنہری دھوپ پھیل چکی تھی۔ دروازے کے قریب مقبرے کی دیوار پر ایک پتھر لگا تھا۔ ''سردار خاقان'' جو اپنی زندگی میں اتنا بڑا بدکار اور اتنا خبیث تھا کہ گاؤں والوں نے دوسرے گاؤں کے سردار کی مدد لے کر اس کو اور اس کے پورے خاندان کو قتل کر دیا اور مظلوم لوگوں کو اس کی خباثت سے نجات دلائی؟''

☆......☆......☆

جب ہم مکان پر پہنچے تو دن کے دو بج چکے تھے۔ میری بیوی سائرہ دیوانوں کی طرح صحن میں پھر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی، لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''یہ آپ کے بالوں کو کیا ہوا؟'' سائرہ چلائی۔

میں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بال سر پر موجود تھے۔

''آپ کے سب بال سفید ہو چکے ہیں۔'' سائرہ دوبارہ چیخی۔ میں ڈر کر آغا کے کمرے میں داخل ہوا۔ قد آدم آئینے کے سامنے پہنچتے ہی میں نے خود بھی دیکھ لیا۔ کہ میرے سر کے تمام بال سفید ہو چکے ہیں۔ میں نے آغا کی طرف دیکھا۔ اس کے سر کا ایک بھی بال سفید نہیں ہوا تھا۔ انتہائی حیرت کے عالم میں آغا میری طرف دیکھتا رہا! پھر بولا۔ ''ذکی......تم نے تابوت کا ڈھکن کھول کر اچھا نہیں کیا۔ یقیناً رات کی تاریکی میں کراہنے والی روح اب تم سے انتقام لے گی۔ ورنہ یہ بالکل ناممکن ہے کہ تمہارے بال سفید ہو جاتے اور میرے نہ ہوتے!''

سائرہ نے مجھ سے بہت پوچھا کہ رات ہم دونوں کہاں رہے؟ لیکن میں نے اسے کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ کیونکہ میں بلاوجہ اسے ڈرانا نہیں چاہتا تھا۔ اب میں خود روح سے ڈر چکا تھا۔ میں خود نہیں چاہتا تھا کہ روح کا راز فاش ہو کر پھیلے اور واقعی مجھ سے انتقام لینے کے لئے اپنے تابوت سے باہر نکل آئے۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ صرف ایک رات کے اندر اپنے سیاہ بالوں کو سفید دیکھ کر میرے دل و دماغ کی کیا حالت تھی۔ ایک مرتبہ پھر فلم کی طرح کے مناظر میری نظروں کے سامنے گزر گئے۔ پھر آغا نے مجھے بہت روکا، لیکن میں دوپہر سے پہلے ہی لوٹ گیا۔

ایک ہفتے بعد میں نے اپنی چھٹی خود ہی ختم کر دی۔ میں چاہتا تھا کہ یونیورسٹی جاؤں تاکہ مصروفیتوں میں اس رات کے واقعات میرے ذہن سے محو ہو جائیں۔ چنانچہ میں معمول کے مطابق لیکچر دینے یونیورسٹی جانے لگا۔ زندگی کے معمولات دوبارہ شروع ہو گئے اور دھیرے

دھیرے میں تابوت والے تہہ خانے کو بھولنے لگا۔

☆......☆......☆

ایک دن شام کے وقت ہم اپنے مکان کے صحن میں چائے پی رہے تھے۔ اچانک میری چھ سالہ لڑکی مونا اٹھ کر بالائی کمرے کی طرف جانے لگی۔ پوچھنے پر اس نے کہا۔ ”میں اپنا ہوائی جہاز لینے جا رہی ہوں۔ جو آپ نے مجھے سالگرہ پر لا کر دیا تھا۔“ ہوائی جہاز لے کر مونا پندرہ منٹ بعد بھی واپس نہیں آئی۔

مجھے اور سائرہ کو بازار جانا تھا، اس لئے میں نے سائرہ سے کہا کہ ”اوپر جا کر مونا کو بلا لاؤ۔“

”وہ غالباً اپنے کھلونے سے وہیں کھیلنے لگی ہوگی۔“ سائرہ کہنے لگی۔ لیکن میرے کہنے پر وہ اوپر گئی۔ اور چند لمحوں کے بعد وہ دیوانوں کی طرح سیڑھیوں سے اتر کر میرے پاس آئی۔ اور خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ”مونا اوپر نہیں ہے، میں نے پورا کمرہ دیکھ ڈالا ہے۔“

اوپر صرف ایک ہی کمرہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ مونا جب اس کمرے میں نہیں تھی تو کہاں چلی گئی تھی؟ کمرے کا صرف ایک ہی دروازہ تھا۔ جو زینے میں کھلتا تھا اور ہمارے سامنے مونا اسی دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

بالکل پاگلوں کی طرح میں بھی کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن مونا وہاں ہوتی تو ملتی کمرے کی تمام کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ اس لئے یہ امکان بھی خارج از بحث تھا کہ وہ کھڑکی سے نیچے سڑک پر گر پڑی ہو۔ میں نے اور سائرہ نے مکان کا کونا کونا چھان مارا مگر مونا کا کہیں پتا نہ چلا۔ نہ مکان میں، نہ پڑوسیوں میں، نہ محلے میں! گھبرا کر میں نے پولیس کو فون کر دیا۔

پولیس نے وائرلیس کے ذریعے پورے شہر میں مونا کا حلیہ نشر کر دیا۔ ہر طرف مونا کی تلاش شروع ہو گئی۔ میں نے مونا کی تمام تصویریں بھی پولیس کے حوالے کر دیں۔

سائرہ روتی رہی، وہ یہ ہی کہتی رہی ”ہائے میری مونا وہ میرے سامنے اسی کمرے میں گئی تھی۔ اور میں سچ کہتی ہوں کہ وہ اس کمرے سے باہر نہیں نکلی۔“ غم و دیوانگی کے عالم میں رات کے نو بج گئے۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے لپک کر فون اٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میں انسپکٹر عباس بول رہا ہوں۔ مجھے اس شہر کے مضافات سے ایک بچی کی لاش ملی ہے۔ آپ تھانہ نمبر 14 آ جائیں۔ تاکہ ہم دونوں ساتھ چل کر اس لاش کو دیکھ لیں۔“

سائرہ کو مکان میں روتا بلکتا چھوڑ کر میں موٹر پر سوار ہو کر تھانے پہنچا، اور وہاں سے انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ مضافاتی پولیس تھانے پہنچ گیا۔ تھانے کا انچارج ہمارا منتظر تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں اس کمرے میں داخل ہوا۔ جہاں ایک اسٹریچر پر بچی کی لاش کپڑے سے ڈھکی ہوئی موجود تھی۔ میں لاش کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ تھانہ انچارج نے میرا شانہ پکڑ کر پوچھا۔ ”مسٹر ڈکی...... آپ کی بچی کب کھوئی تھی؟“

”آج شام پانچ بجے کے قریب!“ میں نے جواب دیا۔

”تب تو آپ کو بے کار ہی زحمت ہوئی۔ کیوں کہ یہ بچی آپ کی نہیں ہو سکتی میرا اندازہ ہے کہ اس بچی کو مرے ہوئے کم از کم سات دن ہو چکے ہیں۔ یقین جانئے اس کے خدوخال بھی پہچانے نہیں جاتے۔ اس کا گوشت گل چکا ہے۔ اور چہرے کے نقوش بدل چکے ہیں۔“ تھانہ انچارج کا یہ جملہ سن کر مجھے عارضی تسکین ضرور ملی۔

لیکن کوشش کے باوجود میں لاش دیکھنے کے لئے اپنا ارادہ نہ روک سکا۔ میں نے آگے بڑھ کر لاش کا کپڑا اٹھایا اور پھر جیسے میری آنکھوں کے سامنے تاریکی پھیل گئی۔ بے اختیار میرے منہ سے ”مونا میری بچی“ نکلا اور میں اسی جگہ گر کر بے ہوش ہو گیا۔

آنکھ کھلی تو میں مکان کے ایک کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ ایک ڈاکٹر میرے سرہانے اور انسپکٹر عباس میرے بائیں طرف کھڑا تھا۔ ”سائرہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کی بے ہوشی کے بعد ہمیں آپ کی بیوی کو لاش کی شناخت کے لئے بلانا پڑا۔ کیوں کہ ہمیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا، کہ لاش آپ کی بچی کی ہو سکتی ہے۔ وہ لاش واقعی سات روز پرانی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ہماری حیرت کی

کوئی انتہا نہ رہی، جب آپ کی بیوی نے بھی لاش شناخت کرلی۔ بہرحال اس وقت وہ اسپتال میں ہیں اور اب تک ہوش میں نہیں آئی ہیں۔"

میں جواب دینے کے بجائے خاموش رہا اور چھت کی طرف گھورتا رہا!

انسپکٹر عباس نے مزید کہا۔ "مسٹر ذکی...... خدا کے لئے ہمیں بتایئے کہ یہ کیا بھید ہے؟ ہمارے خیال میں دو ہی باتیں ممکن ہوسکتی ہیں، یا تو آپ نے اور آپ کی بیوی نے شدت غم کی وجہ سے لاش کی غلط شناخت کی ہے، یا پھر آپ کی بچی سات دن پہلے گم ہوچکی تھی، اور آپ نے کسی مصلحت کی وجہ سے اس کی رپورٹ پولیس میں درج نہیں کرائی۔ ہم لاش کا پوسٹ مارٹم بھی کراچکے ہیں۔ ڈاکٹر بھی تصدیق کرچکا ہے کہ لاش کم از کم سات دن پرانی ہے۔ موت دل کی حرکت بند ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے اور لاش پر کسی چوٹ یا مار پیٹ کا نشان موجود نہیں ہے۔"

"انسپکٹر عباس!" میں نے ہلکی آواز میں کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ لاش مونا کی تھی، اور مونا آج شام کو پانچ بجے تک میری نگاہوں کے سامنے موجود تھی۔"

ایک گھنٹے کے اندر اسپتال سے سائرہ کے بارے میں خبر آگئی۔ وہ مرچکی تھی۔

مونا کے بعد سائرہ کا غم میرے لئے ناقابل برداشت تھا۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ صرف سولہ گھنٹے میں میرا گھر تباہ ہوچکا تھا۔ مونا میرے سامنے بالائی کمرے میں کھلونا لینے گئی تھی۔ لیکن چار گھنٹے بعد اس کی لاش ہمارے گھر سے آٹھ میل دور ملی اور وہ بھی اس حالت میں کہ ڈاکٹروں کی رپورٹ کے بموجب اس کو مرے ہوئے سات دن ہوچکے تھے۔ سائرہ بے ہوش ہوئی تو پھر اس کی آنکھ تا قیامت تک کے لئے بند ہوگئی۔

ایک ہفتے تک میں مکان میں پڑا رہا، بے شمار طالب علم یونیورسٹی پروفیسر، میرے دوست اور رشتے دار تعزیت کے لئے آتے رہے، سب نے مجھے سمجھایا۔ تسکین دلائی۔

لیکن میں دن رات قبرستان کی اس خوفناک رات پر غور کرتا رہا، اور میری الجھنیں بڑھتی ہی گئیں۔ اس طرح ایک ہفتہ اور گزر گیا۔

ایک دن شام کو ٹھیک پانچ بجے جب مکان میں میرے علاوہ کوئی نہ تھا۔ میں نے اسی بالائی کمرے میں جہاں سے مونا گم ہوئی تھی۔ شور کی آواز سنی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی پلنگ گھسیٹ رہا ہو۔ میں لپک کر صحن میں آیا، اور اوپر جانے کا فیصلہ کرہی رہا تھا۔

اچانک کسی نے بستر لپیٹ کر باہر پھینک دیا، میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا، لیکن ابھی میں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ اوپر سے پلنگ بھی لڑھکا دیا گیا اور پھر تو جیسے اوپر سے کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کی بارش سی ہونے لگی۔ کپڑے، ٹیبل، لیمپ، میز، کرسیاں، جوتے، کتابیں، کھلونے سب نیچے آکر برسنے لگے۔

میں صحن میں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بالائی کمرے کے دروازے کی طرف دیکھتا رہا، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی غصے میں پاگل ہوکر ہر چیز کو تہس نہس کردینا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چیزوں کی بارش بند ہوگئی، میں بے تحاشہ اوپر بھاگا۔

لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی آدمی نہ سامان یہاں تک کہ دیواروں کی تصویریں اور کھڑکیوں کے پردے تک نوچ جاچکے تھے۔

اچانک میری نگاہ کمرے کے فرش پر پڑی، اور پھر سے پاؤں تک میرے جسم میں دہشت کی ایک تیز لہر دوڑ گئی، فرش پر تازہ تازہ خون پھیلا ہوا تھا، اور کمرے میں وہی قہقہے بلند ہورہے تھے جو میں نے اس رات قبرستان کے تہہ خانے میں تابوت کے قریب سنے تھے مردانہ قہقہے بھی اور نسوانی چیخیں بھی!

☆......☆......☆

صبح کے وقت جب مسٹر ذکی کا ایک دوست ان سے ملنے کے لئے ان کے مکان پر آیا۔ تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مسٹر ذکی اپنے پلنگ پر مردہ پڑے تھے اور یہ تحریر ان کی میز پر موجود تھی۔ پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا کہ مسٹر ذکی کے دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اچانک مرگئے۔

مسلسل سزا

عابد علی جعفری۔ کندیاں

جنگل میں ایک بڑے پتھر پر لیٹا ہوا شخص چیخ کر لوگوں کو مدد کے لئے پکار رہا تھا مگر کوئی بھی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ پھر ایک نوجوان جب قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ بے شمار سانپ اس شخص کو ڈس رہے تھے۔

قانون قدرت سے منحرف لوگوں کے لئے بہت ہی لرزیدہ لرزیدہ رونگٹے کھڑے کرتی کہانی

یوں تو میں ہر روز اس راستے سے گزرتا ہوں یہ راستہ شارٹ کٹ تو نہیں ہے لیکن اس راستے سے گزر کر دل کو بہت سکون ملتا ہے۔ راستہ تو پکا نہیں ہے اور نہ ہی بہت کشادہ ہے بس دو آدمی ساتھ ساتھ گزر سکتے ہیں ہر طرف سرسبز گھاس ہے۔ درختوں کی لمبی لمبی قطاریں ہیں اور پرندوں کی سریلی آوازیں کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ جنگلی علاقہ ہونے کی وجہ سے جنگلی جانور بھی بڑی تعداد میں ہیں لیکن ان جانوروں سے کوئی خطرہ نہیں ہے کیونکہ یہاں کوئی خوف ناک خونخوار جانور نہیں ہے۔ البتہ شکار کرنے اکثر لوگ اس جنگلی علاقے کا رخ کرتے ہیں۔

شکار کے لئے ہرن، خرگوش اور جنگلی گائے بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں یہ علاقہ آبادیوں سے بہت دور اور چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس لئے ابھی تک محفوظ ہے میرا قبیلہ سامنے پہاڑ کے دامن

میں ہے ہمارے چھوٹے چھوٹے کچی مٹی کے گھر ہیں ہمارا قبیلہ اتنا بڑا نہیں ہے۔ جانور پالتے ہیں اور ان کا کاروبار کرتے ہیں اس لئے میں اکثر ایک دو بکری یا گائے لے کر شہر جاتا ہوں شہر بھی بہت بڑا نہیں اور اس شہر میں مکس ہندو مسلم آبادی ہے ہندو لوگ اکثر بکریاں ہی لیتے ہیں مسلمان کبھی کبھی گائے خرید لیتے ہیں اس لئے میں زیادہ تر بکریاں ہی لے کر آتا ہوں اس شہر کے لوگ بہت امن پسند ہیں اور بڑے شہروں کے لوگوں کی نسبت بہت سادہ زندگی گزارتے ہیں۔

اس دن بھی میں دو بکریاں لے کر شہر گیا تھا اور دونوں بکریوں کو اچھی قیمت میں فروخت کر کے اس جنگل والے راستے سے واپس آرہا تھا لیکن آج میں بہت لیٹ ہو گیا تھا رات کافی گہری ہو گئی تھی۔ رات چونکہ چاندنی تھی اس لئے بے خوف ہو کر میں آگے بڑھ رہا تھا، اپنے اپنے گھونسلوں میں پرندے خاموش تھے زیادہ تر جھینگروں کی آوازیں خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔

اچانک میرے کانوں میں کسی کے چیخنے کی آواز آئی، آواز بہت قریب سے آئی تھی کیونکہ رات کا وقت تھا اور میں پہلی بار رات میں اس راستے سے گزر رہا تھا اس لئے میں ڈر گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور میری پیشانی سے پسینہ نکلنے لگا۔

''بچاؤ بچاؤ۔ بھگوان کے لئے کوئی تو آؤ اور مجھے اس مصیبت سے نجات دلاؤ، بچاؤ بچاؤ۔''

میں بہت ڈر گیا تھا لیکن دل کہہ رہا تھا۔ ''دیکھ تو لو چکر کیا ہے؟ وہ کون ہے؟ اور اس طرح کربناک آواز میں چیخ رہا ہے اور کس مصیبت کا سامنا کر رہا ہے؟''

میں سمت کا اندازہ کر کے اس طرف چل دیا آوازیں مسلسل آرہی تھیں مجھے چلنے میں بہت مشکل پیش آرہی تھی کانٹے دار جھاڑیاں بہت تھیں اور درخت ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے چاند کی چاندنی بھی نہیں پہنچ پا رہی تھی اور مجھے دیکھنے میں تکلیف ہو رہی تھی لیکن معلوم نہیں دل بار بار ساتھ دے رہا تھا۔ اور میں ہمت کر کے اس طرف اپنے قدم بڑھا رہا تھا۔

کہ اچانک میری نظر ایک بڑے پتھر پر پڑی جس پر ایک شخص لیٹا ہوا تھا اس بڑے پتھر کے اردگرد درخت نہیں تھے اس لئے چاندنی اس پتھر کو روشن کئے ہوئے تھی۔ اور وہ شخص بہت چیخ رہا تھا کیونکہ بہت سے سانپ اس کو ڈس رہے تھے میری نظر جس طرف بھی جاتی سانپ باری باری اس کو ڈس رہے تھے اور وہ شخص مسلسل تکلیف کی وجہ سے چیخ رہا تھا معلوم نہیں اس کو کس گناہ کی سزا مل رہی تھی۔

زہریلے اور خوفناک سانپوں کو دیکھ کر میرا آگے بڑھنے کو دل نہیں کر رہا تھا پھر بھی اس شخص کو کربناک مصیبت میں دیکھ کر میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ میں نے ایک طرف پڑی ایک بڑی خشک لکڑی لی اور آگے بڑھنے لگا۔ لیکن یہ کیا مجھے دیکھ کر سارے سانپ ایک ایک کر کے غائب ہونے لگے اور چند لمحوں بعد اب وہ شخص بھی خاموش ہو گیا تھا۔ جلد ہی میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی نظریں میری طرف ہی تھیں۔ لیکن وہ اسی حالت میں تھا جیسے وہ کوئی ان دیکھی رسی سے باندھا ہوا ہو، میں قریب پہنچا تو اس کی آواز آئی۔ ''شکریہ دوست، تمہارے آنے سے میری سزا کچھ دیر کے لئے ختم ہو گئی ہے۔''

''کیا......؟ کیا مطلب؟۔''

''یہ سزا تو مسلسل سزا ہے میری جو چالیس سالوں سے جاری ہے اور ہر روز رات میں مجھ پر یہ اذیت گزرتی ہے، ان چالیس سالوں میں تم پہلے شخص ہو جو میری مدد کے لئے یہاں آئے ہو، میں تو روز رات کو اسی طرح بچاؤ بچاؤ کی آوازیں دیتا رہتا ہوں۔''

''کون آئے آپ کی مدد کو یہ راستہ تو کوئی استعمال ہی نہیں کرتا۔ یہ راستہ صرف میں استعمال کرتا ہوں لیکن کمال ہے آج تک میں نے آپ کی آواز نہیں سنی کیوں کیا وجہ ہے؟''

''شاید تم دن کے اجالے میں یہاں سے گزرتے ہو، سزا تو مجھے رات میں ملتی ہے، دن کو تو میں مردہ ہو جاتا ہوں اور میری آتما میرے جسم سے نکل جاتی

ہے۔ اور رات ہوتے ہی واپس آجاتی ہے اور میرا وجود بھی یہاں سے غائب ہوجاتا ہے؟''

''اچھا یہ بات ہے! کیا تم زندہ نہیں ہو اور یہ کون سی سزا مل رہی ہے، کیا گناہ کیا ہے تم نے جس کی سزا ختم نہیں ہورہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جب زندہ تھا تو میں نے بہت گناہ کئے ہیں لیکن جو میں نے بہت بڑا گناہ کیا ہے اس کی سزا ابھی مجھے کم معلوم پڑی ہے۔ میں نے بہت بڑا گناہ کیا تھا۔ اچھا تمہارا نام کیا ہے اور کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''میرا نام امجد ہے اور میں شام قبیلے سے ہوں جو اس جنگل میں تھوڑے فاصلے پر ہے۔''

''اور تم کون ہو؟''

''اچھا تو تم مسلمان ہو، میرا نام رام لال ہے اور میں ہندو ہوں میرا گھر شہر میں تھا جو اس جنگل سے دور، ان پہاڑوں کے دوسری طرف ہے۔'' وہ بولا۔

''اچھا تو تم شکتی نگر کے رہنے والے ہو، میں ابھی وہی سے آرہا ہوں بکریاں فروخت کرکے، وہاں کے لوگ تو بہت اچھے ہیں وہ ایک دوسرے کے مذہب کا بہت احترام کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو، چالیس سال پہلے بھی یونہی امن اور سکون تھا ہر کوئی اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

میری دوستی بھی مسلمان لڑکوں سے تھی۔ وہ لڑکے بھی بہت نیک دل انسان تھے ایک کا نام قیوم تھا اور دوسرے کا نوید۔ اور ہم اکثر شکار کرنے یہاں آتے تھے۔ ان دنوں مجھے شکار کا بہت شوق، قیوم تو ہر وقت اپنے پاس ایک غلیل اور کلہاڑی رکھتا تھا۔

ہمارے محلے میں ایک لڑکی کرن رہتی تھی جو کہ نوید کی کزن تھی اور جلد ہی ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی، ہماری عمر اس وقت بیس سال تقریباً تھی۔

مجھے بھی کرن سے پیار ہوگیا تھا میں اس کے پیار میں دیوانہ تھا لیکن وہ میری طرف دیکھتی بھی نہیں تھی اور میرا دل میرے بس میں نہیں تھا۔

زندگی

زندگی اگر پھول ہے تو اس کے ساتھ جڑا کانٹا درد بھی دیتا ہے...... اگر چاند کی نرم ٹھنڈی چاندنی ہے تو سورج کی گرم گرم لپیٹیں بھی ہیں، ہوا اگر نیم سحر اور صبا کے روپ میں دل و روح کو بے نور کردیتی ہے تو یہی ہوا جب آندھی بنتی ہے تو اپنے اندر نجانے کتنی زندگیاں بھی ختم کردیتی ہے، قحط سالی میں کالی گھٹائیں اگر نوید حیات ہیں تو یہی بادل جب برسنے پر آتے ہیں تو سینکڑوں جانیں اس کے پانی میں ڈوب جاتی ہیں، اس زندگی نے مجھے صرف یہ سکھایا ہے کہ دنیا کے لئے رونے والے بزدل ہوتے ہیں اور بزدلوں کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ دنیا میں رہنا ہے تو اللہ پاک کی نعمتوں کا ہر وقت شکر کرو اور اس پر شکر ادا کرتے ہوئے ہنسی خوشی رہو اور اپنے آنسوؤں کو لوگوں سے چھپا کر اپنے دل میں اتارتے رہو۔'' لوگوں کے سامنے مسکراتے رہو اور انہیں احساس ہی نہ ہو کہ آپ دکھی ہیں کیونکہ دکھ میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے، پھر کسی کو آزمانے اور دکھ اٹھانے سے کیا فائدہ۔

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

نوید کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں بھی کرن سے پیار کرتا ہوں۔ میری تو رات کی نیند اور دن کا چین اس کی یادوں میں تھا۔

ایک دن ایک جوگی نے شہر کے باہر ڈیرہ لگایا وہ شاید سانپ پکڑنے آیا تھا کیونکہ اس جنگل میں بہت خوبصورت اور زہریلے سانپ پائے جاتے تھے۔

اس دن میں اور نوید شکار کے لئے اس جنگل میں جارہے تھے۔ اس جگہ سے گزرتے ہوئے اس جوگی نے میری طرف دیکھا اور اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا تو ہم دونوں اس کے پاس آئے اس کی نظروں میں ایک عجیب طرح کی کشش تھی۔ اس نے نوید سے کہا۔ ''بیٹا تم جاؤ میرا اس سے کام ہے۔'' لہٰذا میں بیٹھا رہا۔

یہ سن کر نوید اٹھ گیا اور کچھ فاصلے میں کھڑا ہوگیا۔

جوگی نے کہا۔ ''تم کو ایک مسلمان لڑکی سے پیار ہوگیا ہے۔''

''کیا؟ آپ کو کیسے معلوم یہ بات تو میرے دل کو معلوم ہے بس میں نے آج دن تک کسی سے ذکر نہیں کیا۔''

''میں عام جوگی نہیں ہوں، میں تو چہرہ دیکھ کر اس کے دل کا حال معلوم کرلیتا ہوں۔'' جوگی بولا۔ ''کیا تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو اس کو اپنا بنانا چاہتے ہو۔''

''ہاں جوگی بابا۔ کیا کوئی راستہ ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں راستہ تو ہے مگر ہے مشکل اور خطرناک بھی۔'' جوگی نے کہا۔

''کوئی بات نہیں خطروں سے مقابلہ کرنا جانتا ہوں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ آپ حکم کریں۔''

''تم میرے لئے مسلمانوں کے قبرستان جاؤ اور وہاں سے کسی تازہ مردے کی قبر کھولو اور اس مردے کو جلاؤ اور اس کی راکھ میرے پاس لے کر آؤ پھر آگے کی بات بتاؤں گا۔'' وہ بولا۔

''نہیں یہ میں نہیں کرسکتا یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' میں نے خوف زدہ انداز سے کہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ میں بھی تمہاری مدد نہیں کرتا۔''

اس نے نوید کو اپنے پاس بلایا اور مجھے جانے کو کہا۔

نجانے اس نے نوید سے کیا معلوم کیا، پھر ہم دونوں شکار کے لئے جنگل کی طرف چل دیئے۔

نوید خاموش تھا کافی دور جا کر میں نے نوید سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے کیوں خاموش ہو تمہاری تو باتیں ختم ہی نہیں ہوتیں آج کیوں خاموش ہو؟''

''تم مجھ سے بات نہ کرو تو بہتر ہے ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گا۔''

''کیوں بھائی کیا ہوا میں نے ایسی کون سی بات کردی جس پر تم غصہ ہورہے ہو اور ہاں وہ جوگی کیا کہہ رہا تھا۔''

''تم نہ بتاؤ مجھے جوگی نے سب کچھ بتایا ہے کہ تم میری کزن سے محبت کرتے ہو اور اس کو پانے کے لئے تم مجھے قتل بھی کرسکتے ہو۔''

''یہ سب جھوٹ ہے وہ جوگی جھوٹ بولتا ہے میرا ایسا کوئی خیال نہیں ہے۔''

''نہیں یہ سچ ہے میں نے بھی کئی بار دیکھا ہے کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کرن پر نظر پڑتے ہی مسلسل اس کو ہی دیکھتے رہتے ہو تم کو اردگرد کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک ہے مجھے اس سے پیار ہے تو تم کیا کرلوگے۔'' میں نے کہا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر پڑا، میرے تو ہوش اڑ گئے پھر ہم دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔

لڑتے لڑتے جانے کب ہم اس پتھر کے پاس پہنچ گئے کہ اچانک میں نے نوید کا سر اس پتھر پر دے مارا اور نوید کا سر پھٹ گیا اس کا دماغ کھوپڑی سے نکل کر باہر آگیا۔ وہ مرچکا تھا اور میں بت بن کر کافی دیر کھڑا رہا جب کچھ ہوش آیا تو میں وہاں سے بھاگ نکلا جب میں اس جوگی کے پاس سے گزرا تو وہ کہنے لگا۔ ''شاباش بچے تم نے آدھا کام کرلیا ہے۔

"ڈرو نہیں میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا جاؤ اور اس لاش کو جلا کر اس کی راکھ میرے پاس لے آؤ تمہاری منزل تمہارے سامنے ہے، کرن تم کو مل جائے گی یہ لو ماچس۔"

میں نے اس کے ہاتھوں سے ماچس لی اور وہاں سے جنگل کی طرف چل دیا۔ پھر نوید کی لاش کو جلا دیا اور اس کی راکھ ایک کپڑے میں باندھ کر اس جوگی کے پاس لے آیا۔

جوگی نے کپڑوں سے بنی ہوئی ایک گڑیا نکالی اور اس پر سب راکھ انڈیل دی اور مجھے ایک پھول دیا اور کہا۔ "یہ پھول کرن کو دینا اگر اس نے قبول کر لیا تو ٹھیک ورنہ میرے پاس آ جانا۔"

میں پھول لے کر کرن کے گھر گیا تو جیسے کرن میرا انتظار ہی کر رہی تھی میں نے پھول پیش کیا تو اس نے قبول کر لیا اور کہا۔ "تم بہت اچھے ہو رام لیکن میں تم سے پیار نہیں کرتی مجھے تو نوید سے پیار ہے میں اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں، اس لئے میرا پیچھا چھوڑ دو اور ہمیں جینے دو۔"

میں نے کچھ نہیں کہا اور واپس اس جوگی کے پاس آ گیا۔ جوگی نے کہا۔ "اس نے پھول قبول کر لیا تھا کہ نہیں؟"

"ہاں پھول تو قبول کر لیا تھا مگر اس نے کہا کہ "وہ مجھ سے پیار نہیں کرتی وہ نوید کو پسند کرتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں نوید تو مر گیا ہے۔" جوگی بولا۔

"ہاں لیکن اس کو ابھی معلوم نہیں تھا۔ اس کو کیا کسی کو بھی معلوم نہیں کہ اس کو میں نے قتل کر دیا ہے۔"

"اب میں کیا کروں کسی کو معلوم ہو گیا تو میرا کیا ہو گا۔"

"کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ اس جنگل میں کوئی نہیں جاتا اور تو اور تم نے اس کی لاش جلا دی ہے اب ایسا کرو کہ قبرستان جاؤ بلکہ ابھی نہیں رات کو جانا اور آج جولڑ کا فوت ہوا ہے اس کی قبر کھود کر اسے جلانا اور راکھ میرے پاس لے کر آنا۔"

حکمت و دانش

مہمان کے واسطے زیادہ خرچ کرو کیونکہ یہ اسراف میں سے نہیں۔

کم کھانا تمام بیماریوں کا علاج ہے اور شکم سیری بیماری کی جڑ ہے۔

جب معدہ بھر جائے تو قوت فکر کمزور پڑ جاتی ہے اور حکمت و دانش کی صلاحیتیں گونگی ہو جاتی ہیں۔

تمہارے واسطے خیر یہی ہے کہ شر سے باز رہو۔

زبان کی حفاظت کرو کیونکہ یہ بہترین خصلت ہے۔

سچائی کی مشعل سے فائدہ اٹھاؤ اور یہ مت دیکھو کہ مشعل بردار کون ہے۔

حق کا پرستار کبھی ذلیل نہیں ہوتا چاہے سارا زمانہ اس کے خلاف ہو جائے۔

باطل کا پیروکار کبھی عزت نہیں پاتا چاہے چاند اس کی پیشانی پر نکل آئے۔

(حافظ علی-ملیر کراچی)

میں نے ایسا ہی کیا اس کے بعد یہ عمل میں نے کئی دفعہ کیا اور کسی کو معلوم نہیں پڑا کیونکہ میں اسی طرح سے دوبارہ قبر بند کر دیتا تھا۔

کئی مہینوں کے بعد تک نوید کا کچھ پتا نہ چلا تو کرن ایک پیر بابا کے پاس گئی تو پیر بابا نے عمل کر کے بتایا کہ نوید اب اس دنیا میں نہیں ہے اور اس کو قتل کر دیا گیا ہے اس کے دوست نے تمہاری خاطر قتل کیا ہے اور وہ مسلسل ظلم کر رہا ہے ایک ہندو جوگی کے کہنے پر وہ مسلمانوں مردوں کو قبر سے نکال کر جلا رہا ہے اس کو روکو ورنہ وہ جوگی بہت طاقتور بن جائے گا کیونکہ وہ صرف اس کو استعمال کر رہا ہے اپنی طاقت بڑھانے کو وہ جوگی بہت خطرناک مقصد لے کر آیا ہے۔"

کرن نے کہا۔ "وہ کیا کر سکتی ہے تا کہ وہ اس سے نوید کا بدلہ لے اور اس جوگی کو بھی ناکام کرے۔"

"بنی تم کسی طرح سے رام لال کو میرے پاس لے آؤ۔" پیر بابا بولے۔

اس دن میں کرن سے ملنے گیا تو وہ مجھ سے خوشی سے ملی میں سمجھا کہ جوگی کا عمل کام کررہا ہے اور اس نے کہا کہ "اگر تم مجھے چاہتے ہو تو مسلمان ہوجاؤ آؤ میرے ساتھ پیر بابا کے پاس چلتے ہیں۔" میں نے اس کی بات مان لی۔

وہ مجھے پیر بابا کے پاس لے آئی۔

پیر بابا نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک برتن سے کچھ خشک کھجور نکال کر مجھے دی اور کہا "اس کو کھاؤ۔" میں نے فوراً وہ کھجور کھائی تو میرے ہوش اڑ گئے میں بے ہوش ہوگیا۔

نجانے کتنی دیر بعد ہوش آیا تو وہاں کرن نہیں تھی میں وہیں پر پڑا تھا اور وہ پیر بابا کوئی عمل پڑھ رہے تھے جیسے ہی میں نے حرکت کی تو وہ بولے۔

"رام لال کرن تمہاری کبھی نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ نوید کو تم نے قتل کیا ہے۔ اور تم مسلمان بھی نہیں ہونا چاہتے اور تو تم نے بہت سے گناہ کئے ہیں جس کا انسانی تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ملتا تم درندہ صفت ہو، ایک خونخوار جانور بن گئے ہو، اور جوگی کے دھوکے میں آگئے ہو وہ تم کو استعمال کرکے اپنا مقصد پورا کرنا چاہتا ہے وہ لمبی زندگی جینے کا خواہش مند ہے اس لئے وہ اپنا بت بنا کر اس پر مردوں کی راکھ مل رہا ہے۔ وہ تم کو بھی ماردے گا۔"

میں پیر بابا کی باتیں سن رہا تھا لیکن میرا ہاتھ حرکت کررہا تھا جلد ہی ایک پتھر میرے ہاتھ میں آگیا۔ وہ پتھر میں نے جلدی سے پیر بابا کے سر پر دے مارا اور مسلسل پتھر مارتا رہا یہاں کہ وہ بھی مر گئے، میں جلدی سے وہاں سے نکلا اور کرن کے گھر کی طرف چل پڑا۔

یہ کیا کرن کے گھر سے رونے کی آوازیں آرہی تھیں معلوم کرنے سے پتا چلا کہ کرن نے خودکشی کرلی ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر اس دنیا سے چلی گئی ہے۔

میں تو جیسے پاگل ہی ہوگیا تھا۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ اتنے گناہ کئے ہیں ایک اور گناہ کرلو اس جوگی بابا کو بھی ماردو میں بھاگ کر جوگی بابا کے ڈیرہ پر پہنچا تو وہ بہت سے سانپ کو بین سنا رہا تھا جوگی بابا کی آنکھیں بند تھیں سانپ اس کی سریلی بین کے آگے مست ہوئے جارہے تھے میں نے ایک طرف پڑا ڈنڈا اٹھایا اور جوگی بابا کے سر پر مارا تو اس کے سر سے خون نکلنے لگا اور درد سے اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ "کم بخت کیا کررہا ہے۔"

لیکن میں نے اس کی بات نہیں سنی اور مسلسل ڈنڈے سر پر برساتا رہا اور میں کہہ رہا تھا کہ "تم نے ہی میری کرن کو مارا ہے صرف تیری وجہ سے وہ مری ہے۔"

جلد ہی وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

جب میں نے وہاں سے نکلنا چاہا تو میں ایسا نہ کرسکا کیونکہ اب میرے اردگرد بہت سے سانپ تھے، میں اس جنگل کی طرف بھاگ نکلا وہ سانپ مسلسل میرا پیچھا کررہے تھے یہاں تک کہ میں اس پتھر کے پاس پہنچ گیا اور اس پتھر پر چڑھ گیا سانپ میرے اردگرد کھڑے ہوگئے۔

اچانک اس طرف سے ایک روشنی ہوئی اور ایک سفید بالوں اور بڑی سفید داڑھی والے بزرگ نظر آئے انہوں نے کہا۔ "رام لال تم نے بہت گناہ کئے ہیں جس کی سزا کبھی نہیں ختم ہوگی آج سے یہ سانپ تجھے رات بھر ڈسیں گے اور دن کو تیری روح تیرے جسم سے نکال لی جائے گی، دن میں تیری روح کو سخت سزا ملے گی اور رات کو تیرے جسم میں واپس آجائے گی پھر تیرے جسم کو ساری رات سزا ملتی رہے گی، یہ تیری مسلسل سزا ہے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوگی۔ تیری مدد کوئی نہیں کرسکتا۔"

یہ کہہ کر پھر وہ غائب ہوگئے اور سانپوں نے اپنا کام شروع کردیا، وہ مسلسل مجھے ڈس رہے تھے اور میں مسلسل چیخ رہا تھا۔

یہ عمل ساری رات رہا اور دن ہوتے ہی میری آتما میرے جسم سے نکل گئی۔ چالیس سالوں سے مسلسل یہ سزا میری جاری ہے ان چالیس سالوں میں تم پہلے آدمی ہو جس کو میری سزا کے بارے میں پتا چلا ہے تم میری مدد کروگے ناں...... تمہیں میں تمہارے خدا کا

واسطہ دیتا ہوں۔

میری مدد کرو۔"

"میں کیا کرسکتا ہوں تمہارے لئے۔" میں نے کہا۔

"تم میرے جسم کو جلا دو تاکہ مجھے اس سزا سے نجات ملے۔" وہ بولا۔

"لیکن تم تو ابھی زندہ ہو۔" میں نے کہا۔

"میں زندہ کہاں ہوں رات میں زندہ دن کو مردہ ہو جاتا ہوں اب مجھ سے یہ سزا برداشت نہیں ہوتی بھگوان کے لئے میری مدد کرو۔ مجھے اس مسلسل سزا سے نجات دلا دو مجھے جلا دو۔" وہ بولا۔

پھر میں نے بہت سی لکڑیاں اکٹھی کیں تو اس نے کہا۔ "ان لکڑیوں کو میرے اوپر ڈالو، میں حرکت نہیں کرسکتا، میں وہاں تک کیسے جاؤں گا۔"

تو میں نے ایسا ہی کیا میری جیب میں ماچس تھی کوشش کرنے لگا اور جلد ہی آگ نے لکڑیوں کو پکڑ لیا اور رام لال مسلسل چیخ رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا اور لکڑیاں ڈالو۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پھر وہ پوری طرح سے جل گیا اور اس کی راکھ ہوا میں اڑنے لگی۔ اور میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی اور پھر گھر آ کر سانس لی رات کیونکہ کافی ہوگئی تھی اس لئے سب سو رہے تھے میں بھی سو گیا۔

صبح پھر میں دو بکریاں لے کر شہر کو چل دیا۔

اس جگہ سے گزرتے ہوئے خیال آیا کہ اس پتھر کو دیکھ کر جاتا ہوں ابھی صبح ہے۔ کیا اس کی سزا سے اس کو نجات ملی ہے کہ نہیں۔

جلد ہی میں وہاں پہنچ گیا۔ "ارے یہ کیا، رام لال کا جسم صحیح سلامت! اس پتھر پر پڑا تھا۔

تو کیا اس کی سزا ختم نہیں ہوئی خیر میں نے کچھ نہیں کیا اور شہر آ گیا، شہر آ کر میں نے دونوں بکریاں فروخت کیں اور مسلمانوں کے ایک محلے میں چلا گیا وہاں معلوم کرنے پر پتا چلا کے قیوم نام کا ایک آدمی جس کی بازار میں دکان ہے وہ کپڑے کا کاروبار کرتا ہے۔

خیر میں اس کی دکان پر پہنچ گیا اور سلام دعا کے بعد میں نے کہا "میرا نام امجد ہے آپ وہی قیوم صاحب ہیں جن کی چالیس سال پہلے نوید اور رام لال سے دوستی تھی۔"

"ہاں میں وہی قیوم ہوں آپ کو کیسے معلوم، آپ کی عمر تو ابھی بیس سال معلوم ہوتی ہے۔" وہ بولے۔

"اچھا وہ دونوں کہاں ہیں آپ کو پتا ہے اور کرن جو نوید کی کزن تھی وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دونوں تو اچانک غائب ہی ہوگئے تھے ہم نے ان کی بہت تلاش کی لیکن کچھ پتا نہیں چلا کرن نے نجانے کیوں خودکشی کرلی تھی۔" وہ بولے۔

"نوید کو چالیس سال پہلے رام لال نے قتل کردیا تھا اور کرن کو اس بات کا علم ہوگیا تھا اس لئے اس نے خودکشی کرلی کیونکہ وہ نوید سے بہت محبت کرتی تھی رام لال ایک جوگی کے چکر میں آ گیا تھا اس نے مسلمانوں کے مردوں کو قبروں سے نکال کر جلاتا تھا جس کی سزا اس کو آج تک مل رہی ہے۔ وہ نہ اب زندوں میں ہے اور نہ ہی مردوں میں ہے وہ زندہ لاش ہے۔ جس کو مسلسل سزا مل رہی ہے اس کے گناہوں کی۔" میں نے بتایا۔

"لیکن تم کو یہ کیسے معلوم؟" وہ بولے۔

"میری اس سے ملاقات کل ہوئی تھی اس نے خود اپنی ساری کہانی مجھے سنائی اور کہا کہ میری لاش کو جلا دو۔" میں نے ایسا ہی کیا لیکن آج صبح میں اس کو پھر ٹھیک ٹھاک دیکھ کر آ رہا ہوں جیسے رات کو کچھ ہوا ہی نہیں۔

اچھا اب مجھے اجازت دیں رات بھی ہونے والی ہے اور میرا سفر کافی دور کا ہے۔ مجھے اس کی کہانی پر یقین نہیں آ رہا تھا اس لئے میں آپ کے پاس آیا تھا کہ سچ بول رہا ہے کہ نہیں نوید اور کرن کے لئے اب آپ دعا کریں کیونکہ نوید کو بھی اس کم بخت نے جلا دیا تھا۔"

میں وہاں سے نکلا اور اس راستے پر چل دیا، اس جگہ پہنچ کر مجھے پھر رام لال کی چیخ سنائی دی وہ کہہ رہا تھا۔ "میری مدد! کوئی نہیں کرسکتا! یہ سزا میری تو مسلسل سزا ہے، جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔" اس کی فلک شگاف چیخیں بیابان کو دہلا رہی تھیں۔ اور میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے کو بڑھتا رہا۔

عشق ناگن

قسط نمبر: 14

ایم الیاس

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

ان سب کی رفتار یکساں تھی اور ان کے انداز میں گہری طمانیت تھی۔ پھر خاصی مسافت طے کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔ وہ ہڑبڑا سا گیا اور اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کی نبضیں ڈوبنے لگی ہوں۔ سمندری گپھا سے نکل کے جل منڈل میں پہنچنے کے بعد اس کے علم میں یہ تو آچکا تھا کہ جل منڈل ایک بہت بڑے اور پراسرار سمندری غار کا دوسرا نام ہے۔ جس میں سمندر کا چنگھاڑتا ہوا غضب ناک پانی بھی داخل نہیں ہوتا لیکن اس نئے مقام پر آ کر اس غار کی وسعت کے بارے میں اس کے تمام اندازے بالکل ہی غلط ثابت ہوئے۔ یہ غار اس قدر بلند اور کشادہ تھا کہ اس کی چھت دھندلائے پتھروں اور چادر معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے اردگرد تاحد نظر بے شمار وحشی جل ناگ پتھریلی زمین پر کلبلاتے اور رینگتے رہے تھے۔ ان کے پھولے ہوئے بدوضع دہانوں اور پھنوں سے یوں دبی دبی اور سنسناتی ہوئی آوازیں نکل رہی تھیں، جیسے ان کے پھولے ہوئے جسموں میں چونے کی دلدلیں آہستہ آہستہ کھول رہی ہوں۔ ان کے انداز میں خوف آمیز عقیدت اور ان کے خود سرد بے چین جسموں میں دہشت کا ٹھہراؤ رچا ہوا تھا۔ جیسے وہ کسی نظر نہ آنے والی لاہوتی ہستی کے قہر و غضب سے خوف زدہ ہوں۔

جل ناگوں کے اس بیکراں ہجوم کے وسط میں اسے ایک بہت ہی گہری سی کھائی نظر آئی تھی جس میں ایک خوف ناک الاؤ دہک رہا تھا۔ غالباً اس کھائی کو جل کماری نے اس سے اگن کنڈ کہا تھا۔ اگن کنڈ سے اٹھنے والے شعلوں نے کافی بلندی پر ایک بہت ہی ہیبت ناک کا روپ دھارا ہوا تھا۔ ناگ کی صورت میں یہ شعلے بل کھا کھا کے سینکڑوں فٹ کی بلندی تک اٹھ رہے تھے...... اور بار بار یوں لہریں لے رہے تھے جیسے آگ اور شعلوں کا بنا ہوا وہ ناگ اپنے بدن کو جیسے جنبش دے رہا ہو۔ کبھی اس کا خوفناک پھن سکڑنے لگتا اور کبھی سرخ شعلوں کی ایک مہیب چادر کی صورت میں پھیلنے لگتا تھا۔

وہ ہراساں اور حیران اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ البتہ ایک خیال اس کے ذہن میں اسی وقت فرار ہونے کا کیوں نہیں آیا کہ اس مقام سے بھاگ جانا چاہئے؟ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ کامیاب ہو جائے۔

اس کے ذہن میں سنگیت کی بتائی ہوئی تفصیلات گردش کر رہی تھیں کہ ناگوں کی ہر نسل میں اگن دیوتا کی

پوجا ہوتی ہے اور جل ناگوں کی دھرتی جل منڈل میں وہ اگن ناگ کی صورت میں درشن دیتا ہے۔ جب شعلوں کو ناگ کا روپ دھارتے تیں پہر گزر جاتے ہیں تو درشن کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں اور اگن کنڈ میں ہمیشہ سے جلتی ہوئی پراسرار آگ سے نکل کے زندہ اگنی ناگ کھلے میدان میں آجاتا ہے اور جس کی بھینٹ دینا ہو اسے کیر کی پتیوں سے بے سدھ کرکے اگنی ناگ کے سامنے ڈال دیا جاتا ہے۔ اور اگنی ناگ اسے فوراً ہی اس بھینٹ کو قبول کرلیتا ہے۔

آکاش پر خوف اور ڈر اور دہشت مسلط ہوگئی تھی۔ اس کا جسم ایسا لرز رہا تھا۔ جیسے لرزے کا مریض ہو۔ اس کے جسم پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ اور پھر اس کی تھکی تھکی نظریں گردوپیش کا بے مقصد جائزہ لے رہی تھیں کہ معاً اس کی نگاہ جل کماری پر پڑی جو ایک باریک لبادے میں ملبوس تھی جس نے اسے اور بے حجاب اور بے نیام تلوار کی مانند کردیا تھا جس سے اسے اپنے بدن میں حرارت محسوس ہوئی۔ اور اس نظارے نے اس میں توانائی پیدا کردی۔ کیوں کہ اس کا ذہن بٹ گیا تھا اور دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہوگیا۔ اب اسے نہ تو بھوک پیاس تھی اور نہ ہی ڈر اور خوف اور دہشت...... جل کماری نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی۔

اس کے خیال میں اس سارے فساد اور فتنوں کی جڑ جل کماری تھی۔ لیکن خون آشام جل ناگوں اور پراسرار اگن کنڈ کے ہیبت ناک شعلوں کے اس اجنبی انبوہ میں وہ واحد انسانی صورت نظر آئی تھی جس نے اس کے دل کو ایک عجیب وغریب کیف وسرور بخشا تھا۔ اس وقت وہ اس جل کماری کے سحر میں سب کچھ بھول کے اس کے قدم مشینی انداز میں جل کماری کی طرف اٹھنے لگے۔ زمین پر رینگتے، وندناتے اور کلبلاتے ہوئے جل ناگ بڑی مہارت اور چابک دستی سے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کے لئے زمین پر جگہ دیتے جارہے تھے۔

وہ خاصا فاصلہ طے کرکے دہکتے ہوئے جہنمی شعلوں والی کھائی کے قریب کھڑی ہوئی جل کماری کے پاس پہنچا تو اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی اور بھڑکتے شعلوں کے انعکاس میں اس کے رخسار اناروں کی طرح دہک رہے تھے۔

''بھوجن کرلو۔'' جل کماری نے نفرت اور نفرت کے ساتھ زمین پر پھیلی ہوئی تھالیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

اگن پوجا کے دہشت ناک مناظر اور موت کے خوف اور جل کماری جس حالت میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے باعث اس کے شعور سے بھوک پیاس اور اپنی کلائی کے زخم کی تکلیف کا ہر احساس یک سر زائل ہوچکا تھا۔ لیکن جب جاروں کی بڑی بڑی تھالیوں میں چنے ہوئے بھانت بھانت کے ان اشتہا انگیز کھانوں پر نظر پڑی تو یک بیک اسے احساس ہوا کہ اس کی انتڑیاں ناقابل برداشت اینٹھن ہورہی ہیں۔ کیوں کہ تھوڑی دیر بعد موت جو اس کے لئے اٹل بن چکی تھی اور وہ بس اب تھوڑی ہی دیر کا مہمان تھا اس لئے اس نے سوچا کہ کیوں نہ آتش شکم کو سرد کرکے موت سے قبل اذیت سے نجات پالے تاکہ کتے کی موت مرنے سے تو بچ جائے......؟

وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اپنے آپ کو قوت ارادی سے تھالیوں کے قریب لے گیا اور اس نے تھالیوں میں جھانکا۔ ان میں بیشتر جو کھانا چنا ہوا تھا وہ انسانوں کے کھانوں کا لگتا ہی نہیں تھا اور ناقابل شناخت تھا۔ وہ ناگوں کی نسل کے لئے مرغوب تو ہوسکتا تھا۔ اس نے کبھی ایسا کھانا کبھی حیوان کو بھی کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک ایک تھالی دیکھتا گیا۔ دو درجن سے زیادہ تھالیاں تھیں۔ پھر وہ ایک تھال کے پاس رک گیا۔

اس تھال میں گاڑھے دودھ میں تیرتی ہوئی سویاں تھیں۔ اس نے سویوں کو جیسے ہی منہ میں رکھا اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے سارے جسم میں جان پڑگئی ہو اور کھوئی ہوئی توانائی اور طاقت لوٹ آئی ہو۔ وہ سویاں اس کی زبان پر رینگنے لگی ہوں۔ اس نے ایک ثانیے کے

نے اسے اپنا نام بتایا تھا۔ لیکن فوراً ہی کیفیت مختلف ہوگئی۔ اس کے منہ میں بھری تمام سویوں نے سنپولیوں کا روپ دھار لیا تھا۔ اور رینگ رینگ کے حلق میں اتر رہی تھیں۔ اس کے منہ میں سویوں کا کوئی وجود ہی نہیں رہا تھا۔

اس نے ایک زوردار تحیر زدہ اور خوفناک چیخ ماری انہیں تھوک دینے کی کوشش کی جو زندہ سنپولیے جونکوں کی طرح زبان سے لپٹے ہوئے تھے۔ اسے ابکائی سی بھی محسوس ہوئی تھی۔ انتہائی کراہیت جو ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ منہ میں ڈال کے وہ زندہ سنپولیے کھینچ لینے چاہے لیکن اس کی یہ کوشش بے سودی رہی۔ وہ رینگ رینگ کے اور آہستہ آہستہ اس کے حلق سے نیچے اتر گئے اور اسے اپنے سینے میں منوں بوجھ سا محسوس ہوا۔ اسے منکا کا خیال آتے ہی فوراً ہی منہ میں رکھ لیا۔ لیکن سینے میں جو جلن ہو رہی تھی اور بوجھ تھا اس میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور وہ بڑھتا گیا تھا۔

”یہ اگن ناگ کی پوجا کا استھان ہے یہاں تمہارا منکا کچھ نہ کرسکے یہ حقیر اور بیکار شے ہے۔ اسے کچرے میں پھینک دو۔ اب وہی ہوگا جو اگن ناگ چاہے گا۔“ جل کماری کے یہ الفاظ سن کے اس نے جل کماری کی طرف دیکھا جو وہ اپنے دونوں کمرے پر رکھے سنجیدگی کے ساتھ اس کی نگرانی کا سا انداز تھا کہ کہیں وہ فرار نہ ہوجائے۔ اس لئے اس کی آکاش پر کھری نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔

آکاش بری طرح نروس ہوچکا تھا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے قے کرانے کی کوشش کرنے لگا تاکہ اس کے کلیجے سے سارے زندہ سنپولیے باہر جائیں۔ لیکن قے نہ ہوسکی تو اس نے منہ میں انگلیاں ڈال کے حلق تک ڈال دیں۔ لیکن پھر بھی قے نہ ہوسکی تھی۔

”اگن دیوی کی یہی اچھا ہے کہ پوجا کا بھوجن تیرے پیٹ میں نہ جاسکے۔“ جل کماری نے اس کا ہاتھ تھام کے اسے سیدھا کھڑا کیا۔ تو اب ان سنپولیوں کو باہر نہ نکال سکے گا۔ یہ ڈھیرے ڈھیرے تیرے اندر کی ہر چیز کو چاٹ جائیں گے۔“

وہ جل کماری کے اشارے پر سیدھا کھڑا ہوگیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگ اس کی زبان گنگ ہوچکی تھی۔ بدن پر رعشہ مسلط ہوچکا تھا۔ خوف و کراہت سے رواں رواں کانپ رہا تھا...... نگاہوں میں رحم کی التجا بصورت تصویر ثبت ہوکر رہ گئی تھی۔ اور سارے مساموں سے ٹھنڈے پسینے کی دھاریں بہہ نکلی تھیں اور جسم سن سا ہوگیا تھا۔ اپنی جان کھو رہا تھا۔

ایک اور عجیب سی بات اس نے جو محسوس کی تھی کہ جل کماری کو اتنا قریب پاکر نہ تو اس پر غصہ آیا اور نہ ہی اس سے کوئی نفرت محسوس ہوئی۔ اس کے دماغ میں بس ایک ہی خیال سمایا ہوا تھا کہ اس وقت اس کی زندگی اور موت کے درمیان جل کماری کا ایک اشارہ حائل ہے۔ وہ اس وقت اس مصیبت معیت کی کٹھن لمحات میں اس ہستی کو فراموش کرچکا تھا جو مارنے والے سے بچانے والا تھا۔ جس نے زمین آسمان کے سارے جہاں اور کائنات بنائی تھی جس کے صرف اشارے پر ہر وہ معجزہ ہوسکتا ہے جس کا خواب و خیال تک میں آنا ممکن نہیں۔ ”اب تم یہ پتیاں دونوں ہاتھوں میں بھر کے انہیں سونگھنا شروع کردو۔“ جل کماری نے کٹی پھٹی سبز پتیاں کے ایک ڈھیر کی اشارہ کرتے بڑے میٹھے اور پیار بھرے لہجے میں کہا جو خلاف معمول سا تھا اور اسے تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھا تھا۔ جن میں خود سپردگی بھی تھی۔

اس لمحے بے اختیار اسے سنگیت کے یہ الفاظ یاد آگئے تھے اس نے بتایا تھا کہ اسے بھینٹ سے کنیر کی پتیوں سے بے سدھ کردیا جائے گا۔

دھرتی کے سینے میں صدیوں سے دہکتی آگ کے شعلے جو جہنمی تھے اگن ناگ کا آتشیں پیکر دھارے بار بار اس کی جانب چمک رہے تھے اور آہستہ آہستہ اس پر تنودیمی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ دماغ سوچنے سمجھنے سے معذور ہوتا جا رہا تھا اور یقین موت کے تصور نے اس کے سارے بدن سے ساری طاقت گیلے

کپڑے کی طرح نچوڑ لی تھی وہ جل کماری کے حکم کو نظر انداز کرتے ہوئے بے حس و حرکت بیٹھا آنکھیں پھاڑے اگن کنڈ سے بلند ہونے ہولناک شعلوں کو بے بسی سے دیکھتا رہا۔ ایک ٹک گھورتا کانپتا رہا تھا۔

جل کماری نے اسے پھر دوبارہ کنیر کی پتیاں سونگھنے کی ہدایت کی اور اس نے کسی بے بس معمول کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں میں خشک پتیاں بھر لیں۔ نہ جانے وہ کنیر کی کون سی قسم تھی کہ ان پتیوں کو ناک سے قریب لاتے ہی اس کے بدن میں تیز سن سناہٹ دوڑنے لگی۔ لیکن اس کیفیت میں ہلکا سا سرور اور خمار سا بھی شامل تھا جس نے اس پر مدہوشی سی طاری کردی تھی۔ اس نے چند گہرے گہرے سانس لئے کیوں کہ اسے ایک عجیب طرح کی فرحت سی دوڑنے لگی تھی لیکن دوسرے لمحے اس کا سارا بدن حرکت کرنے سے معذور ہوگیا تھا جیسے یہ انہونی تھی جس نے بے جان کردیا تھا۔ اس کی حالت ایک معذور کی سی ہوگئی تھی۔

اس کے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ لیکن کان سن ہورہے تھے۔ آنکھیں دیکھ تو رہی تھیں لیکن وہ ہلنے جلنے سے معذور ہو چکا تھا۔ اس کی زبان میں ایسی سنسناہٹ تھی جیسے اس پر ورم آگیا ہو۔ اس کیفیت کے باعث میں وہ بولنے سے بھی قاصر تھا۔ اس کی قوت گویائی مفلوج ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ایک مردے سے بدتر ہوتا جارہا تھا۔ وہ بھلا مر کیوں نہیں جاتا ہے۔

جل کماری نے اس کی پشت پر اس کی بغلوں میں ہاتھ دیئے تو اس کے پرشباب بدن کا گداز کالمس بھی اس کے لئے بے حس رہا۔ وہ یہ سمجھا تھا کہ شاید اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی ہے۔ یہ اس کی خود فریبی تھی۔ اسے اٹھا کے اگن کنڈ کے قریب صاف اور سطح زمین پر بیٹھا دیا۔ ایک طرح سے اسے موت کے منہ سے اور قریب کردیا تھا۔

اس نے سر گھمانا چاہا تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اس وقت وہ اپنی پتلیوں کو اپنی مرضی سے صرف حرکت دے سکتا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے زمین پر رینگتے ہوئے جل ناگ اب کم زور اور سست پڑتے جارہے تھے۔ جیسے آنے والے لمحات کی دہشت ان کے جسموں سے قوت سلب کرتی جارہی ہو۔ ان کی ہلکی ہلکی پھنکاروں سے خشک سمندر گھپا کے اس وسیع حصے میں ایک ہم آہنگ لاہوتی گونج پیدا ہورہی تھی جس میں اسے نزع کی سی اذیت رچی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔

یوں تو وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا لیکن عمل کی ہر قوت سے محروم تھا۔ اس کیفیت میں جل کماری اپنے دل آویز نسوانی پیکر میں اس کے سامنے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کے چہرے پر ابدی سکون کا ایک گہرا پرتو چمک رہا تھا۔ اس کی غزالی آنکھوں میں طمانیت کا ایسا خمار چھایا ہوا تھا جیسے اس نے کوئی بڑا معرکہ سر کرلیا ہو اور اس پر کسی بدلی کی طرح برسنے والی ہو۔

وہ چند ساعتوں تک اسے من میں بسا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر اس کے گلے میں اپنی مرمریں عریاں گداز اور سڈول بانہیں حمائل کرکے اس کے چہرے پر جذباتی انداز سے تھوری دیر تک جھکی رہی...... پھر اس سے الگ ہو کے پرنام کیا۔ جل کماری میں یہ اچانک غیر معمولی تبدیلی اس کے لئے غیر متوقع تھی جو وہ سمجھ نہیں سکا تھا کہ یہ کیا اسرار ہے......؟ کیا اسے رحم آگیا ہے۔ لیکن دوسرے لمحے آکاش کی یہ خوش فہمی دور ہوگئی۔ دوسرے لمحے وہ دونوں ہاتھ پیشانی تک لے گئی...... پھر اس کے روبرو کھڑی ہو کے جھکی اور ایک وحشیانہ سرعت کے ساتھ سیدھی ہوگئی اس کے خوب صورت گداز ہاتھ جنبش میں آئے اور اس نے اپنے ترغیب آمیز جوان کے ہر انگ انگ کو اس طرح سے آزاد کردیا کہ مستی ابلی پڑنے لگی اور پھر بے حجابانہ انداز سے ان کی نمائش کرنے لگی۔

اس وقت تک زمین پر رینگتے اور کلبلاتے ہوئے سارے جل ناگ یوں بے حس و حرکت ہو چکے تھے جیسے وہ موت کے منہ میں جاچکے ہوں۔ ان کی زندگی کا بس ایک ہی تھا کہ ان کے بڑے بڑے دہانوں سے دبی دبی اور سہمی ہوئی ہم آہنگ پھنکار ہی نکل رہی تھیں۔ جل

کماری نے رقص کے انداز میں کسی نامعلوم چیز سے بھرے چاندی کے دو تھال اپنے ہاتھوں پر اٹھانے اور اس کے گرد چکر لگانے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ بھینٹ سے قبل کی رسوم شروع ہو چکی ہیں۔ اور ذرا ہی دیر میں اگن ناگ شعلوں کے جہنم سے غورلہ ہو کے اس کے بدن کو چاٹ لے گا۔

جل کماری نے سات چکر پورے کرنے کے بعد دونوں تھالی اگن کنڈ میں اچھال دیئے اور یک بیک وحشیانہ انداز میں اس کے سامنے ناچنے لگی۔ جل کماری کا یہ رقص وہ دیکھنے لگا۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

وہ بے حجابی کی سی حالت میں کسی ماہر رقاصہ کی طرح ناچ رہی تھی۔ یہ رقص کیا تھا ایک مرد کے جذبات ابھارنے کے لئے لگتا تھا۔ اس رقص میں اس کے پس پشت یقیناً کوئی ایسی چیز ضرور تھی جو اسے محظوظ کرنے کے بجائے دہشت زدہ کر رہی تھی۔

ایک مرتبہ فضا میں اڑنے والے اگن ناگ کی شکل کے شعلوں نے کسی کمان کی طرح بل کھایا تھا اور اس آتشیں ناگ کا پھل جل کماری کے بدن کو چھوتا دوبارہ اوپر اٹھ گیا۔ اس کے بعد تو جل کماری کے بدن میں بجلی سی بھر گئی اس کے لئے نظریں جمانا محال ہو گیا۔ اس کے بال آپ ہی آپ کھل کے فضا میں لہرانے لگے۔ اس کی خشمگین آنکھوں میں ایک عجیب خوفناک آشفتگی اور آئی اور ہونٹوں سے سفید سفید جھاگ اڑنے لگے۔

پھر اسے ایسا لگا جیسے جل کماری کا دودھیا گداز بدن یک لخت برف کی طرح پگھل گیا۔ ایک ساعت کے ہزارویں حصے میں اس کے نسوانی پیکر نے ایک لحیم شحیم جل ناگ کا سا روپ دھار لیا۔ لیکن اپنے اصل روپ میں آتے ہی جل کماری اس طرح ساکت ہو گئی جیسے دوسرے جل ناگ بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ اس کا سراپا اور نشیب و فراز بڑا پرکشش اور قیامت خیز ہو گیا تھا۔

یہ کیفیت اور ہیجان خیز غیر یقینی ٹھہراؤ ذرا ہی دیر قائم رہا۔ پھر اگن کنڈ میں ایک مہیب تڑاخے کی آواز کے ساتھ شعلوں میں غیر معمولی لپک پیدا ہوئی۔ اس کے بعد اس نے جو کچھ بھی دیکھا وہ بلاشبہ ایک ناقابل یقین حقیقت تھی۔ ایک ہولناک اور پراسرار واقعہ اس کے سامنے پیش آیا تھا۔ دہکتے انگاروں کی طرح چمکتے ہوئے روغنی بدن والا ایک پرجلال اور ہیبت ناک ناگ اس اگن کنڈ کے وسط سے بل کھاتا آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔

اب باہر فضا میں آتشیں ناگ کی طرح لہرانے والے شعلے بکھر چکے تھے۔ ان کی مخصوص شبیہہ نشر ہو چکی تھی اور اب ان کا کوئی نام و نشان جیسے نہیں رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آگ سے باہر آنے والا اگن ناگ کے روپ میں اگن دیوتا ہی ہے جو سانپوں کی ہر نسل میں پوجا جاتا ہے اور ہزاروں برس کے بعد جل منڈل کے باسیوں کو اپنے درشن دیتا ہے۔ یہ روایت جو ازل سے جیسے چلی آ رہی ہو اور دنیا کے ختم ہونے تک جاری رہے گی۔

اگن ناگ کی بڑی بڑی بے حد سرد سفاک اور بے رحم آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں اور اس کا دل حلق میں بری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ اس کی گول گول آنکھوں کی سرخی اسے کسی دیومالائی سرد آگ کی یاد دلا رہی تھی۔ وہ اس کی جانب دیکھتا، گھورتا اور اپنی آنکھوں میں جذب کرتا ہوا بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے ہوش و حواس تیزی کے ساتھ اس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اگن ناگ کی مسمراتی آنکھیں کسی نادیدہ طلسم کے تحت اس کے جسم کی ہر اعصابی اور فکری قوت کو تیزی سے سلب کر رہی ہوں۔

اگن ناگ کتنا طویل تھا اور اس کی جسامت کیا ہو گی وہ آج تک بتانے سے قاصر تھا۔ اس وقت تو وہ جیسے دہکتے شعلوں میں سے باہر آتا جا رہا تھا۔ اگن کنڈ میں بھڑکتی ہوئی آگ کی شدت ماند پڑتی جا رہی تھی۔

جب تک اس کے حواس نے ذرا بھی ساتھ دیا وہ اسے اس آگ سے باہر آتے دیکھتا رہا۔ اس کی رسی جیسی موٹی موٹی زبانیں بڑی بے چینی سے باہر نکلی پڑتی جا رہی تھیں۔ جس وقت وہ تقریباً ساٹھ ستر فٹ آگ سے باہر آ چکا تو اس کے بدن کی ہر قوت ختم ہو کے رہ گئی

تھی۔ اور نگاہوں کے سامنے اگن ناگ کی وہ بڑی بڑی سرد سفاک، بے رحم اور خونیں آنکھیں چمکتی رہ گئیں۔

وہ شاید کوئی ترغیب ہی تھی جس کے تحت وہ دوبارہ جنبش کرنے اور محسوس کرنے کے قابل ہوسکا تھا۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو اپنے داہنے پیر کے انگوٹھے کے بل سیدھا کھڑا پایا۔ اس کا بایاں پیر اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے اور پورے بدن کے انگ انگ میں ناقابل بیان سختی چھائی ہوئی تھی۔

اس کے سامنے اگن ناگ کنڈل مارے کسی سرخ الاؤ کی مانند بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا کوئی سو گز لمبا بدن کنڈل کی صورت میں اس کی نگاہوں کے سامنے تھا اور اس کے بدن کا بقیہ حصہ ابھی تک اگن کنڈ کے دھیمے دھیمے شعلوں کی آغوش میں روپوش تھا۔

آکاش کو ہوش میں آتا دیکھ کے اگن ناگ نے بڑے سکون سے اپنا انگاروں کی طرح دہکتا چوڑا پھن اوپر اٹھایا اور ایک تیز پھنکار ماری جس سے زمین دہل اٹھی آکاش کو یوں محسوس ہوا جیسے گرم ہواؤں کے کسی تیز بھنور میں پھنس گیا ہو۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح پتھریلی زمین پر گر پڑا۔

ابھی وہ پوری طرح سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ اگن ناگ کا خوف ناک لمبا چوڑا پھن اس کے اوپر لہرانے لگا۔ ایک بہت ہی ہولناک چیخ آکاش کے حلق میں کسی گولے کی طرح اٹک کے رہ گئی۔ اگن ناگ کا بدن انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ اور اس میں سے ہلکی ہلکی سرخ لو بھی اٹھ رہی تھی۔ لیکن اسے تپش اور حرارت کا احساس تک نہ ہوسکا بلکہ اس کے برعکس اس کے بدن کے قریب جانے سے اس نے شدید سردی ضرور محسوس کی۔ نہ جانے وہ دہشت کی سردی تھی یا واقعی اگن ناگ کے دہکتے بدن کی تاثیر ہی سرد تھی۔

موت اس کے سرہانے تلی کھڑی تھی۔ اگن ناگ کا مہیب پھن اس کے سر پر سایہ فگن تھا۔ اس کی سرد نگاہیں آکاش کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس کے باہر کو نکلتی زبانیں اس کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے تک آکر رہ جاتی تھیں۔ وہ اس کی پھنکاروں کا لمس بھی اپنے پورے بدن پر محسوس کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے آہستگی کے ساتھ ڈس کے اس کی بھینٹ کو قبول کرلے گا۔ پھر اس کا ہیبت ناک پھن نیچے آیا۔ وہ دہشت زدہ ہو کے اپنا بدن چرانے لگا۔ اس کا سانس سینے میں بری طرح پھول رہا تھا۔ جیسے وہ میلوں دور سے بے تحاشا بھاگتا چلا آرہا ہو۔

آخر اگن ناگ کا موت کی طرح سرد سفاک پھن اس کے سینے سے ٹکرا گیا۔ اس نے دانت کچکچا کے آنکھیں بھینچ لیں تاکہ اس آخری اذیت سے گزر سکوں۔ اس کے بعد تو موت کی شفیق اور ابدی آغوش ہی اس کے بھاگ میں لکھی جانے والی تھی۔ لکھے کو کون مٹا سکتا تھا۔

وہ آنکھیں بھینچے پڑا رہا اور اگن ناگ کا سرد پھن اس کے سینے پر پھیلتا رہا۔ جان کنی کے وہ چند لمحات بڑی اذیت ناک کرب سے گزرے۔ پھر اگن ناگ کا سرد لمس باقی نہ رہا۔

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو اپنی بینائی پر یقین نہ آیا۔ کئی بار پلکیں جھپکائیں۔ پھر اس نے اپنے بھاگ پر اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا کہ وہ آزاد ہوگیا۔ وہ زندہ سلامت تھا اور اگن ناگ حشمت و شکوہ کے ساتھ آہستہ آہستہ اگن کنڈ کی جانب لوٹ رہا تھا اور اسے یہ منظر کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔

کہیں یہ خواب تو نہیں ہے؟

لیکن یہ خواب نہیں تھا......؟ کوئی سندر سپنا نہیں تھا......؟ اس نے اپنے بدن میں ایک بار نہیں کئی بار چٹکیاں بھر کے اپنی تسلی کرلی۔ اوپر والے نے اس کی التجا سن لی تھی۔ بچانے والے نے مارنے والے سے اس کو بچالیا تھا۔ وہ اس کا بال تک بیکا نہیں کرسکا تھا؟ اوپر والے نے ایک دکھی، بے بس، مجبور اور لاچار پر جو دیا کی تھی۔ ترس کھایا تھا اس کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ وہ

پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اتنا رویا اور دیر تک روتا رہا تھا کہ اس کے ناقابل مسرت کا غبار آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ نکلا۔ اس وقت اس کے دل کی ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ اس کی آتما کو جو شانتی ملی، آج بھی وہ سوچتا ہے کہ اس کا دل خوشی سے پھٹ کیوں نہ گیا؟ وہ زندہ بچ گیا تھا۔ یہ اس کے کارن تھا جو واحد تھا جس نے انسان بنایا، کائنات بنائی، جہانوں کا یکتا خالق تھا۔ اس کا ایک مسلمان دوست جبار یاد آیا۔ وہ اس سے کہتا تھا کہ دنیا و جہانوں کا جو مالک ہے اس کے حکم کے بغیر ایک پتا تک نہیں ہل سکتا۔ ہر جان دار اور زندگی کا مالک ہے اس نے ہر نفس کی موت مقرر کیا ہوا ہے۔ وہ نہ تو ایک منٹ پہلے مر سکتا ہے نہ بعد میں۔

ایک طرف مسرت و شادمانی کی انتہا تھی تو دوسری طرف وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ موذی نسلوں کا دیوتا اگن ناگ آتشیں الاؤ میں گھس رہا تھا۔ اس کا پچھلا دھڑ تو پہلے ہی اگن کنڈ کے شعلوں میں چھپا ہوا تھا اور اب اس کا پھن اور اگلا دھڑ بھی اس میں گھس کے روپوش ہو چکا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے زمین پر کنڈلی مارے سینکڑوں گز لمبا بدن کا وحشی حملہ تیزی کھلتا جا رہا تھا۔ فضا پر غیر فطری سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ تاحد نظر زمین پر پھیلے ہوئے جل ناگ یوں ساکت و صامت پڑے ہوئے تھے جیسے ان کے جسموں سے زندگی کی آخری رمق تک نچوڑی جا چکی ہے؟

آکاش ششدر اور بھونچکا اور مبہوت کی سی کیفیت میں زمین پر پڑا ہوا اگن ناگ کو اپنے اگن کنڈ میں جاتے دیکھتا رہا۔ اور وہ آہستہ آہستہ آگ کے شعلوں میں روپوش ہو گیا۔ پھر اس کی نظروں سے کیا دل سے بھی اوجھل ہو چکا تھا۔

اس کے غائب ہوتے ہی اس میدان میں ایک حشر سا بپا ہو گیا۔ ایک طوفان تھا اور آندھی سی تھی جو آ گئی تھی۔ لاکھوں جل ناگ بھیانک پھنکاریں مارتے اس کے بدن کو چھونے لگے۔ پہلے تو وہ دہشت زدہ سا ہو کے لرزنے لگا۔ ایسا لگا کہ یہ جل ناگ اب اس کے لئے موت بن گئے ہیں اور وہ ان سے بچ نہ سکے گا۔ لیکن جب دوسرے لمحے ان سے اس کی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ اگن ناگ نے چوں کہ اس کی بھینٹ قبول نہیں کی اور اس پر دیا کر دیا۔ یہ پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ اس لئے اس بنا پر سارے جل ناگ اسے دیوتا مان کے عقیدت سے اس کا بدن چھو کر پرستش کر رہے ہیں۔ وہ سب اس کے پجاری ہو گئے ہیں۔

اس صورت حال کا اندیشہ ہوتے ہی وہ فوراً سرعت سے کھڑا ہو گیا۔ جل منڈل کے اس حصے میں دور دور تک چار سمتوں میں آندھی کا سا غبار اڑ رہا تھا۔ اور اس کی اوٹ میں لاکھوں جل ناگ جوش و خروش سے اس کی جانب بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کی کوشش تھی کہ وہ سب سے پہلے اس تک پہنچ جائے۔

اس کے لئے یہ صورت حال تشویش ناک یا پریشان کن نہیں تھی۔ چونکہ جل ناگ کے اس پر ہجوم میں جو بڑا جذباتی اور پر جوش تھا تنہا انسان تھا...... اس لئے اسے گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ اور پھر اس کی نگاہ اس انبوہ میں بے تابی سے جل کماری، امرتا رانی اور سنگیت کو تلاش کر رہی تھیں۔ اب کے قرب اور موجودگی سے وہ اسے ان جل ناگوں کے ہجوم سے دور رکھ سکیں۔

چند ساعتوں کے بعد جیسے ہی اس کی نگاہ جل کماری پر پڑی جو نسوانی روپ میں اس سے قدرے فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھونچکی اور ششدر سی بھی تھی کہ بازی الٹ گئی۔ اگن ناگ نے اس کی بھینٹ قبول نہیں کی۔ جیسے وہ کوئی پوتر عظیم ہستی ہو۔ اس کے چہرے پر حسرت زدہ پریشانی برس رہی تھی کہ اس کے انتقام کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اور اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کرشمہ کیسے ہو گیا۔ اگن ناگ نے جو آکاش پر کرپا کی کہیں یہ سپنا یا نظر کا دھوکا تو نہیں تھا۔

"جل کماری......!" وہ سرشاری سے چیخ کے اس کی طرف سرعت سے لپکا۔ اس وقت وہ چوں کہ خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس لئے اس نے یہ سوچا نہیں

اس مکار اور فریبی عورت نے اس کی موت کا سامان کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اگر اوپر والے نے اس کی سن نہ لی ہوتی تو اس وقت وہاں اس کی مسخ شدہ اکڑی ہوئی لاش ہی پڑی ہوتی۔ اس کی عبرتناک موت واقع ہو چکی ہوتی۔

''میں زندہ ہوں تم دیکھ رہی ہو نا جل کماری......!''

اس نے جل کماری کو اپنے بازوؤں کے حصار میں قید کرلیا۔ ''اگنی ناگ نے مجھ پر کتنی بڑی دیا کی...... کرپا کی......'' ''اب تو بتاؤ کہ امرتا رانی...... اور سنگیت کہاں ہیں؟'' اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھا کے ایک سانس میں پوچھا۔

''تم سدا سکھی رہو...... اور بھاگ کے بڑے سچے ہو...... تم پہلے منش ہو جو اگنی دیوتا نے تمہاری بھینٹ نہیں لی۔'' اس نے جذباتی ہو کر جواب دیا۔

''انہیں بھگاؤ...... یہ کہاں مجھ سے لپٹے پڑ رہے ہیں......؟'' اس نے جل کماری کو بازوؤں کے حصار سے نکال کے جل ناگوں کو جھٹکا جو اس کے پنڈلیوں سے چپکے ہوئے چوم رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی پوجا کر رہے ہوں۔

جل کماری نے اپنا لباس اور بال درست کرتے ہوئے اپنی زبان جو اس کے لئے نامانوس تھی اس میں کوئی حکم دیا۔ پھر میدان تیزی سے خالی ہونے لگا۔ چند ساعتوں کے بعد وہ دونوں اگنی کنڈ کے بھڑکتے شعلوں کی آنچ میں تنہا رہ گئے اور فضا پر چھایا ہوا غبار چھٹنے لگا۔

''امرتا رانی کہاں ہے، جل کماری!'' آکاش نے اس کی مرمریں کمر میں ہاتھ ڈال کے قریب کرلیا۔ ''میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔'' ''جہاں اور جس کے پاس تمہارا من چاہے جاسکتے ہو۔'' جل کماری نے اس کے گلے میں اپنی سڈول اور گداز بانہیں حمائل کرکے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔

''میں نے پہلے تمہیں اپنا من دے کر ہارا تھا اور سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ اب تو سب کچھ ہار بیٹھی ہوں۔ اب میری جھولی خالی اور چھیدوں سے بھری ہوئی ہے......

جل منڈی کی دھرتی پر حیران کن اور ناقابل یقین بات یہ ہے کہ اگنی ناگ نے پہلی بار کسی منش کی بھینٹ کو سویکار کرنے سے انکار کیا...... وہ تم پر شاید اس لئے مہربان ہوا کہ تم نہایت خوب صورت اور وجیہہ ہو...... انسانوں کے تصوراتی دیوتا کی طرح...... اس کی شکتی ہے کہ تمہیں شانتی کے ساتھ جل منڈل سے نکال اجل بھومی پہنچا دیا جائے۔''

''اجل بھومی؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''ایشور تیرا شکر ہے کہ اب میں جل منڈل سے نکل کے اپنے جیسے انسانوں میں پہنچ سکوں گا۔''

''امرتا رانی اس جزیرے پر تمہارا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی ہے۔ لیکن تم چاروں طرف سے چوکس رہنا؟''

''اب کیا خطرہ ہے......! کس لئے......؟ کس سے؟''

''شیوناگ سے...... ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارے لئے نئی مصیبت کھڑی کرنے کے لئے سواگت کرے......؟'' وہ بولی۔

آکاش کے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ لیکن اس نے جل کماری کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لئے کہ دوسرے لمحے اس بات سے اس کے دل سے خوف اور دہشت جو شیوناگ کی تھی وہ نکل گئی کہ امرتا رانی اس کا بے تابی سے انتظار کر رہی ہے۔ اور پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں ایک نیا عزم اور حوصلہ پا رہا ہے کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اور سنگلاخ چٹانوں تک سے ٹکرا سکتا ہے۔ شیوناگ کو کسی چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہے۔ اس لئے کہ اب امرتا رانی کا قرب، محبت اور ساتھ حاصل ہونے والا تھا جس نے اس کے شریر میں تصور سے ہی ایک نئی آتما پھونک دی تھی۔

دوسری طرف اس کے ذہن میں ایک بات ستا رہی تھی کہ...... اگنی ناگ منکے کی وجہ سے اسے چھوڑ دینے پر مجبور ہوا تھا یا امرتا رانی نے اوشی دیوی کے ذریعے اس کی بھینٹ قبول نہ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ امرتا رانی نے

اس کی زندگی اور سلامتی کے لئے نہ جانے کیا کیا پاپڑ بیلے ہوں گے۔ جتن کئے ہوں گے۔ ورنہ وہ موذی کب شما کرتا؟ یا پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس کی کوئی اچھائی کام آگئی تھی جس نے موت، مصیبت اور اس موذی سے نجات دلادی تھی۔ اس کے پتاجی اس سے کہا کرتے تھے کہ...... آکاش ہر کسی کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ۔ اس کی مصیبت میں کام آؤ...... شبھ کام اور نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس لئے اس نے اپنی زندگی جو بھلائی کے لئے وقف کی ہوئی تھی۔ اس نے ساتھ دیا تھا۔

اگن کنڈ کے دہکتے شعلوں کا انعکاس دور دور تک کی فضا میں اپنی سرخ پرچھائیوں کی بانہیں پھیلا رہا تھا۔ اور وہ اس ہزاروں صدیوں سے روشن اس پراسرار اور خوف ناک الاؤ کو پیچھے چھوڑتا اور جل کماری کے ہمراہ ان سرحدوں کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں آتے سے سنگیت نے اس کا ساتھ چھوڑا تھا۔ اسے پورا پورا بسواس تھا کہ وہ اس کے سوگ میں ابھی تک وہیں بیٹھی ہوگی...... اور خلاف توقع اسے زندہ دیکھ کے حیرت اور خوشی سے دیوانی ہوجائے گی۔

جل کماری اس وقت بے حد افسردہ ملول خاموش تھی جیسے اس سے کوئی قیمتی شے چھین لی گئی ہو۔ مقابلے کی آخری منزل پر پہنچ کے اسے جو ناقابل یقین صدمہ پہنچا تھا اس نے جل کماری کے بسواس کو پامال اور بری طرح روند کے رکھ دیا تھا۔ اس کی کوتاہی ایک اذیت ناک پچھتاوا بن گئی تھی۔ آکاش نے اپنی قیافہ شناسی سے اس کا بشرہ بھانپ لیا تھا کہ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے آکاش کی التجاؤں اور منت ساجت کو قبول کرلیا ہوتا تو وہ نہ اس سے بچ جاتی اور پھر اسے اپنا احسان جتا کے ہمیشہ کے لئے اسے اپنا ایک زرخرید غلام بنا کے ہر طرح کا فائدہ اٹھاتی رہتی۔ یہ احساس محرومی اسے کسی ناگ کی طرح ڈس رہی تھی اور اپنا زہریلا ڈنک مار رہی تھی...... ایسا خوب صورت مرد اپنے ہی ہاتھوں سے کھو دیا تھا...... اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔ اب اسے ساری زندگی کف افسوس ملتے رہنا ہوگا۔

جل کماری نے جو بساط بچھائی تھی۔ وہ الٹ چکی تھی۔ شروعات ہوچکی تھی اسے...... آکاش کے دل میں اپنی نیلم کو اوٹی نگر سے نکال کے دوبارہ پالینے کی خواہش اور جذبہ ایک نئی شدت لئے اور ایک بھرپور عزم سے جاگ اٹھا تھا۔ آکاش کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے اس کی حرماں نصیبی کے دن گزر چکے ہیں اور ایک نئی اور حسین زندگی اپنی حرارت کے ساتھ اس کی سواگت کے لئے تیار ہے۔

وہ جل کماری کے ساتھ تیزی سے بڑھتا جارہا تھا۔ اگن کنڈ کے بھڑکتے شعلے انہیں کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ نئی زندگی کی نوید نے اس کے پورے شریر میں زبردست توانائی پھونک دی تھی...... اس نے کن انکھیوں سے جل کماری کی طرف دیکھا اس پر ایک مردنی سی چھائی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں سے حسرتیں جھانک رہی تھیں۔ وہ گم اور کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی آنکھیں کسی لمحے برس سکتی ہیں۔

جب وہ اس مقام پر پہنچے جہاں سنگیت نے بھینٹ گاہ کی طرف جاتے ہوئے اس کا ساتھ چھوڑا تھا تو وہ حیران رہ گیا کہ وہاں دور دور تک سنگیت کا نام ونشان نہ تھا۔ وہ پریشان سا ہوگیا اور سمجھ گیا کہ سنگیت اس کی زندگی سے مایوس ہوکر چلی گئی تھی۔ اب وہ یہاں رک کے اس کا انتظار کیوں اور کس لئے کرتی؟

جل کماری نے اس کی پریشان نظروں اور چہرے پر حیرت سے بھانپ لیا تھا کہ وہ سنگیت کو نہ پا کے افسردہ سا ہوگیا ہے۔ وہ مسکرادی اور دل میں خوش بھی ہوئی۔ پھر اس کے قریب ہوکے بولی۔

”چلی گئی ہوگی کسی پر فیاضی سے مہربان ہونے...... اس لئے کہ اسے معلوم تھا کہ تم بھینٹ سے بچ نہیں سکتے...... لہٰذا اب تمہیں اسے سدا کے لئے بھول جانا چاہئے...... اس کا خیال دل سے نکال دو۔“

”مجھے سنگیت کی کوئی چتا نہیں ہے...... تم مجھے جتنا

جلد ہو سکے اوٹی نگر پہنچادو...... مجھے یہاں ایک عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی ہے...... میرے لئے ایک ایک لمحہ صدی کی طرح بھاری ہو رہا ہے......"

جل کماری نے اس کے گلے میں اپنی سڈول بانہیں حمائل کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم جیت تو چکے ہو...... پر میری ایک آشا ہے۔ وہ پوری کر دو۔"

"وہ کیا......" آکاش اس کی آنکھوں میں مستی کا خمار دیکھ کے چونکا۔

"تمہارے اجل بھومی چھوڑنے سے پہلے میں کچھ دیر تمہارے بازوؤں کے حصار میں خود کو کھو دینا چاہتی ہوں۔" وہ لگاوٹ سے بولی۔ اس نے اپنی نظریں جھکالی تھیں۔ صرف اور صرف تمہاری محبت بھری باتوں کی بھوکی ہوں...... اور کچھ نہیں۔"

اب وہ جل کماری کو خوش کرنا اور پریم کر کے بہکنا اور آلودہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ جل کماری کا سحر ٹوٹ چکا تھا اور اس کے پیٹ میں اینٹھن اور سینے پر گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کی بات کی تہہ میں پہنچ چکا تھا۔ وہ فریب دے کے اسے اپنے جسم کے طلسم میں جکڑنا چاہتی تھی تاکہ وہ سنگیت اور امرتا رانی کو فراموش کر کے اس کے سنگ سدا رہ جائے...... وہ کوئی احمق اور بچہ نہیں تھا جو اس کے حسن و شباب اور باتوں کے فریب میں آ کے شکار ہو جاتا۔

"میں نے تم سے کتنی محبت بھری باتیں کی ہیں...... اب میرے پاس الفاظ نہیں رہے اور نہ میں جھوٹی اور فریب کی باتیں کر کے پریم کا اظہار کروں...... تم مجھے جتنا جلد ہو سکے اجل بھومی پہنچادو...... میں یہاں سخت گھٹن محسوس کر رہا ہوں۔"

آکاش کو اپنے معدے میں اینٹھن اور سینے میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔

وہ دونوں آگے بڑھتے رہے اور اس کے ساتھ اس کی تکلیف میں اضافہ ہوتا رہا۔ اسے زندہ لکیریں اپنی آنتوں سے لپٹی محسوس ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھی یہ سارا دباؤ اتنی شدت کے ساتھ سینے کی جانب منتقل ہو جاتا کہ اس کے لئے خود پر قابو پانا دشوار ہو جاتا۔

اس تکلیف اور اذیت ناک لمحات کے بعد جل کماری کا راج بھون قریب آیا۔ یہ مسافت آکاش کو صدیوں کی طرح بھاری لگی تھی پھر اس کے قدموں میں غیر معمولی سرعت سرایت کر گئی۔

سیپیوں، مونگے اور موتیوں سے بنی اس عالی شان عمارت میں کہیں کہیں بھی دروازہ یا کھڑکی قسم کی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ اس کی بلند و بالا دیواریں بالکل سپاٹ تھیں اور نہ ہی رنگ و روغن کیا ہوا تھا۔ اس سے قبل وہ بار ہا راج بھون میں آیا تھا۔ لیکن یہ مرحلہ کبھی ہوش کے عالم میں طے نہیں کیا تھا۔ اب پہلی بار وہ پورے ہوش و حواس کے عالم میں اس کے اندر جانے والا تھا۔

آکاش نے یہ بات محسوس کی تھی کہ ایک جگہ کے کئی نام ہیں۔ اس جزیرے کا نام کالی بھومی بھی تھا اور اجل بھومی بھی...... جل منڈل کو اوٹی نگر اور کالی راج دھانی بھی کہتے تھے۔

راج بھون کی دیواریں قریب آنے پر اس کی رفتار سست پڑنے لگی۔ لیکن جل کماری اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی اور اسے سنگ لیے اس دیوار میں سے یوں گزر گئی ہے جیسے وہ دیوار نہیں دھند تھی۔ آکاش اس دیوار کو عبور کرنے کے بعد گھبرا کے پیچھا ہٹا تو اس کا خیال تھا کہ وہ دیوار سے ٹکرا جائے گا۔ اس نے اپنا وہم سمجھا تھا۔ پھر اس نے تیزی سے پلٹ کے دیکھا تو اسے موجود پایا۔ اس نے اپنی حیرت اور شبہ دور کرنے کی نیت سے ہاتھ لگایا تو وہ بالکل ٹھوس محسوس ہوئی۔ جل کماری دھیمے سے بولی۔

"بس چلتے رہو...... اس دھرتی پر قدم قدم پر ایسے منتر بکھرے پڑے ہیں جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے ہیں۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے......؟ یہ تو ایک عام سا منتر تھا۔

جل کماری کے کمرے میں گھسنے سے قبل بھی اس کی تکلیف اور گھٹن بڑھ گئی تھی اس سے برداشت نہ ہو سکی۔

وہ جل کماری کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کے فرط کرب ناک اذیت سے سینہ تھام کے زمین پر دھم سے بیٹھ گیا۔
جل کماری نے ہم دردانہ نگاہوں سے آکاش کو دیکھا اور اپنائیت سے بولی۔
''جب تک تم اگن ناگ کو اپنی بھینٹ کا یہ بدل نہیں دو گے...... یہ روگ تمہیں اس طرح ستاتا اور تڑپاتا رہے گا...... اگن کنڈ پر جو سوئیاں سانپ بن کر تمہارے حلق سے اتر گئی تھیں وہی تمہیں کچوکے دے رہی ہیں...... تمہارے لئے ایک ایسا عذاب بن گئی ہیں جس سے تم چھٹکارا نہ پا سکو گے؟ سوچ لو۔''
''بھینٹ کا بدل......؟'' اس تکلیف کے باعث بھی وہ تحیر زدہ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ آخر دیوتا کو بدل سے کیا ادھیکار ہو سکتا ہے...... یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے؟ عقل کام نہیں کرتی ہے؟''
''ہاں...... اگن ناگ تمہیں جو نیا جیون دیا ہے تو ایک برس کی ڈھیل بھی دی ہے۔ اس کی شرط ہے؟''
''کیا شرط ہے؟'' آکاش اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے لگا۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔
''شرط تو ہے بڑی عجیب و غریب...... لیکن ہے شرط...... شرط ہی ہوتی ہے۔'' جل کماری بتانے لگی۔
''اپنی دھرتی پر پہنچنے کے بعد تمہیں کالی مسور دال سے اگن ناگ کا ایک ننھا سا مجسمہ بنانا ہوگا اور اسے کسی کنواری کے تازہ خون سے اشنان دینا ہوگا...... جب تم اگن ناگ کی یہ شرط پوری کرو گے تو آپ ہی آپ اس روگ سے نجات مل جائے گی۔''
''اوہ......!'' بے اختیار اس کے حلق سے ایک سرد آہ نکلی۔ ''یہ تو بڑی اور ناقابل عمل شرط ہے؟''
''وہ کیسے......؟''
''میں ہر قسم کی دال سے مجسمہ تو بنا سکتا ہوں۔ میں ایک طرح سے سنگ تراش ہوں۔ میں نے نہ جانے کیسے کیسے اور کتنے سارے مجسمے بنائے ہیں۔ لیکن کسی معصوم کنواری کا خون کر کے مجسمہ کو اشنان دینا یہ ظلم، بربریت اور درندگی ہے۔ میں ایک منش ہونے کے ناتے ایک لڑکی کو موت کے گھاٹ کیسے اتار دوں! میں کوئی درندہ نہیں بلکہ ایک منش ہوں۔''
''لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہیں......'' جل کماری بولی۔ ''جانتے ہو تم نے بدل نہیں دیا تو کیا ہوگا؟''
''کیا ہوگا......؟ کیا مجھے موت کی نیند سلا دیا جائے گا؟'' آکاش خوف زدہ لہجے میں بولا۔
ہوگا یہ کہ ایک برس میں تم اپنی بھینٹ کا یہ بدل نہ دے سکے تو پھر تمہارے شریر میں گھسے یہ ریسوں کے جیسے باریک موذی سانپ تمہیں اذیت دے کے اور تڑپا تڑپا کے مار ڈالیں گے...... یہ بڑی دردناک موت ہوگی...... دیکھو...... اتنی بڑی دنیا میں کنواری کی کیا کمی ہے...... تم اتنے سندر ہو کہ کنواریاں تمہیں دیکھ کے اپنا دل ہار دیتی ہیں۔ کسی ایک کنواری کو بے ہوش کر کے اسے موت کی بھینٹ چڑھا کے اس کے تازہ خون سے اشنان دے دینا، اگن ناگ کے مجسمہ کو......''
''لیکن میں ایک خون آشام بھیڑیے کا سا جگر کہاں سے لاؤں گا؟'' آکاش نے افسردگی سے کہا۔ ''میں شاید ایسا نہ کر پاؤں۔''
''دیکھو...... انسانوں کی بستی میں درندوں سے کہیں زیادہ خوف ناک، خطرناک اور ظالم بستے ہیں جو خون کرتے اور پی جاتے ہیں۔ بڑے سنگ دل ہوتے ہیں۔ تم کسی سنگ دل کو اجرت دے دینا...... وہ کسی کنواری کو لے کے آئے گا۔ اسے خون میں نہلا دے گا۔ اس کے خون سے اگن ناگ کے مجسمہ کو نہلا دینا۔ دیکھو...... میں نے تمہیں کیسی آسان تدبیر بتائی۔''
پھر وہ جل کماری کے ساتھ چلنے لگا۔ ایک طرف اسے نیا جیون ملنے پر خوشی تھی تو دوسری طرف اس شرط کی اذیت نے اسے ہراساں اور پریشان کر دیا...... خوشی کی نیت خاصی مہنگی تھی۔ اب اس کے لیے کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ جل کماری کی تدبیر پر عمل کرے۔ اس صورت میں وہ اس روگ سے نجات پا سکتا تھا...... کیا وہ کسی کنواری لڑکی کے خون سے اپنے ہاتھ آلودہ کر سکے گا۔
جل کماری اسے اپنی دبیز اور نیم روشن خواب گاہ

میں لے آئی۔ وہ اس پر بڑی فیاضی سے مہربان ہوگئی۔

لیکن وہ بڑی سرد مہری سے پیش آنے لگا۔ لیکن جل کماری کو اس بات کی کوئی پروانہ رہی تھی۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ جل کماری نے اس پر کوئی منتر پڑھ کے پھونکا ہے جس نے کٹھ پتلی بنادیا ہے۔

اس منتر کا کوئی اثر تھا کہ اس کے دل کے کسی کونے میں جل کماری کے لئے بڑے متضاد جذبے جنم لینے لگے ہیں۔

وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز نیلم کے تصور میں تھا کہ خواب گاہ ایک غیر مانوس سی آواز بجلی کی طرح کڑکی اور غائب ہوگئی۔

''جل منڈل میں کوئی پرایا گھس آیا ہے......'' جل کماری اسے ایک طرف دھکیل کے اٹھ بیٹھی۔

آکاش کے کچھ پوچھنے سے قبل وہ کسی سنسناتے ہوئے تیر کی مانند خواب گاہ سے نکل گئی۔

آکاش کچھ دیر تک خالی الذہن کی حالت میں بستر پر پڑا رہا۔ بستر کی شکنیں اور بے ترتیبی گزرے لحات کا فسانہ سنا رہی تھی۔ پھر اچانک کچھ خیال آیا تو وہ اٹھ بیٹھا۔ پھر اس نے اپنی پنڈلی پر رومال کے ساتھ امرتا رانی کے ریشمی بالوں کو چھوا۔ یہ وہ بال تھے جو اس نے امرتا رانی کو پدما کے روپ میں زیر کرنے کے لئے اس کی زلفوں کو کاٹا تھا۔ یہ بال ہر دم اس کے ساتھ رہتے تھے...... اور وہ ان کی حفاظت کرتا آرہا تھا۔ محض ان بالوں کے باعث امرتا رانی اس کے قبضے میں تھی۔

گرو مہاراج جو نیکی بدی کے لئے اس سنسار میں جیون کے دن کاٹ رہے تھے۔ انہوں نے اسے تاکید کی تھی کسی مرحلے پر اگر ان بالوں کی حفاظت مشکل ہوجائے تو وہ انہیں جلا کے ان کی راکھ بہتے پانی میں پھینک دے۔ اس وقت اسے اندازہ ہوا کہ اگر گہرے سمندر سے گزر کے کالی بھومی تک پہنچنے کے دوران میں یہ بال اس کے قبضے سے نکل گئے تو امرتا رانی اپنی پراسرار قوتوں کے سہارے انہیں تلاش کر کے ان پر قابض ہوجائے گی اور وہ اسے کھو بیٹھے گا۔

اس نے فیصلہ کرلیا کہ جل منڈل سے کالی بھومی کے پراسرار سفر پر روانہ ہونے سے قبل وہ ان بالوں کو جلادے گا اور ان کی راکھ جل منڈل کی خشک گپھا اور چنگھاڑتی ہوئی سمندری گپھا سنگم پر سمندری ریلے میں بہادے گا۔

اس فیصلے کے بعد اس نے خواب گاہ کا جائزہ لیا تو یہاں اس کے لئے مردانہ لباس کا ایک نیا جوڑا موجود تھا۔ وہ غار اور کانسی جار سے رہائی کے بعد لباس سے محروم تھا جس سے وہ ذہنی خلجان میں مبتلا تھا۔ پھر اس نے جلدی سے وہ لباس پہنا تو اس نے بڑا سکون اور ایک عجیب سی طمانیت محسوس کی تھی۔

پھر وہ بستر پر دراز ہوگیا۔ نیلم اور ناگ بھون کے آئندہ سفر کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کمرے میں قدموں کی وزنی دھمک سنائی دی...... وہ چونک کے اٹھ بیٹھا۔ جل کماری ہانپتی ہوئی آئی تھی۔

''بری خبر ہے آکاش......! تمہاری سنگیت نے ہتھیا کرلی ہے۔'' وہ جلدی جلدی بولی تو اس کے سینے میں سانسیں بے ترتیب ہورہی تھیں۔ ''اب تک وہ ہماری نظروں سے اوجھل تھی پر زہر کھانے کے بعد وہ نظر آنے لگی ہے...... اس نے اس غار کے کنارے ہتھیا کی ہے جہاں تم قید میں اس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔''

''سنگیت نے خودکشی کرلی......'' آکاش نے بے یقینی کے لہجے میں دہرایا۔ اسے یقین نہ آیا اس خبر سے اسے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ خودکشی کی وجہ بظاہر کوئی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس سے قبل جل کماری مزید کچھ بتاتی کئی موٹے موٹے جل ناگ سنگیت کے بے جان بدن کو فرش پر بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے وہاں آپہنچے...... آکاش نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ سنگیت ہی تھی۔

جل کماری کے اشارے پر انہوں نے سنگیت کو وہیں چھوڑا اور تیزی سے واپس لوٹ گئے۔

وہ کوندا بن کے سنگیت کے قریب پہنچ گیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔

سنگیت کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور منہ سے نیلے نیلے جھاگ بہہ رہے تھے...... اس کا پورا بدن پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے بے صبری کے ساتھ اس کے سینے پر ہاتھ رکھا لیکن وہاں دھڑکنوں کے بجائے موت کا ہولناک سکوت طاری تھا۔ پھر بدحواسی کے عالم میں سنگیت کی نبضیں ٹٹولنے لگا۔ اسے پورا یقین تھا کہ سنگیت نے اس کی زندگی سے مایوس ہو کر ہی خودکشی کی کوشش کی ہے اور اب اس کے بچ نکلنے پر شاید اس کی آتما تڑپ اٹھے گی۔ کیوں کہ سنگیت نے موت کے بعد والے جہانوں میں ملاپ کی نیت سے یہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ پرلوک میں اس کا انتظار کرے گی۔

''سچ سچ بتانا آکاش......! یہ کون ہے......'' جل کماری نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

آکاش نے سنگیت کی نبضیں ٹٹولتے ٹٹولتے سر اوپر اٹھایا اور اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ پھر نبضیں ٹٹولنے لگا۔

''میں اتنا جانتی ہوں کہ یہ ناگن نہیں ہے۔'' جل کماری کہہ رہی تھی۔ ''کیوں کہ ناگ ناگنوں پر کوئی زہر اثر نہیں کرتا...... پھر مرتے وقت ناگ جس روپ میں بھی ہو...... میں سوگند کھا کے کہتی ہوں کہ یہ ناگن نہیں ہے۔''

اس وقت اس کی بے چین انگلیوں نے سنگیت کی ڈوبتی ہوئی نبض...... اس میں ہلکی سی زندگی محسوس کی اور یک بیک اس پر دیوانگی طاری ہوگئی۔ پھر اس نے سنگیت کے سینے پر دل کی جگہ کان رکھ دیا۔ دل دھڑکتا سا لگا۔

جل کماری نے سنگیت کی خودکشی کے بارے میں بتایا تھا تو آکاش کے وجود کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اس کی نس نس میں لہو منجمد سا ہوگیا تھا۔ اس پر کوئی بجلی سی آ گری تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

سنگیت کے علم میں یہ بات تھی کہ امرتا رانی آکاش کو شدت سے چاہتی ہے۔ اور جل کماری محبت کے فریب میں آکاش کو کٹھ پتلی بنا چکی ہے اس کے باوجود سنگیت نے حسد و جلن محسوس نہیں کی۔ کیوں کہ آکاش اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔ لہٰذا یہ بات ناممکن سی تھی کہ دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا انتہائی قدم اٹھائے۔ اگر سنگیت نے دل پر کوئی جذباتی اثر لیا ہوا تھا تو اس میں اس کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ خود کو سنگیت کا مجرم سمجھ رہا تھا۔

دوسری طرف جل کماری کے شبہات نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔ اگر سنگیت واقعی انسانی نسل سے تعلق رکھتی تھی تو جل منڈل کی اجنبی سرزمین پر وہ اس کی ہر طرح سے مدد کرنا چاہتا تھا۔ سنگیت کی چاہت میں کوئی ریاکاری یا منافقت نہ تھی۔ اس کی مدد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ وہ جنونی انداز سے اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کی محبت رسمی یا ضرورت کی نہیں تھی۔ وہ بھی امرتا رانی کی طرح صرف محبت کی بھوکی تھی۔

وہ بے حس و حرکت جل کماری کی خواب گاہ کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا مرمریں بدن جگہ جگہ سے مسکے ہوئے لباس میں سے جھانک رہا تھا...... اس کے منہ سے ابھی تک نیلے نیلے جھاگ ابل رہے تھے...... بدن پسینے میں شرابور تھا اور اس کی نبض کی رفتار بہت سست اور ناہموار تھی۔ لیکن دل کی زبان نبض ہوتی ہے۔ دل کا حال پل پل بتاتی رہتی ہے۔ زندگی کی امید دلاتی ہے۔

سنگیت کی زندگی کی خفیف سی امید پیدا ہوتے ہی اس کے وجود میں محبت کا وہ ابدی اور لازوال جذبہ اپنی پوری شدت سے بیدار ہوگیا جو انسان کو اس کے ہم نسلوں کی جانب مائل کرتا ہے...... پھر اس نے سنگیت کے منہ پر اپنا منہ رکھ کے پھونکنا شروع کیا...... پھر چند لمحوں کے بعد اس کے دل کے مقام پر اپنی دونوں ہتھیلیوں سے مالش کی لیکن اس کے بدن کو جنبش نہ ہوئی بدن سرد ہی محسوس ہوا پھر بھی اس نے اپنا عمل جاری رکھا۔

اس اثناء میں جل کماری نے آگے بڑھ کے سنگیت کی چڑھی ہوئی پتلیوں پر پپوٹے گرائے اور آکاش کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اپنائیت سے بھرے لہجے میں آکاش سے بولی۔

''آکاش جانی...... !تم کیوں خواہ مخواہ اپنی جان ہلکان کررہے ہو......؟ جو اس سنسار سے چل دیتے ہیں وہ واپس نہیں آتے ہیں...... یہ مرچکی ہے...... اس کے شریر میں آتما رہی ہے اور نہ دل حرکت کررہا ہے...... دیکھ نہیں رہے ہو اس کا نرم سینہ دھڑک نہیں رہا ہے...... اس نے ساگروں کی جل کماری کی آگیا کی بنا پر جل منڈل میں گھسنے کی غلطی کی تھی...... اور دیوتاؤں نے اسے شراپ دیا ہے...... میرے پاس آجاؤ...... اس کی آتما چند ہی لمحے میں نرک کی آگ میں پھینک دی جائے گی...... اس کا شریر بھسم ہوجائے گا۔''

جل کماری کا ایک ایک لفظ فریب کی چغلی کھا رہا تھا۔ آکاش نے سر اٹھا کے غصہ بھری نظروں سے گھورا۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو......؟ بکواس کررہی ہو......؟ کیا تم مجھے بے وقوف اور احمق سمجھ رہی ہو......؟ سنگیت زندہ ہے...... وہ جل منڈل میں ایسی عبرت ناک موت نہیں مرسکتی......؟''

''آکاش...... جل کماری ایک دم سے اس طرح بھڑک گئی جیسے آکاش نے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔'' تم یہ مت بھولو کہ میں جل منڈل کی کماری ہوں......تم میری شکتی کی کوئی اپائے نہ کرسکو گے......''

شکتی......؟ کماری......؟'' آکاش نے زور سے ایک زہریلا اور نیم ہذیانی قہقہہ لگایا اور اس کے بدن کی طرف اشارہ کیا جو بے حجاب تھا۔ ''تمہاری شکتی بس یہی ہے......تم ایک ایسا وجود ہو جس کے وجود سے ہوس اور نفس کی وہ آگ بھڑک رہی ہے جسے کوئی بھی سرد نہیں کرسکتا......؟ تمہاری بے حیائی...... حیوان مزاجی...... بدچلنی نے مجھے تمہاری اس شکتی کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع دیا ہے...... اب مجھ پر تمہارا یہ جادو چلنے سے رہا...... اب تم شیوناگ کی آغوش میں زندگی کاٹنا۔''

آکاش کے ان زہریلے ڈنکوں پر وہ بلبلا اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپکنے لگے۔

''زبان کو لگام دو...... تم اس خوش فہمی اور دھیان میں نہ رہنا کہ اگن ناگ نے تمہیں چھوٹ دے دی ہے۔ تمہارا بھانڈا چور چور ہوچکا ہے...... تم کڑی کٹھنائیاں جھیلنے کی تیاری کرو...... تم بچ کے کہاں جاؤ گے......؟''

جل کماری تیز تیز بولتی گئی اور اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ سانسیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔ وہ جس حالت میں تھی وہ ایک ہیجان خیز نظارہ بن گئی۔ نفرت اور غصے نے اسے سرخ کیا کیا وہ اور حسین دکھائی دینے لگی تھی۔

مگر اس کے لہجے کی مکاری اور اس کے تیوروں نے آکاش کو تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ آکاش نے خود کو سنبھال لیا اس نے اپنے لہجے اور چہرے کے کسی تاثرات سے کسی کمزوری کا اظہار ہونے نہ دیا۔ پھر وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔

''جل منڈل پر تمہارا حکم ضرور چلتا ہوگا...... لیکن یہ یاد رکھو کہ اب تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی...... ہوگا یہ کہ زیادہ سے زیادہ سنگیت کو اپنی رقابت کی خاطر اس لئے موت کی بھینٹ چڑھادو گی تاکہ میرا قرب حاصل کرکے اپنی تمنائیں پوری کرسکو......؟ لیکن اس کے لئے تمہیں مجھ سے مقابلہ کرنا ہوگا......؟''

''اچھا......'' اس کے لہجے میں استہزا تھا۔ ''پھر تماشا دیکھو...... ایسا تماشا جس کے بارے میں تم اندازہ نہیں کرسکتے ہو؟''

دوسرے لمحے جل کماری نے اپنی بات کہتے ہوئے پھرتی سے تالی اور فرش پر عین اس جگہ جہاں نیم جان کی سی حالت میں سنگیت پڑی ہوئی تھی زمین میں سے موٹے موٹے زہریلے اور خوف ناک قسم کے مضبوط اور کالے کیڑے ابلنے لگے۔ ایک سرد سی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی جو چاقو کی نوک کی طرح چبھ گئی۔ وہ ششدر اور مبہوت سا ہوکر یہ خوفناک منظر دیکھنے لگا۔ وہ ایسا ساکت اور جامد ہوا کہ وہ ان کیڑوں سے سنگیت کو بچانے کی ہمت نہ کرسکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سفید اور کالے کیڑے سنگیت کے کندن سے بدن کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ گئے۔ سنگیت کے بدن میں ہلکی سی جنبش نے جنم لیا تو اس نے بے ہوشی کی حالت میں

کروٹ لی اور دوسرے لمحے وہ ایک ہذیانی چیخ مار کے ہوش میں آ گئی۔ اس نے اپنے جسم پر جو سفید کالے کیڑوں کو جونک بنے دیکھا تو اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹنے لگیں۔

سنگیت نے فرش سے اٹھنے میں لحظہ بھر کی بھی دیر نہیں کی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن وہ سفید اور کالے کیڑے اس کے بدن سے خونی جونکوں کی طرح لپٹے رہے، جیسے وہ اس کے رسیلے بدن کا رس بڑی لذت سے پی رہے ہوں۔ جیسے ہی سنگیت کی نظر اپنے بدن پر پڑی تو اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ سرخ سرخ آنکھوں میں وحشت کے سائے لہرانے لگے۔ وہ چیخیں مار کے اپنے بدن سے کیڑے نوچنے لگی۔

''یہ آدم خور کیڑے ہیں......'' جل کماری کی ہنسی بڑی سرد اور سفاک تھی۔ تھوڑی دیر کی بات ہے سنگیت کا یہ بدن جس پر اسے بڑا ناز ہے۔ اس میں سے ہڈیاں جھانکنے لگیں گی۔''

''آکاش......! بچاؤ! بچاؤ...... یہ مجھے کھا رہے ہیں...... میرا خون پی رہے ہیں...... بھگوان کے لئے بچاؤ......''

سنگیت فرط اذیت سے تڑپ کے اس کی طرف لپکی۔ اس کی حالت زخمی پرندے کی طرح ہو رہی تھی۔ آکاش نے فوراً ہی اپنے بازو فضا میں بے تابانہ پھیلا دیئے تو وہ لرزتی کانپتی ان بازوؤں کے حصار میں آ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ پل بھر کے لئے آکاش کے رگ و پے میں بھی دہشت کی بجلی کی طرح دوڑ گئی۔

آکاش نے جوں ہی اسے اپنی آغوش میں سمیٹا اور اس کے گرد بازوؤں کو کس لیا تو سنگیت کے بدن سے لپٹے ہوئے وہ بے شمار کیڑے مردہ ہو کے فرش پر گرنے لگے۔ معاً آکاش کو خیال آیا کہ اس کے گلے میں جو منکہ پڑا ہوا ہے اور سنگیت کے ہم آغوش ہونے پر وہ منکہ اس کے بدن میں لگا تو اس کے اثر سے جل کماری کے مسلط کئے ہوئے وہ موذی کیڑے مر مر کے سنگیت کے بدن سے خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑ رہے تھے۔

چند لمحوں کے بعد سنگیت کی ہذیانی چیخیں ختم ہو گئیں۔ لیکن اس کا سینہ کسی لوہار کی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ جیسے وہ میلوں دور سے اندھا دھند دوڑتی ہوئی چلی جا رہی ہو...... اس نے سنگیت کے بدن پر نظریں ڈالیں تو اس کی جلد سے جا بجا خون رس رہا تھا جیسے پسینے کے مساموں سے خون کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ نکلی ہوں۔

آکاش کے ذہن میں ایک خیال کوندا بن کے لپکا تو اس نے فوراً اپنے گریبان میں لٹکا ہوا منکہ سنگیت کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''اسے اچھی طرح سے چوسو سنگیت!'' وہ بولا۔

سنگیت نے منکہ کو منہ میں پوری طرح اندر کر کے اسے سوچنا شروع کر دیا جیسے آم کی گٹھلی چوس رہی ہو۔ آکاش کی یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی۔ وہ چند لمحوں تک منکہ چوستی رہی۔ پھر منہ سے نکال کے وہ آکاش کی آغوش سے نکل گئی۔

اس کے بدن کے سارے زخم دیکھتے ہی دیکھتے پل بھر میں مندمل ہو چکے تھے۔ آکاش نے اس کے بدن کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ بدن کی صاف و شفاف جلد پر کسی بھی زخم کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے زخم ہی نہ تھا...... اور وہ اس طرح ہشاش بشاش دکھائی دیتی تھی۔ جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، سنگیت کو بنا جیون کیا ملا وہ اور حسین دکھائی دینے لگی۔ وہ آکاش کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی میٹھے لہجے میں بولی۔

''آکاش جی! تمہارے کارن مجھے نہ صرف ایک نیا جیون ملا بلکہ میرے زخموں کو مندمل کر کے تم نے مجھے جس درد، اذیت اور تکلیف سے نجات دلائی وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی...... میں یہ منکہ تمہارے کہنے پر نہ چوستی تو یہ زخم مندمل نہیں ہو سکتے...... دیکھو...... میرے بدن کے کسی بھی گوشے میں زخم کا نام و نشان بھی نہیں رہا......!''

''آکاش......!'' یک لخت جل کماری کی خشونت بھری آواز اس گہرے سکوت میں گونجی۔

آکاش نے آواز کی سمت سر گھمایا۔ اس نے دیکھا کہ جل کماری غضب ناک ہو رہی ہے۔

''اونابکار..... سن..... جل منڈل سے تیری مکتی نہیں ہوسکتی.....؟ تو اس دو ٹکے کی چھوکری کے کارن میری بے عزتی کی..... اب میں تجھے کبھی شما نہیں کروں گی.....؟'' جل کماری کا لہجہ زہر آلود ہو رہا تھا۔

''تو مجھے خوف زدہ کررہی ہے اور ڈرا دھمکا رہی ہے؟'' وہ بے نیازی سے بولا۔ ''میں خود اب تجھے ٹھکانے لگائے بغیر جل منڈل سے ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گا.....! تو اب کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہنا؟''

''میرے پیارے آکاش جی.....!'' سنگیت اسے ابھی تک حیرت اور خوشی سے دیکھے جارہی تھی۔ ''کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں.....؟ سچ سچ کہو..... مجھے یقین نہیں آرہا ہے.....؟''

وہ آکاش کے چہرے اور گال پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ انہیں چومنے لگی۔

''تم کو کس لئے یقین نہیں آرہا ہے.....؟'' آکاش پیار سے اس کے رخسار تھپ تھپاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔

''اس لئے کہ یہ کمینی تمہیں اگن ناگ کی بھینٹ چڑھانے لے گئی تھی..... کوئی منش اگن ناگ کی بھینٹ سے بچ نہ سکا۔ میں نے جان لیا تھا کہ اب تم اس سنسار میں نہیں رہے..... آگ نے تمہیں بھسم کردیا ہوگا؟''

''اگن ناگ نے مجھے شما کردیا..... یا یہ کہو کہ میں نے اپنی زندگی میں جو اچھائیاں کیں..... انسانیت کے کام آیا اس نے میری موت کو ٹال دیا۔'' آکاش نے کہا۔ ''میری جان..... اتم نے غلطی کی جو مجھے اپنی اصلیت سے بے خبر رکھا..... تم کسی بات کی چنتا نہ کرو..... اس مکارانہ عیار سے خوف نہ کھاؤ۔ اس کی کوئی مجال نہیں کہ تمہیں ہاتھ بھی لگا سکے اور آنکھ اٹھا کے دیکھ سکے.....؟'' آکاش نے اسے دلاسا دیا۔

''لے ابھی تیرے دماغ کے کیڑے جھاڑ دیتی ہوں اور تیرا گھمنڈ نکالے دیتی ہوں۔''

جل کماری نے یہ کہہ کر اپنی جگہ کھڑے کھڑے تیزی سے گھومی جیسے چکرائی ہو..... آکاش کی نظروں کے سامنے ایسا گھپ اندھیرا چھا گیا جیسے وہ اندھا ہوگیا۔ اس کی بینائی جاتی رہی ہو۔

''سنگیت.....! سنگیت..... ! مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے.....؟ میں اپنی بینائی سے محروم ہوچکا ہوں۔''

''کیا کہا.....!'' سنگیت نے ہذیانی لہجے میں چیخ ماری وہ اس کے سینے سے آلگی۔ پھر آکاش کے چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرلیا۔ پھر وہ اس کی آنکھوں کو بے تحاشا چومنے لگی۔

آکاش چند لمحوں تک گھپ اندھیرے میں ڈوبا رہا..... پھر اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ اس کی بینائی لوٹ رہی تھی۔ جب وہ اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ سنگیت کے ساتھ ایک تنگ کوٹھری میں قید ہے..... جل کماری نے اپنی پراسرار قوتوں کے سہارے اس کے اردگرد دیواروں کا حصار کھڑا کردیا تھا۔ اور خود وہاں سے غائب ہوچکی تھی۔

''آکاش.....! تم میرے کارن کیوں اپنی زندگی داؤ پر لگا رہے ہو اور اپنی جان کی کوئی چنتا نہیں کررہے ہو.....؟ مجھ جنم جلی کو اپنے بھاگوں کا لکھا بھگتنے کے لئے اس منحوس کالی دھرتی پر چھوڑ دو..... اور یہاں سے جتنا جلد ہوسکے نکل جاؤ.....! تم نے میرا دل اور میری ذات کو اپنی محبت سے بہت زیادہ خوش کیا..... مجھ سے زیادہ تمہاری پتنی کو تمہاری ضرورت ہے۔ اس کی جگہ دنیا کی کوئی عورت نہیں لے سکتی ہے۔'' وہ معصومیت سے بولی۔

آکاش نے محسوس کیا سنگیت کے لہجے میں خلوص ہے..... محبت ہے..... سچائی ہے..... ایک گہرا جذبہ بول رہا ہے۔ اس میں ریاکاری اور منافقت نہیں تھی۔

''پگلی.....!'' آکاش نے گھپ تاریکی میں اس کے پھول سے رخسار پر دھیمے سے چپت لگائی۔ ''تم کتنی بے لوث اور ہمدرد ہو..... آج مجھے اپنی خوش بختی پر ناز ہے کہ میں اس دھرتی پر اس سرزمین پر اکیلا نہیں

ہوں...... میرے جیسا ایک اور انسان بھی ہے۔ جو میرے دل سے بھی قریب ہے۔ تم کتنی عظیم ہو سنگیت......! میں تو تمہیں ہمیشہ ناگن ہی سمجھتا رہا ہوں...... میری عقل کام نہیں کرتی ہے کہ تم کیسے اس گھناؤنے اور شیطانی چکر میں آ پھنسیں......؟"

"میری بپتا نہ صرف بڑی دکھ بھری بلکہ الم ناک ہے۔" آکاش نے اس کے لہجے سے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے آنسو پینے کی کوشش کر رہی ہے۔

"میری جان سنگیت! سناؤ...... یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں تمہاری بپتا ضرور سنوں گا...... تمہارے بارے میں، میں نے آج تک ہمدردانہ انداز سے نہیں سوچا...... اس لئے کہ تمہارا قرب، محبت...... اور دل کشی نے مجھے کچھ اور سوچنے نہ دیا...... تمہاری چاہت اور خلوص میں ڈوب کے رہ گیا...... ایک طرح سے یہ خود غرضی تھی کہ تمہیں کھلونا بنائے رکھا جس کے لئے میں شا چاہتا ہوں اور......"

"نہ...... نہ...... میری جان آکاش......! ایسا نہ کہو...... مجھ سے معافی نہ مانگو...... میں بھی تم پر بڑی فیاضی سے اس لئے مہربان ہوتی رہی اور ہر طرح سے خوش کیا کہ میں محبت کی بھوکی تھی...... تم نے مجھے بے پناہ محبت اور خلوص دیا جس سے میں آج تک محروم رہی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ تم ہوس پرست نہیں ہو؟"

پھر آکاش اس کا نرم و نازک ہاتھ پکڑ کے فرش پر بیٹھ گیا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔

"مجھے تم بے خوف ہو کر صاف صاف بتاؤ کہ تم امرتا رانی کے قبضے میں کیسے اور کیوں کر آ گئیں اور کیا مجبوریاں تھیں...... اور تمہیں ناگنوں جیسی پراسراریت اور شکتیاں کیسے مل گئیں......؟"

"پہلے تو یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرو۔ جان بچی تو یہ سب بھی سنا ڈالوں گی۔" وہ آکاش کا ہاتھ تھام کے اسے کھڑا کرنے کی کوشش کرنے لگی اور بولی۔ "کہانی سننے سے پہلے یہاں سے رہائی حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔"

"دراصل میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے تمہاری کہانی سننا چاہتا ہوں تاکہ بعد میں کوئی خلش نہ ستائے...... چلو بیٹھ جاؤ۔"

پھر سنگیت اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

"شاباش......! جلدی سے سنا ڈالو اپنی رام کہانی......؟" اس نے سنگیت کا مرمریں ہاتھ تھام لیا۔

"تم میرے ہاتھ چھوڑ دو......" اس نے غیر محسوس انداز سے اپنے ہاتھ چھڑا لیا، سکڑ سمٹ کے ہٹ کے بولی۔ "مجھے لاج آ رہی ہے۔"

"لاج آ رہی ہے......؟" آکاش مسکرایا۔ "حیرت کی بات ہے۔ ہم جب بھی ملے ہمارے درمیان کوئی فاصلہ اور پرواہ نہیں رہا۔"

"وہ اور بات تھی...... اس لئے کہ تم مجھے ناگن سمجھتے تھے۔" اس کے لہجے میں معصومیت بول رہی تھی۔ وہ اپنی باتوں سے بالکل بدلی بدلی سی دکھائی دینے لگی۔ اس کے تصور میں گزرے ہوئے ناقابل فراموش واقعات کا منظر لہرانے لگے۔ سنگیت نے کبھی کسی بات سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ایک ایک لمحہ معیت میں گزرا تھا۔ لیکن انسانوں کی نسل کی ایک حسین لڑکی کا روپ ظاہر ہوتے ہی اسے کچھ لطیف سے احساسات اپنی گرفت میں لینے لگے۔

"میں ایک سپیرن لڑکی ہوں۔" سنگیت رک رک کے بولی۔

"کیا مطلب......؟" آکاش نے چونک کے سوال کیا۔

"میری ماں کہتی تھی کہ اس نے کبھی بیاہ نہیں رچایا...... میری ماں بتاتی تھی کہ وہ بچپن ہی سے نگر نگر گھوم کے کماتی کھاتی تھی۔ اپنی جوانی کے دنوں میں ایک پاپی کے بہکانے میں آ گئی...... جب اسے اپنے کئے کا پھل پروان چڑھنے کا پتہ چلا تو اس پر بجلی سی آ گری۔ وہ اس سے پاپی سے بہت دور تھی۔ ایک رات اس نے چوری چھپے اپنا ڈیرا چھوڑ دیا۔ اس نے گھنے اور وسیع جنگل میں پناہ لے لی۔ کیوں کہ اس کے

سوا وہ تمہیں اور روپوں نہیں ہوسکتی تھی۔ میری ماں نے اپنا سارا جیون اس جنگل میں پھل چنتے گزار دیا۔ وہیں میں نے اس کی کوکھ سے جنم لیا اور وہیں میری ماں کی سادھی ہے۔ سات برس کی عمر میں مجھے ایک پرانے پیڑ کے کھوکھلے تنے سے سانپ کے دو انڈے ملے تھے...... میں وہ انڈے لے کے کٹیا سے بہت دور بھاگ گئی۔ کیوں کہ میں نے اپنی ماں سے ناگ ناگنوں کے بہت سے قصے سن رکھے تھے۔ میں کوئی بیاسی دنوں تک ان انڈوں کو اپنی بغل اور بدن کے دوسرے حصوں کی گرمی پہنچا کے سیتی رہی اور ایک روز دو چھوٹے چھوٹے کالے سانپ ان انڈوں سے باہر نکل آئے۔ انہیں دیکھ کے مجھے ڈر تو بہت لگا۔ اور بڑی ہراساں اور پریشان سی ہوگئی......

پر میں اپنے شوق کے کارن ان کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ سات مہینے بعد جب وہ سانپ بہت بڑے بڑے ہوگئے تھے تو ایک روز پراسرار طریقے سے اچانک غائب ہوگئے۔ میں سہمی سہمی جنگل میں اکیلی پھرتی رہی اور ان کی تلاش میں کئی جگہیں چھان ماریں پر ان کا کہیں پتا نہ چلا۔ لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ انہیں تلاش کرتی رہی۔

اس واقعہ کے چار روز بعد میں سو رہی تھی۔ تو میں نے اپنے سینے پر ہلکا بوجھ محسوس کیا جس سے میں بیدار ہوگئی۔

اپنے سینے پر ایک بہت موٹی سفید ناگن کو بیٹھے دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے اور ایک زوردار چیخ مار کے میں ایک سمت بھاگ پڑی۔ لیکن اس سفید ناگن نے سرعت سے میرا راستہ روک لیا اور زمین پر لوٹ پوٹ کے ایک نہایت ہی حسین عورت کے بہروپ میں آگئی۔ وہ سفید ناگن امرتا رانی ہی تھی...... اس نے مجھے پیار سے لپٹا کے اور بے تحاشا چوم کے دلاسا دیا اور مجھے بتایا کہ میں نے بڑے پریم کے ساتھ جس طرح دونوں انڈوں اور سانپوں کی دیکھ بھال کی تھی وہ اس سے بے حد خوش ہوئی ہے۔ اس نے اروشی دیوی کی آگیا سے مجھے یہ خبر سنائی کہ میرا روپ سدا بہار رہے گا۔ میں جب تک زندہ رہوں گی...... بڑھاپا، بدصورتی میرے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔ میرا حسن دل کشی بے مثال اور لازوال ہوگی۔

اور پھر اس نے ساتھ ہی مجھے بہت سی شکتیاں بھی دیں اور ان سے کام لینے کے گر بتائے...... اور منتر بھی...... بس اسی دن سے میں امرتا رانی کی سکھی بنی ہوئی ہوں...... میرے ہر کام میں اس کی آگیا ضرور ہوتی ہے...... جب تم شیونگ کے چکر میں مون ہاٹ کے مندر کے پاس جو مرہٹہ مندر بھی کہلاتا ہے پھنس گئے تھے تو امرتا رانی ہی نے مجھے وہاں والے جنگل میں پہنچایا تھا اور مجھے تمہارے ساتھ کردیا تھا......'' اتنا بتا کے وہ خاموش ہوگئی۔

آکاش کئی لمحوں تک خاموش بیٹھا رہا۔ اب اسے یاد آیا تھا کہ اس نے سنگیت کو کبھی بھی غیر انسانی روپ میں نہیں دیکھا۔ لاشعوری طور پر اسے اس کی جانب سے کچھ خلش بھی تھی۔ لیکن اس کی بپتا سننے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔

''آکاش پیارے......! تم اگن ناگ سے کیسے بچ نکلے......؟'' چند لمحوں کے بعد سکوت توڑتے ہوئے سنگیت نے سوال کیا۔

''میری خود سمجھ میں کچھ نہیں آیا......؟'' آکاش نے چونک کے تیز لہجے میں جواب دیا۔ ''معلوم نہیں...... امرتا رانی کے منکے کی وجہ سے مجھے ہلاک نہ کرسکا یا پھر اروشی دیوی کی سفارش سے میری جان بخشی ہوئی ہو۔''

''منکہ......؟'' وہ تحیر آمیز لہجے میں بولی۔ ''آکاش جی......! دیوتاؤں کے اوپر منکے اور شکتیاں کچھ نہیں کرسکتے...... اروشی دیوی نے ہی منا لیا ہوگا...... تم پوری کتھا تو سناؤ......؟''

آکاش نے اختصار سے کام لے کے اسے پوری کہانی سنادی۔

''بھگوان کی بڑی کرپا ہے آکاش جی......!'' وہ

اس کے خاموش ہونے پر کانپتی ہوئی پرمسرت لہجے میں بولی۔ ''آخری سے پر تمہاری جان بچ گئی۔ میں نے تمہاری زندگی سے مایوس ہوکر ہتھیا کرلی تھی...... مجھ سے بڑی بھول ہوئی میرے آکاش جی! اب میرا بوجھ بھی تم پر آن پڑا ہے...... آتما ہتھیا کے کارن میری ساری شکتی نشٹ ہوچکی ہے...... اب میں پہلی سی سنگیت نہیں رہی ہو...... بس اب تمہیں اپنے بل، ذہانت اور تدبیر سے جل منڈل سے باہر نکلنا ہوگا۔''

''امرتا رانی کو کچھ بھی تو معلوم نہ ہوگا؟'' آکاش پریشان اور متفکر سا ہوگیا۔ ''وہ کالی بھومی کے جزیرے پر میری راہ تک رہی ہوگی؟''

''اب میں اسے کچھ بتانے یا اطلاع دینے سے قاصر ہوں۔'' سنگیت نے سرد آہ بھر کے کہا۔ ''کاش! میں اپنی شکتیوں سے محروم نہ ہوئی ہوتی...... تمہیں پل بھر میں امرتا رانی کے پاس پہنچادیتی۔''

یہ تیرہ تاریک کوٹھری جس میں دو فرد صرف اس طرح لیٹ سکتے تھے کہ وہ کروٹ نہیں لے سکتے تھے صرف سر جوڑ کے بیٹھ سکتے تھے۔ صرف ایک فرد کی گنجائش تھی جو وہ آرام سے لیٹ اور بیٹھ سکتا تھا۔ انہیں جیسے کسی شے کی طرح ٹھونس دیا گیا تھا۔ وہ دونوں کو نہ صرف ایک دوسرے کا قریب بلکہ ان کی سانسیں بھی جسموں اور چہروں پر محسوس ہورہی تھیں۔ سنگیت ایک نوجوان اور خوبرو دوشیزہ تھی۔ گوکہ سنگیت سکڑ سمٹ کے گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ تاہم کسی حرکت پر اس کا لطیف، اچھوتا لمس آکاش کو محسوس ہوتا تو اس کے سارے بدن میں سن سناہٹ بجلی کی رو بن کے دوڑنے لگتی۔

''سنگیت......! آکاش نے اندازے سے ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''ہوں......'' وہ سرگوشی میں بولی۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ آکاش اس سے کیا کہنا چاہتا ہے۔

''بھگوان نے تمہیں ایک نیا جیون دیا اور میں موت کے منہ سے اپنی نئی زندگی پاکے نکلا ہوں۔'' آکاش نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا تمہیں خوشی نہیں ہورہی ہے......! یہ کس قدر فرحت انگیز ہے؟''

''میں کتنی خوش ہورہی ہوں میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ بیان کرسکوں۔'' اس نے آکاش کا ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیا۔

آکاش نے اس کی مرمریں کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے قریب کیا تو وہ احتجاج بھرے لہجے میں بولی۔

''میرے پیارے آکاش......! خود کو قابو میں رکھو...... یہ سمے جذبات میں بہنے کا نہیں ہے...... ایک ایک پل بڑا قیمتی ہے...... جتنا جلد ہوسکے جل منڈل سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرو۔ پھر میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

آکاش نے جان لیا تھا کہ جل کماری نے دانستہ ان دونوں کو اس تیرہ تاریک کوٹھری میں بند کیا ہے کہ وہ جانوروں کی سی حالت میں یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر سوچ نہ سکیں۔ وہ غلاظت کے دلدل میں دھنسے رہیں۔

وہ اس کوشش اور کش مکش میں تھا کہ سنگیت سے فائدہ نہ اٹھائے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنگیت کو اپنی دسترس میں لیتا یک لخت اس کے معدے میں درد کی لہر پوری شدت سے اٹھی تو وہ ایک دل خراش سی چیخ مار کے دہرا ہوگیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے پیٹ میں گھسے ہوئے کچھ زندہ وجود حلق سے باہر آنے کے لئے اپنا پورا زور لگا رہے ہوں۔ اس کے معدے میں اور سینے میں ناقابل برداشت اینٹھن ہونے لگی تھی۔ سویوں کے روپ میں اس کے بدن میں اتر جانے والے موذی سانپ بری طرح کلبلانے لگے تھے۔ وہ اپنا سینہ پکڑ کے چیخیں مارنے لگا۔

''کیا ہوا آکاش جی......؟'' سنگیت اس کی حالت محسوس کرکے ہراساں ہوگئی۔

چوں کہ اس وقت وہ آپے سے باہر ہوا تو اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ کسی زیر اثر طاقت کے بل پر اوپر اٹھا اس نے سنگیت کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔

اس تنگ کوٹھری میں سنگیت کی چیخ گونج گئی۔ وہ ایک طرف سمٹنے لگی۔

"دیا کرو میرے بھگوان! میرے من کے دیوتا کو یہ اچانک کیا ہوگیا ہے......؟" وہ سسک پڑی۔

آکاش کی دیوانگی کو وہ سمجھ گئی تھی۔ اس کی وجہ شاید جل کماری کی حرکت ہے جو یک لخت بدل گیا۔ غصے میں آگیا۔ سنگیت دوبارہ اس کے قریب ہونے کی ہمت نہ کرسکی۔ اس سے فاصلہ کیا تھا۔ چند انچوں کا...... وہ جتنا خود کو سمیٹ سکتی تھی سمیٹ دبی دبی آواز میں سسکیاں بھرتی رہی۔ آکاش کو اپنی دیوانگی کا احساس ہوا تو وہ اپنی اذیت میں گرفتار فرش پر تڑپتا رہا۔

اگلے لمحے آکاش نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ کے سختی سے دبایا لیکن اس کی تکلیف میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بے بسی اور مظلومیت کے ان سفاک لمحات میں اسے منکے کا خیال آیا اور اس نے اضطراری طور پر اسے منہ میں رکھ لیا لیکن بے سود...... اگن دیوتا کی مسلط کی ہوئی اس مصیبت سے نجات نہ مل سکی۔ کیوں کہ دیوتاؤں کے آگے کوئی شکتی واقعی نہیں چل سکتی۔ اسے جیسے یقین نہ آیا۔ کیوں کہ اس کے معدے میں گھسے موذی سانپوں کی بے قراری غیر متوقع طور پر ختم ہوگئی۔ وہ چند ثانیوں تک فرش پر بے حس و حرکت پڑا رہا کہ شاید پھر سابقہ درد اور تکلیف جنم لے۔ لیکن جب خاصی دیر تک کوئی تکلیف محسوس نہ ہوئی تو اس نے دل میں ایشور کا شکر ادا کیا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

سنگیت نے ابھی تک خود کو آکاش کے جسم سے بچائے رکھا ہوا تھا۔ فضا میں اس کی دبی دبی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔

"میری جان سنگیت......! ایشور کے لئے مجھے معاف کردو۔" اس نے سنگیت کو اس کی سانسوں سے محسوس کرکے اس سمت منہ کرکے کہا۔

"درد کی شدت ایسی تھی کہ میں اپنے حواس پر قابو نہ پاسکا۔ تم پر ہاتھ اٹھادیا۔"

وہ تڑپ اٹھی اور کسی معصوم بچی کی طرح اس سے لپٹ کے رونے لگی۔

"سنو...... رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں......" وہ اسے اپنے سینے میں جذب کرکے اس کے ریشمی بالوں کو سہلانے لگا۔ "تمہارے ذہن میں یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر ہے تو بتاؤ...... کیا ہماری اس افتاد کی اطلاع امرتا رانی کو مل سکتی ہے......؟ شاید وہ ہمیں اس زندان سے نکال دے؟"

"میں تو سب کچھ بھول چکی ہوں۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میری ساری شکتیاں چھن چکی ہیں آکاش جی! میں اب تمہاری کوئی سہایتا نہیں کرسکتی...... پرتم پر بوجھ ضرور ہوں...... اگر تمہیں جل منڈل سے مجھے نکال کے لے جانا بھاری پڑے تو اس کی ایک صورت ہے کہ میرا گلا گھونٹ کے اکیلے نکل جانا۔ تمہاری خوشی کے کارن میری آتما پرلوک میں بھی سدا سکھی رہے گی اور میں وہاں بھی تمہیں یاد کرتی رہوں گی۔"

آکاش نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سنگیت کا ایک ایک لفظ سچائی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میری وہ غم گسار، مخلص اور مددگار دوشیزہ محض اس کی خاطر اپنے قبضے سے پراسرار اور ماورائی قوتیں کھو بیٹھی تھی جن کے حصول کے لئے اسے جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی تھی۔ امرتا رانی نے اسے شکتیاں دی تھیں۔

آکاش کا ذہن کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ غیر محسوس انداز سے کسمساتی ہوئی اس کی آغوش سے نکل آئی۔ ایسا نہ کرتی تو آکاش جذباتی افراتفری کا شکار ہوجاتا۔ آکاش بدستور کھوئے کھوئے انداز میں کھڑا رہا۔ اس لمحے وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا ذہن اس قدر معطل ہوچکا تھا کہ وہ اس میں ایک خلا سا محسوس کررہا تھا۔ اس کے دماغ اور کنپٹیوں میں بیک وقت جیسے ہزاروں سنپولئے رینگ رہے ہوں۔ وہ خود کو اذیت میں دھنستا محسوس کررہا تھا۔

(جاری ہے)

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

روکے کہاں رکے ہیں محبت کے قافلے
بس یوں ہوا کہ دل نے زمانے بدل دیئے
دیکھا تو اپنا آپ تھا نوکِ شکست پر
یوں وقت نے ہمارے نشانے بدل دیئے
(بلقیس خان...... پشاور)

کیوں ہم سے روٹھ گئے خوشی کے راستے
جو چاہا وہ مل نہ سکا غم ہی پائے ہیں
تذکرہ کسی سے کریں تیری بے وفائی کا
قسمت میں داغ دل کے پھر جلائے ہیں
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

میں اداسیاں نہ سجا سکوں کبھی جسم و جاں کے مزار پر
نہ دیئے جلیں میری آنکھ میں مجھے اتنی سخت سزا نہ دے
میرے ساتھ چلنے کے شوق میں بڑی دھوپ سر پہ اٹھائے گا
تیرا ناک نقشہ ہے موم کا کہیں غم کی آگ گھلا نہ دے
(جاوید مائیکل...... کراچی)

زندگی تو اپنے ہی قدموں پہ چلتی ہے فراز
اوروں کے سہارے تو صرف جنازے اٹھا کرتے ہیں
کون دیتا ہے عمر بھر کا سہارا اے فراز
لوگ تو جنازے میں بھی کندھے بدلتے رہتے ہیں
(فاطمہ سلیم...... کراچی)

میری آنکھیں رکھ لو مجھے کچھ خواب دے دو
جس میں تمہاری جھلک ہو ایسی کتاب دے دو
چلو چھوڑو ساری باتیں، اک بات مان جاؤ
میری ساری عمر لے لو بس اک پل کا ساتھ دے دو
(شرف الدین جیلانی...... ٹنڈوالہ یار)

جس کو ہم چاہتے تھے اس کو چاہ نہ سکے
جس کو تم چاہتے تھے چاہ نہ سکے
پیار تو دل توڑنے کا کھیل ہے
کسی کا ٹوٹا دل بچا نہ سکے
(محمد قاسم رحمان...... ہری پور)

بچھڑا ہے جو اک بار تو ملتے نہیں دیکھا
اس زخم کو ہم نے کبھی سلتے نہیں دیکھا
اک بار جسے چاٹ گئی دھوپ کی خواہش
پھر شاخ پہ اس پھول کو کھلتے نہیں دیکھا
(عثمان غنی...... پشاور)

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
ایک شخص پورے شہر کو ویران کر گیا
(محسن عزیز حلیم...... کوٹھا کلاں)

بے وفائی تو سب کرتے ہیں
آپ تو سمجھ دار تھے کچھ تو نیا کرتے
(عبدالحلیم محسن...... کوٹھا کلاں)

ہم تو اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا وعدہ کر بیٹھے
ہمیں کیا پتہ ہمیں چھوڑنا بھی اس کی ایک خواہش تھی
(محمد عاصم اشفاق...... صادق آباد)

آنسو سے کہا کہ تنہائی میں آیا کرو
اتنے سارے لوگوں میں مذاق نہ بنایا کرو
اس پر آنسو تڑپ کے بولا اتنے لوگوں میں
تجھے تنہا پایا تو ساتھ دینے میں چلا آیا
(طاہر اسلم بلوچ...... سرگودھا)

محبت اس کی خاموشی اسی کی بات جیسی ہے
محبت کو اگر سمجھو تو میری ذات جیسی ہے
(فلک فیضان...... رحیم یار خان)

ہم ہنستے ہیں تو انہیں لگتا ہے کہ ہمیں عادت ہے مسکرانے کی
نادان اتنا بھی نہیں سمجھتے یہ اک ادا ہے غم چھپانے کی
(ثروت عزیز گوشی...... کوٹھا کلاں)

ٹھکرا کر میری محبت کہاں جانے کا ارادہ ہے
یہ پیار کا عروج ہے یا چھوڑ جانے کا ارادہ ہے
جاتے جاتے یہ بتا جاؤ اے حلیم
میرے پیار میں تھی کمی یا کسی اور سے دل لگی کا ارادہ ہے
(انتخاب۔ محسن عزیز حلیم...... کوٹھا کلاں)

ہم نے چرچا بہت سنا تھا تیری سخاوت کا
کیا پتا تھا کہ تو درد بھی دل کھول کر دیتا ہے
(منزہ محسن...... کراچی)

غزل

دکھ سہنے میں ماہر ہوں میں
تیری حد سے باہر ہوں میں
میں نے تجھے تسخیر کیا تھا!
دیکھو کہیں ساحر ہوں میں
تیرا احساں کیسی لیتی؟
اپنے رب کی شاکر ہوں میں
ٹوٹ گئی اپنے لفظوں میں
ساغر ہوں یا شاعر ہوں میں
تیرے در پہ رک جاتی ہوں
تیری گلی کی زائر ہوں میں
کچے گھڑے پہ تر جاؤں گی
طوفانوں کی سائر ہوں میں
خانم رب تو جانتا ہے سب
باطن والا ظاہر ہوں میں
(فریدہ خانم......لاہور)

وہ کیا سمجھیں گے رازِ بے قراری غم کے ماروں کا
بگڑتا کیا ہے ان کی چشمِ رنگیں کے اشاروں کا
بہار آئی ادھر، بدل گیا دستورِ میخانہ
مقدر عین فصلِ گل، میکساروں کا
دریدہ پیرہن گل، زرد کلیاں، غمزدہ غنچے
نرالا رنگ ہے اس بار دگ گلشن کی بہاروں کا
بلا سے جاں پہ بن جائے کسی لاچار و بیکس کی
نہ بدلے گا خرام بے نیازانہ ستاروں کا
اسے شکوہ ہو کیوں اغیار کی بے التفاتی پہ
جو ممنونِ ستم رہتا ہو اپنے غمگساروں کا
میری کشتی کو طوفاں سے الجھا دیکھ کر واجد
مجھ سے منہ پھیر لینا یاد ہے اب تک کناروں کا
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

چپ بھی ہوتی نہیں عیاں تم سے
بات ہوتی نہیں بیاں تم سے

جب پتہ تیرا لامکانی ہے
کوئی ملتا بھلا کہاں تم سے
مر مٹے تیرے نقش پا پہ اب
نام بھی تم سے ہے نشاں تم سے
تم سے روشن ہیں ہجر کی راتیں
دن کی آہوں کا ہے دھواں تم سے
دیکھتا ہوں میں تیری آنکھوں سے
ہے قمر میرا تو جہاں تم سے
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

اپنوں سے منہ موڑ کر جایا نہیں کرتے
اے میرے ہمسفر دل کسی کا دکھایا نہیں کرتے
راہ میں لاکھوں ہوں دشواریاں زمانے میں
دامن پھر کسی سے یوں چھڑایا نہیں کرتے
دوستی ہی میں اعتماد بحال رکھنا
اپنے ہی یاروں کو یوں آزمایا نہیں کرتے
دنیا ہے دوستو فانی مرنا ہے یہاں سبھی نے
دشمن کی موت پہ یوں خوشیاں منایا نہیں کرتے
غم کے ماروں کی آہ تو جاتی ہے عرش پہ
مشکل میں دیکھ کے کسی کو مسکرایا نہیں کرتے
بڑھتے ہوئے طوفانوں کا رخ موڑ دیں
مشکل حالات میں آندھیوں سے گھبرایا نہیں کرتے
جاوید ہماری دشمنی ہو جاتی ہے زمانے سے
اس واسطے گھروندے ریت کے یوں بنایا نہیں کرتے
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

بس ایک درد ہے جو زندگی سے جا نہ سکا
یہی سبب ہے اسے میں کبھی بھلا نہ سکا
اسی وجہ سے کہ تنہائیاں تھیں ساتھ میرے
میں اس کے خانہ دل میں کبھی سما نہ سکا
اسے میں ڈھونڈ رہا تھا نگار ہستی میں
وہ ایک گزرا ہوا پل تھا، ہاتھ آ نہ سکا
میرا نصیب تو دیکھو میرے رفیقو تم
کہ اس کے پاؤں کی خاک میں تو پا نہ سکا
ہوا سے دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا مگر
میں روشنی کے لئے اک دیا جلا نہ سکا

یہ رانا کیسی ہیں مجبوریاں میرے آگے
میں اس کے سامنے اشکِ وفا بہا نہ سکا
(قدیر رانا......راولپنڈی)

دیوانوں کی قسمت میں دکھ درد تو ہوتے ہیں
کرتے ہیں محبت جو چھپ چھپ کر روتے ہیں
نیند آتی ہے دونوں کو بس فرق تو اتنا ہے
تم پھولوں پر سوتے ہو ہم کانٹوں پر سوتے ہیں
جو داغ جدائی کا دلبر نے دیا ہم کو
ہم اشکوں کے پانی سے اس داغ کو دھوتے ہیں
دن رات محبت میں دل اس کا تڑپتا ہے
جو تیر نگاہوں کے اس سل میں چبھوتے ہیں
روتے ہیں کہاں یارو غیروں کی میت پر
مر جائے اگر اپنا دل دل میں روتے ہیں
بیدرد ہیں جو انسان دل ان کے پتھر کے
وہ پیار کے پھولوں کو کانٹوں میں پروتے ہیں
(طاہر اسلم بلوچ......سرگودھا)

حالِ دل اب کسی کو ہم سناتے نہیں
لوگ پوچھتے ہیں مگر ہم بتاتے نہیں
جن زخموں سے نوازا ہے تونے ہمیں
چھپائے رکھتے ہیں وہ کسی کو ہم دکھاتے نہیں
اس قدر مخلص ہیں تیرے پیار میں صنم
ہم تصویر میں بھی دل تیرا دکھاتے نہیں
بس تو آیا ہے دل کی دھڑکن میں تو سمایا ہے
ہر کسی کو ہم دل میں بساتے نہیں
فقط تیرے در پہ آیا ہے طیب، محبت کا سوالی بن کر
ورنہ ہاتھ کسی کی چوکھٹ پر ہم پھیلاتے نہیں
(شاعر طیب بٹ۔ انتخاب انعم شہزادی......گجرات)

اجمال میں تفصیل کا انداز سمجھنا
پوشیدہ پسِ حرف ہے جو راز سمجھنا
بانگِ جرس اور دل کے دھڑکنے کی صدا میں
گہرا ہے جو اک رشتہ آواز سمجھنا
شائستہ غم ہر کس و ناکس نہیں ہوتا
ہر مونس و ہمدم کو نہ ہمراز سمجھنا
وہ طائر آزاد کہ پابند قفس ہے
ہر آن اسے مائل پرواز سمجھنا
جس عہد سے وابستہ ہیں سب خواب ہمارے
جینا ہے تو اس عہد کی آواز سمجھنا
جب چاہو چلے آؤ تمہارا ہی تو گھر ہے
اپنے لیے دروازہ دل باز سمجھنا
جو شاخ ہجوم ثمر و گل سے جھکی ہے
اس شاخ خمیدہ کو سر فراز سمجھنا
اک نغمہ ہے تار نفس گل میں بھی امتیاز
بلبل ہی کو کیوں زمزمہ پرواز سمجھنا
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

کوئی الزام لگا کر تو سزا دی ہوتی
پھر میری لاش سر بازار جلا دی ہوتی
اتنی نفرت تھی تو پیار سے دیکھا کیوں تھا
مجھے پہلے ہی میری اوقات بتا دی ہوتی
دیکھ کر زخم میرے آنکھ چرالی تم نے
پوچھ کر کچھ تو زخم کی دوا دی ہوتی
سوجاتا میں بھی چین سے
تونے اگر شوق سے آنچل کی ہوا دی ہوتی
زندگی اپنی بھی چین سے گزر جاتی تھی
بس تونے اگر پیار سے دل میں جگہ دی ہوتی
(صبا محمد اسلم......گجرانوالہ)

محبت ہم نے کی جو اک خطا ہوگئی
کی وفا اور زندگی سزا ہوگئی
وفا کرتے رہے ہم عبادتوں کی طرح
پھر عبادت خود اک گناہ ہوگئی
کتنا سہانا تھا سفر جب ساتھ تھے ہم
پھر کیا ہوا کیوں منزل جدا ہوگئی
کوئی چاہت کوئی حسرت کوئی امید نہ رہی
وہ گیا تو لگا کہ دنیا فنا ہوگئی
یہ دعا کی کہ تو جسے چاہے وہی ملے
ہم سے تو ہماری محبت فنا ہوگئی
(محمد ندیم عباس سواتی......چوکی)

ہم بھی کسی کو چاہنے لگے ہیں
نصیبوں کو اپنے جگانے لگے ہیں
کوئی مانے نہ مانے خدا کی قسم
ان کی نظروں سے خنجر سہانے لگے ہیں
ان کی آنکھیں نشیلی ہونٹ رسیلے
اپنا جسے ہم بنانے لگے ہیں
وہ ملے نہ ملے یہ بات الگ ہیں
ہم اپنی دعاؤں کو بڑھانے لگے ہیں
کس قدر وہ حسین ہیں تمہیں کیا بتائیں
کہ اس کی تکمیل میں کتنے زمانے لگے ہیں
بے تحاشہ نہ تم نکلا کرو اپنے گھر سے
کہ تمہیں دیکھ کر لوگ للچانے لگے ہیں
یہ حماقت نہیں ہے تو اور کیا ہے
فسانے کے پیچھے جان لٹانے لگے ہیں
وجہ کوئی بھی مگر یہ حقیقت ہے خالد
ساحل انہیں دل سے چاہنے لگے ہیں
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

رہی کڑی دھوپ میں جلتے ہوئے پاؤں کی طرح
تو کسی اور کی آنگن میں ہے چھاؤں کی طرح
تو واقف ہے میرے جذبوں کی سچائی سے
پھر کیوں خاموش ہے پتھر کی طرح!
میں تو خوشبو کی طرح ساتھ رہا ہوں تیرے
تو بھٹکتا رہا بے چین وفاؤں کی طرح
وہ جو برباد ہوئے تھے وہی بدنام ہوئے ہیں
تم تو معصوم رہے اپنی اداؤں کی طرح
غم تو یہ ہے کہ ہمیں کوئی خوشی راس نہیں
زندگی کاٹ رہے ہیں ہم سزاؤں کی طرح
(آصفہ سراج......لاہور)

جہلم کنارے بیٹھ کر دونوں پھولوں کی برسات کریں
موتی پرو کے ان آنکھوں میں سپنوں پہ ہم بات کریں
سنہری پریاں پر پھیلائے جنت کی آغوش بنائیں
گم ہو جائیں اس جنت میں رنگوں کی بارات کریں
ریشم جیسی ٹھنڈی ہواؤں میں بکھری ہوئی زلفوں کی فضا میں
نینوں کی پھر بول کے بولی جزبوں کو بے تاب کریں
پہلے کاجل جیسا ہو بادل اڑتا ہوا میں رنگیں آنچل
سیپوں میں جیسے بند ہیں موتی ایسی ہم ملاقات کریں
ساز بجائیں بارش کی بوندیں سنتے جائیں ہم آنکھیں موندھے
گیتوں اور غزلوں کے مکھڑے پر لفظوں کی برسات کریں
کان کی بالی گال پہ ناچے سر اور تال پہ کنگن ناچے
گجروں کی مہکار پہ بے سدھ ہر شب کو شب بارات کریں
نیلا سمندر اور اس کا ساحل چھم چھم کرتی ریت پہ بادل
رقص کرتی ہواؤں میں لہریں خوشبو کی سوغات کریں
(فلک فیضان......رحیم یار خان)

فراقِ عشق میں اترے، مسلسل اشک باری ہے
فصیلِ غم گرے گی جب سحر تازہ ہماری ہے
تمہارے رخ سے پاتا ہے سحر دم روشنی سورج
تمہارے رخ کے جلوؤں نے مری ہستی سنواری ہے
فقط اک زندگانی تھی، سو کی قرباں تری خاطر
وگرنہ دہر سے پوچھو، بڑی قیمت ہماری ہے
بڑی دلکش بہار آئی مگر بے سود آئی ہے
گلستانِ شب غم میں ہر اک ساعت گزاری ہے
قدم بحر محبت میں ذرا تم سوچ کر رکھنا
اگر یہ زندگی تجھ کو اے میرے یار پیاری ہے
دکھا خورشید کو فائق رخ محبوب کا جلوہ
کہ جس کے حسن نے صورت ہر اک گل کی سنواری ہے
(عمران فائق......اٹک)

دسمبر کی ٹھنڈی راتوں میں
جب نیند نہیں آتی سب سے
آنکھوں میں تب یادوں کی دھند چھاتی ہے
پھر دیکھتے ہیں ہم دور بہت آکاش پہ چاند نظر آتا ہے
وہ بھی تو اکیلا ہوتا ہے
رات کے اندھیرے میں آنسو ٹپکتے ہیں میرے
کوئی اس وقت پونچھنے والا
یہ دسمبر کی رات بھی کتنی قاتل ہوتی ہے
دسمبر کی سرد راتوں میں کاش تم ساتھ ہوتے
تم ساتھ نہیں ہو یہ کڑوی سچائی پینی پڑتی ہے
لحاف کو اوڑھتے ہیں اور..........
(محسن عزیز حلیم......کوٹھا کلاں)

پھر آیا برسات کا موسم
بھرے ہوئے جذبات کا موسم
آج بھی چشم تر میں رقصاں
تجھ سنگ میل ملاقات کا موسم
ذکر بہاراں خوب ہے لیکن
اپنے لئے ہے مات کا موسم
شاید کوئی جان سے جائے
سر پہ ہے کتنا رات کا موسم
یاد ہے مجھ کو اب تک رانا
تری ہر اک بات کا موسم
(قدیر رانا...... راولپنڈی)

اے میری طبیب مجھ کو
دوا نہ دے
کہ......
لاعلاج ہے مرض میرا
میں بے بسی کی وہ
مورت ہوں
کہ......
جو کو آب حیات کے
دھوکے میں
کسی کے پرحدت ہونٹوں نے
سنہری زہر پلا دیا تھا!
(عطیہ زاہرہ...... لاہور)

دل پیاس کا دریا ہے
بے چین سا رہتا ہے
دل درد کا ٹکڑا ہے
بے سکون سا رہتا ہے
(بلقیس خان...... پشاور)

مجھے تم سے محبت ہے
نہ جانے کتنے لوگوں نے
نہ جانے کتنے لوگوں سے
یہی جملہ کہا ہوگا
یہی جملہ سنا ہوگا
مگر یہ سوچتا ہوں میں
کہ لفظوں کا سہارا بھی
تو آخر اک سہارا ہے
تمہاری میری چاہت کو
کسی لفظی سہارے کی
ضرورت ہی بھلا کیوں ہو
سحر انگیز لمحوں کو
سحر انگیز رہنے دو
سکوت آشنائی میں
فقط اپنے تبسم سے
مرے کانوں میں رس گھولو
نہ میں بولوں نہ تم بولو......!
(ایس۔ امتیاز احمد...... کراچی)

ہم کو چلنا ہے ابھی
منزل نہیں ہے کوئی
راستے تو ہیں بہت
تیری تلاش میں جاناں
چلتے تو ہیں بہت
اے میرے پاؤں کے زخم
صرف دو چار قدم
ہم کو چلنا ہے ابھی
وقت بدلنا ہے ابھی
صرف دو چار قدم
ہم کو چلنا ہے ابھی
(منیر احمد ساغر...... میاں چنوں)

جاناں! تم نے دیر لگا دی
وہ سب کہنے میں
جن میٹھے بولوں کی خاطر
ہم نے اپنی عمر گنوا دی
اب آئے ہو......
وقت نے جب ان آنکھوں پر
شام بچھا دی
جاناں! تم نے دیر لگا دی
(نسرین اختر...... لاہور)

دل سوچ کا پنجرہ ہے
اک بار کھلتا ہے
دل پیار کا سودا ہے
اک بار ہی ملتا ہے
دل یاد کا بادل ہے
بے انت برستا ہے
دل پیار کا بھوکا ہے
اپنوں کو ترستا ہے
دل موج کا دریا ہے
سینے سے نکلتا ہے
دل برف کا تودا ہے
جمتا نہ پگھلتا ہے

اے میرے ہم سفر
صرف دو چار قدم
ہم کو چلنا ہے ابھی
منزل نزدیک ہے
بات بنتی ہے ابھی
وقت بدلنا ہے ابھی
صرف دو چار قدم
ہم کو تو چلنا ہے ابھی
ہر طرف اندھیرا ہے
دل میرا یہ کہتا ہے
پاس ہی سویرا ہے
اے میرے ہم سفر
صرف دو چار قدم

چلو میں بتاؤں کیا ہو تم
میری دنیا میرا جہاں ہو تم
چھو کر جو گزرے وہ ہوا ہو تم
میرے دل نے جو مانگی وہ دعا ہو تم
کرنے مجھ کو روشن وہ دیا ہو تم
دل میں چھپا اک راز ہو تم
کیا میں نے محسوس وہ احساس ہو تم
میرے ہونٹوں کی پیاس ہو تم
میری بانہوں کی آس ہو تم
میری نظر کی تلاش ہو تم
میری زمین کا آسمان ہو تم
میری زندگی کا قرار ہو تم
میں نے جو چاہا وہ پیار ہو تم
(محمد شہباز سعید...... میاں چنوں)

خونی دنیا

نور محمد کاوش۔سلانوالی سرگودھا

نوجوان اچھا بھلا بیٹھا تھا کہ اچانک اس کے پورے جسم میں ایک عجیب ناقابل برداشت بے چینی سرایت کرگئی اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس پر سحر پھونک دیا گیا ہو اور پھر وہ کچھ ہوگیا جس کا تصور ناممکن تھا۔

جسم وجاں کو تھراتی ہوئی ایک عجیب وغریب ہولناک خوفناک ناقابل فراموش لہولہو کہانی

''ہم دونوں میاں بیوی میں بہت محبت تھی۔ ہماری شادی بھی لومیرج تھی یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں کو اپنی اپنی فیملی سے فارغ ہونا پڑا لیکن پھر بھی ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑا کیونکہ محبت امتحان تو لیتی ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ محبت کے امتحان بہت سوہان روح ہوتے ہیں ساری زندگی تڑپاتے ہیں مگر......

اندینہ بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے بھی قربانی دینی پڑی اور ویسے بھی قربانی تو اس نے بھی دی تھی۔ ایم ایس سی میتھ کیا تھا اور یونیورسٹی میں ایک اچھی لیکچرار کی خدمات سرانجام دے رہی تھی۔ پارٹ ٹائم اس نے گھر میں ہی ٹیوشن سینٹر بنایا ہوا تھا۔ میں نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد چائلڈ اسپشلسٹ کیا تھا۔ اس طرح ہم دونوں کی ماہانہ آمدن اتنی ہوجاتی تھی کہ ہمارا گزر بسر بہت اچھا ہو رہا تھا۔ ہم نے اپنی مرضی سے جگہ لے کر شہر میں ہی ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کرائی تھی......''

وہ خونی بولتے بولتے اچانک چپ کرگیا اور کسی گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ اس کی عرق آلود پیشانی پر چند پریشانی کی سلوٹیں نمودار ہوئیں مگر جلد ہی ماند پڑ گئیں اور اس نے میری طرف ایک گہری نگاہ سے دیکھا اور دوبارہ گویا ہوا۔!

''یقین مانیے جبرال صاحب! انجانے مجھے اس رات کو کیا ہوگیا تھا۔ مجھ پر...... مجھ پر ایک جنونی کیفیت حاوی ہوگئی تھی اور میں نے اپنی وائف کو ایک بھیانک موت ماردیا۔ میں نے دیکھا کہ اندینہ کی آنکھوں میں بے یقینی کے جگنو تھے جن کی چمک آہستہ آہستہ ماند پڑ گئی۔ اس وقت مجھ پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ مجھے نہ صرف اس کا خون پینا ہے بلکہ اس کے گوشت سے اپنی بھوک ختم کرنی ہے اور جب میں اپنے کام سے فارغ ہوکر ہوش وحواس کی دنیا میں پلٹا تو میرے قدموں تلے سے زمین سرک گئی، میں انگشت بدنداں رہ گیا کہ میں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی پیاری بیوی جو مجھ پر جان نچھاور کرتی تھی اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔''

بے یقینی سے ہونٹ بھینچتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جیسے اسے اپنی باتوں پر یقین نہ ہو کہ وہ جو کچھ بیان کررہا ہے آیا وہ سچائی میں گندھی آپ بیتی ہے یا ایک بھیانک خیال۔

''مگر اب روتے دھوتے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے مترادف مگرمچھ کے آنسو بہانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری دنیا لٹ چکی تھی

اوراس سارے دل خراش واقعہ کا کارن وہ کمینہ تھا جو مجھے اپنی وحشی دنیا میں لے گیا اور میری زندگی کا قلع قمع کرکے رکھ دیا، اسی کے کارن آج میں سلاخوں کے پیچھے اپنی بے بسی کا ماتم کررہا ہوں۔"

"آپ مکمل تفصیل سے بات بتائیں......تاکہ آپ کی اس آپ بیتی کو لفظوں کی مالا پہنانے میں کسی قدر مجھے آسانی ہو۔ آپ پر کیا بیتی آپ برائے کرم مجھے لفظ بہ لفظ سنائیں؟" میں نے اس سے کہا کیونکہ مجھے اس سے گفت وشنید کے لئے بہت کم وقت ملا تھا اور میں چاہتا تھا کہ فضول باتوں کے بجائے وہ اصل پوائنٹ پر آئے قیاس کی خمدار پگڈنڈیوں پر چلنے کی بجائے میں چاہتا تھا ایک ہی بار میں وہ مجھے ساری کہانی سناڈالے۔

میری بات سن کر اس نے پھر جو کہانی سنانی شروع کی تو ہر بات میں تجسس کی آمیزش شامل تھی۔ کچھ ایسے حقائق سے اس نے پردہ اٹھایا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حقیقت میں اس سائنسی دور کے اندر، ان باتوں سے کوئی لینا دینا ہے یا یہ بلاوجہ ایک من گھڑت کہانی سنائے جارہا ہے مگر پوسٹ مارٹم رپورٹ میری آنکھوں کے سامنے سے گزری تھی جس کے مطابق اس کی بیوی کا انسانی دانتوں کے ذریعے شہ رگ کاٹ کر خون چوسا گیا تھا اور پھر اس کے جسم کے مختلف حصوں سے کسی تیز دھار خنجر کی مدد سے گوشت بھی اتارا گیا تھا۔ کہانی سنتے سنتے میرے رگ وپے میں خوف سرایت کرچکا تھا اور میں بڑی مشکل سے اپنے آفس تک پہنچا۔

☆......☆......☆

میں اس وقت آفس میں بیٹھا ایک کمرشل پلان تیار کررہا تھا، جب آفس بوائے نے آکر مطلع کیا کہ جیلر صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں انگشت بدنداں رہ گیا کہ جیلر صاحب کیوں آگئے......؟ پھر ذہن میں سوال اجاگر ہوا کہ ہوسکتا ہے کوئی نقشہ تیار کروانے آئے ہوں کیونکہ میں نے عرصہ سات سال سے شہر کے وسط میں اپنا آفس بنایا ہوا تھا اور اللہ کی مدد سے میرا کام دن بدن ترقی کی منازل طے کرتا جارہا تھا۔

اس کام کی بدولت اللہ نے مجھے بہت عزت وشہرت عطا کی تھی۔

میں نے آفس بوائے سے کہا "انہیں اندر ہی بھیج دو اور ان کے لئے جلدی سے کولڈ ڈرنک لے نا۔" میری بات سن کر وہ دبے قدموں پلٹا اور میں چیئر کی پشت سے ٹیک لگائے جیلر صاحب کا ویٹ کرنے لگا چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم تن وتوش والے جیلر صاحب نظر آئے۔ انہوں نے بڑی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں، جنہیں انہوں نے تاؤ دے کر اور تیل لگا کر چمکایا ہوا تھا۔ ان کی شخصیت بڑی رعب دار تھی۔

میں اٹھا اور مودبانہ لہجے میں ان سے مصافحہ کیا۔ مصافحہ کرنے کے بعد وہ میری ٹیبل کے سامنے رکھی چیئر پر براجمان ہوگئے۔ میں نے لیپ ٹاپ اسٹینڈ بائی کرکے ایک سائیڈ پر کیا اور ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"جی جیلر صاحب! فرمایئے کیسے آنا ہوا......؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"جبرال صاحب! ہمیں خبر ملی ہے کہ آپ ایک اچھے آرکیٹیکٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے ادیب بھی ہیں اور ادب سے آپ کا بہت گہرا لنک ہے......" انہوں نے ڈائریکٹ ہی پوائنٹ پر آتے ہوئے کہا۔ "پچھلے دنوں بھی آپ کی ایک روداد شائع ہوئی تھی جسے پڑھ کر آپ کی محنت اور شوق داد دینے کے قابل ہے۔"

"یہ آپ جیسے دوست احباب کی نوازشیں ہیں کہ میں ادب کی دنیا سے وابستہ ہوں اور میں خود کو سمندر کے قطرے کے مانند نہیں گردانتا کیونکہ آج کل ایسے ایسے کہنہ مشق رائٹر حضرات ہیں جو اپنی قلم کا ایسا جادو چلاتے ہیں کہ لوگ دنگ رہ جائیں یوں لگتا ہے جیسے ایک ایک لفظ جو کہ ان کی اسٹوری میں شامل ہوتا ہے اپنی ذات پر بیت رہا ہو اور کہانی پڑھنے کے بعد بھی کافی عرصہ تک یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کہانی کا تعلق

بھی ہماری ذات سے ہی وابستہ ہے۔" میں پیپر ویٹ ٹیبل پہ آہستہ آہستہ گھماتے ہوئے کہا۔

"آپ کی بات بھی ٹھیک ہے کہ پاکستان میں ادب کا بہت نام ہے اس کی شاید یہ وجہ ہے کہ اردو ہماری مادری زبان ہے اور لوگوں نے اردو لغت پر اس قدر عبور حاصل کرلیا ہے کہ پاکستان تو در کنار دنیا بھر میں اردو کا اپنا ایک نام ہے......" جیلر صاحب بولے۔ ان کا لہجہ خاصا جوشیلا تھا، شاید اردو کے وہ بھی گرویدہ تھے۔

قبل اس کے کہ ہم میں سے کوئی دوبارہ بولتا آفس بوائے کولڈ ڈرنک کے ساتھ حاضر ہوا۔ کولڈ ڈرنک جیلر صاحب کے سامنے رکھ کروہ بے قدموں واپس مڑ گیا۔ اے سی کی ٹھنڈک نے جیلر صاحب کی پیشانی پر نمودار پسینے کے قطروں کو خشک کر دیا تھا۔ انہوں نے کولڈ ڈرنک اٹھائی اور ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"جبرال صاحب! مسئلہ کچھ اس طرح کا ہے کہ جیل میں کل ایک ملزم آیا ہے جسے پھانسی کا حکم سنا دیا گیا ہے۔" اتنی بات کر کے انہوں نے دوبارہ کولڈ ڈرنک کا ایک گھونٹ بھرا۔ اور میں ورطۂ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے دوبارہ اپنی بات ،اسٹارٹ کی۔

"اس نے عدالت میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ مرنے سے پہلے وہ اپنی آپ بیتی دنیا والوں تک پہنچانا چاہتا ہے اس لئے میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ تشریف لے چلیں اور اپنے قیمتی وقت میں سے تھوڑا سا وقت دے کر اس کی آپ بیتی سن کر اسے شائع کروائیں تاکہ اس کے بعد ہم اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیں۔"

جیلر صاحب کی پیشانی پر غم و غصے کی واضح سلوٹیں دکھائیں دیں شاید انہوں نے میری کیفیت کو بھانپ لیا تھا اسی لئے میرے من میں مچلتے سوال کا جواب بھی خود دے دیا۔

"اس ظالم نے اپنی ہی بیوی کا خون کر دیا اور صرف خون ہی نہیں کیا بلکہ اس درندے نے اس کے جسم سے گوشت نوچ نوچ کر کھا گیا اور پھر خود ہی اپنے آپ کو پولیس کی حراست میں دے دیا۔"

اب کی بار جیلر صاحب کی بات نے تو میرے حواس باختہ کر کے رکھ دیئے تھے اندرون خانہ ایسی بھی کیا ناچاقیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ اس شخص نے اتنا بھیانک قدم اٹھایا تھا۔ جیلر صاحب کی بات نے میرے ہاتھوں کے طوطا اڑا کے رکھ دیئے تھے۔

"مگر اس ظالم نے ایسی انسانیت سے گری ہوئی اور گھٹیا حرکت کیوں کی......؟" میں نے جیلر صاحب سے پوچھا جو اتنی دیر میں کولڈ ڈرنک ختم کر چکے تھے۔

"بڑی عجیب کہانی ہے جبرال صاحب اس کی ،آپ تھوڑی زحمت گوارا کریں اور میرے ساتھ تشریف لے چلیں۔ پرسوں اسے پھانسی ہو جائے گی اور آج ہی اس کی کہانی کو آپ نے نوٹ کرنا ہے۔ صرف آج اور کل کا دن ہے مگر جو بھی ہے آپ نے آج ہی کرنا ہے کیونکہ کچھ ضروری کارروائیاں ہوتی ہیں اور پھر شاید کل وقت نہ مل سکے اس لئے آپ میرے ساتھ ہی تشریف لے چلیں۔" جیلر صاحب کی بات سن کر میں نے لیپ ٹاپ کو پاورڈ آف کیا۔ آفس بوائے کو ساری بات سمجھانے کے بعد کہ "جو بھی آئے اسے بیٹھا لینا، میں تھوڑی دیر میں آرہا ہوں۔"

میں جیلر صاحب کے ساتھ چل دیا۔ میں نے دفتر سے صرف ایک نوٹ بک اور ایک پنسل لی۔ جلدی میں موبائل بھی آفس میں رہ گیا مگر اس کی کوئی ٹینشن نہ تھی کیونکہ آفس بوائے آفس میں ہی تھا۔

آفس بوائے میرے ہی محلے کا لڑکا تھا۔ اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد وہ فری تھا اس لئے میں نے اسے پاس رکھ لیا تھا۔ وہ بہت ذہین اور قابل تھا اور سب سے بڑی بات ایماندار اور شریف انتہا کا تھا۔ جس کی وجہ سے میں نے اسے ٹرینڈ کرنا شروع کر دیا تھا۔

خیر میں جیلر صاحب کے ساتھ چل پڑا۔ جیلر صاحب نے مجھے اپنے آفس میں بیٹھایا تھوڑی دیر میں ہتھکڑی لگے ایک پچیس تیس برس کا نوجوان اندر داخل ہوا۔ جس کے نین نقش اس کی خوبصورتی میں اضافہ کررہے تھے۔ پتلی مگر تلوار کی سی ناک، شہد رنگ آنکھیں جن میں مستقبل کے کیسے کیسے سپنے قید تھے۔ سفید دودھیا رنگ جیسے چودھویں کے چاند کو میرے روبرو پیش کردیا گیا ہو، کلین شیو، رف کٹنگ اور پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ نوجوان جس کی آنکھیں اس کی بے گناہی کا ماتم کررہی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سارا الزام اس پر تھوپنے کی سعی کی جارہی ہو، اس کو زبردستی پھنسایا جارہا ہو یا اسے یہ سب کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔

اسے میرے سامنے والی چیئر پر بیٹھا دیا گیا، پولیس والے اسے بیٹھا کے چلے گئے اور پھر جیلر صاحب بھی راؤنڈ پر چلے گئے، اب ہم دونوں کے پاس تھوڑا وقت تھا جب تک جیلر صاحب تشریف نہیں لاتے تب تک اس نے حقیقت سے مجھے آشنا کرنا تھا ان کی موجودگی میں تو شاید وہ جھجک کے مارے کچھ حقائق چھپا جائے اسی طرح کہانی مختلف پگڈنڈیوں پر چلنا شروع کردیتی ہے اور بہت ساری ایسی باتیں جن میں نصیحت کے پہلو شامل ہوتے ہیں کہانی کا حصہ بننے سے رہ جاتے ہیں اور یوں ساری کہانی کا کچومر بن جاتا ہے۔

''آپ کا نام کیا ہے......؟'' میں نے پہلا سوال داغا۔ اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، شاید اسے سوئے ہوئے کو اٹھا کر لائے تھے کیونکہ نیند کی غنودگی اس پر حاوی تھی اور وہ بار بار جمائیاں لے رہا تھا، میں حیران و ششدر تھا کہ دو دن بعد اسے پھندے پہ لٹکا دیا جائے گا اور یہ ہے کہ مزے سے اپنی نیندیں پوری کررہا تھا، دو دن بعد اس نے ویسے ہی ابدی نیند سو جانا ہے۔ سزائے موت کے مجرم کی تو نیندیں حرام ہوجایا کرتی ہیں اور اس کے کانوں پر جیسے جوں تک نہیں رینگی۔

''ظہیر ملک......'' اس نے مختصر جواب دینے پر ہی اکتفا کیا۔ اس کا نام سن کر میں چونک سا گیا، دوسرے ہی پل ایک خیال بجلی کی سی سرعت سے میرے دماغ میں کوندا۔

''شہریار ملک سے کوئی تمہارا واسطہ تعلق......؟'' میرے اس سوال پر وہ دم بخود سا رہ گیا۔ تھوک نگلتے ہوئے اس نے ایک سرسری سی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

''بہت قریبی......'' اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ اس کے چہرے سے یاس و پریشانی کے آثار دکھائی دینے لگ گئے تھے۔

''مطلب......؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''والد صاحب ہیں وہ میرے......'' وہ دھیرے سے بولا۔ تو میں حیرت کا مجسمہ بن کر رہ گیا۔ شہریار ملک جس کی شہرت کا ملک بھر میں ڈنکا بجتا ہے اس کا بیٹا پھانسی کے پھندے پر پہنچ چکا ہے اور اس نے کوئی ایکشن تک نہیں لیا۔ کیا یہ ممکن ہے......کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ باپ نے اسے خبردار نہ کیا ہو؟ یا پھر......

''شہریار ملک آپ کے والد ہیں اور پھر بھی موت آپ کے سر پر منڈلا رہی ہے، کیا انہیں اس بات کی خبر نہیں ہے۔ شہریار ملک جسے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے اور جو اس ملک کی ایک مایہ ناز شخصیت شمار کیے جاتے ہیں اور ان کے بیٹے پر ماہی بے آب کی سی کیفیت طاری ہے اور وہ اس بات سے بے خبر ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے......؟'' میرے سوال پر وہ زیر لب مسکرایا اس کی مسکراہٹ میں طنز اور بے چارگی کی آمیزش شامل تھی۔

''انہی کی بدولت تو مجھے پھانسی کی سزا کا حکم ہوا ہے......'' اس کی بات پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ''ویسے بھی مجھے زندگی سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ میری زندگی تو بانہیں پھیلائے، مجھے اپنی طرف بلا رہی ہے، موت کے بڑھتے قدموں کی چاپ مجھے اپنے بہت قریب سے سنائی دے رہی ہے اور میں تو بے تابی سے اس وقت کا ویٹ کررہا ہوں جب میں اپنی پیاری بیوی

کو بانہوں میں بھروں گا۔“

اس کی باتیں سن کر مجھ پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ شہریار ملک ایک معزز شخصیت، پس پردہ ان کا روپ اتنا بھیانک ہوسکتا ہے۔ آئی کانٹ بلیوایٹ..... مگر اس بات پر یقین کرنا بھی میری مجبوری تھی کیونکہ ان کا لخت جگر میرے سامنے بیٹھا تھا اور حقائق کی کتاب کے صفحات الٹ پلٹ کررہا تھا اور ہر صفحے پر الگ ہی داستان رقم تھی۔

”میں سمجھا نہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو پھانسی پر لٹکوائے گا.....“؟ میں نے دماغ میں ابھرتے سوال کو لفظوں کی مالا پہنائی۔

”میں بھی آپ کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ایک باپ کبھی بھی اپنی اولاد کو پھانسی پر لٹکوانے کا سوچ بھی نہیں سکتا مگر یہ بات تو ایک باپ اور بیٹے سے منسوب ہے.....“ اس کے لہجے میں نفرت کی تاثری شامل تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ زہر میں گوندھا ہوا تھا۔ ”جس شخص نے کبھی اپنی اولاد کو اولاد کا رتبہ دینے کی زحمت ہی گوارا نہ کی ہو اسے بیٹے کی کیا پہچان ہوگی.....؟ دنیا کے سامنے جو اس کا روپ ہے حقیقت اس سے بہت مختلف ہے، حقیقت میں وہ ایک مفاد پرست اور روپے پیسے کو ہی اپنا سب کچھ ماننے والا انسان ہے۔ اسے اولاد کی نہیں روپے پیسے کی ضرورت ہے اور روپے پیسے کی خاطر وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لیے تلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کا اکلوتا بیٹا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے اور بس ایک دو دن میں اس جنگ میں جیت موت کی ہوگی۔ مگر اس کے کانوں میں جوں تک نہیں رینگی اس کو اتنا تک احساس نہیں ہوا کہ میں آخری پل بیٹے سے دو پیار کی باتیں ہی کرآؤں، آپ کس رشتے کی بات کررہے ہیں۔ یہاں خون سفید پڑ گئے ہیں۔ رشتوں کی کشش پیسے نے ختم کردی ہے۔ کسی نے غلط نہیں کہا ”زر، زن اور زمین“ کے پیچھے بھاگنے والا انسان دنیا کا انتہائی لالچی سفاک اور کٹھور دل انسان ہوتا ہے۔ جس کا احساس اسے اس دن ہوتا ہے جب وہ مکمل طور پر تہی دامن ہوجاتا ہے اور اس وقت سوائے پچھتاوے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

”چلیں چھوڑیں ظہیر صاحب! اندرون خانہ مجھے جانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، میں تو بس آپ کی خواہش کے مطابق یہاں بلوایا گیا ہوں، وقت کی کمی کے باعث اگر آپ شروع سے آخر تک کہانی میرے گوش گزار کریں تو آپ کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوجائے گا اور جو ٹائم ہمیں دیا گیا ہے اس کے اندر آپ آسانی سے مکمل آپ بیتی بھی سناسکیں گے کیونکہ جیلر صاحب اسی وجہ سے راؤنڈ کا بہانہ کرکے چلے گئے ہیں۔“ میں نے اسے اصل ٹاپک کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر اس نے ایک گہری مگر دکھ سے لبریز سانس خارج کی۔ ہتھکڑی میں جکڑی مٹھیاں زور سے بھینچیں اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندلیں اور پھر وہ بولتا گیا اور ایک کہانی جنم لیتی گئی۔ دکھ و کرب اور احساس محرومی کے جذبات سے لبریز کہانی۔

☆......☆......☆

ایف ایس سی کرنے کے بعد مجھے میڈیکل میں باآسانی ایڈمشن مل گیا کیونکہ میں نے بہت ہی اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کلیئر کی تھی۔ ضلع بھر میں میری پہلی پوزیشن آئی تھی میں خوشی سے باغ باغ تھا۔ گولڈ میڈل سے مجھے نوازا گیا تھا اور کالج کی طرف سے اعزازیہ پروگرام میں ایک سند بھی ملی۔ میں یہ دیکھ کر خون کے آنسو رو دیا کہ تمام اسٹوڈنٹ کے عزیز واقارب میں سے کوئی نہ کوئی اس تقریب میں شامل ہوا تھا۔ ایک میں ہی تھا جو تن تنہا تھا۔ میری والدین نے اتنی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی کہ تقریب میں شرکت ہی کرلیتے، چلو والد صاحب کی تو مجبوری سہی کہ وہ کام میں اس قدر مصروف ہوتے ہیں کہ انہیں سر کھجانے کا وقت بھی نہیں ہوتا مگر امی تو گھر میں فری ہوتی ہیں گھر میں ان گنت ملازم تھے گھر کا سارا کام وہ کرتے تھے مگر امی نے

بھی اتنا نہ سوچا کہ اس خوشی کے موقع پر آ ئیں شاید انہیں میری خوشیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

میں اسٹیج کے دائیں طرف کھڑا مایوسی سے کبھی گولڈ میڈل کو جو پنڈولم کی مانند میرے گلے میں لٹکایا گیا تھا اسے دیکھتا اور کبھی ہاتھ میں پکڑی اس سند کو جو کالج کی طرف سے مجھے دی گئی تھی۔ گھر سے باہر کی دنیا میں مجھے کتنوں کا پیار حاصل تھا مگر گھر کی چاردیواری میں کوئی مجھ سے رتی برابر بھی پیار نہ کرتا تھا۔ امی کبھی کسی فنکشن میں جا رہی ہیں...... کبھی شاپنگ کرنے...... ابو صبح کے نکلے نجانے رات کے کس پہر واپس آتے تھے میرے لئے تو دونوں کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ ایک گھر کی چاردیواری میں رہتے ہوئے بھی ہم ایک دوسرے کے لئے انجان تھے۔ امی اگر گھر پر ہوتیں تو ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے براجمان...... اگر کبھی میں ان سے کسی ٹاپک پر گفت وشنید کی سعی کرتا تو بجائے میری کسی بات کا جواب دینے کے الٹا مجھ پر چڑھائی کر دیتیں۔

''یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ چلو اپنے کمرے میں جا کر تیاری کرو، جانتے نہیں کتنا ٹف سبجیکٹ ہے تمہارا اور تمہاری پڑھائی پر ہم کس طرح پانی کی طرح پیسہ بہا رہے ہیں تمہیں احساس نہیں ہے، چلو یہاں ٹائم ویسٹ کرنے کے بجائے اپنے کمرے میں جاؤ اور اپنا ہوم ورک کمپلیٹ کرو......'' میں چاروناچار وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آجاتا اور دیر تک اوندھے منہ لیٹے تکیہ میں منہ چھپائے اپنی قسمت پر اشک ریزی کرتا رہتا۔ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود مجھے والدین کا پیار میسر نہیں تھا اور ہر بار کی طرح گھر کی پرانی ملازمہ زرینہ آ کر مجھے دلاسہ دیتی کہ ''رونے دھونے سے کوئی فائدہ نہیں...... اگر میرے والدین میرے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں تو وہ صرف میری بھلائی کے لئے کرتے ہیں تاکہ میں آوارہ گرد نہ بن جاؤں بلکہ ان کا رعب و دبدبہ ہر وقت مجھ پر طاری رہے اور میں مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنی پڑھائی پر دھیان دوں۔''

گھر میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں تھا۔ ساری بجھ بوجھ رکھتا تھا۔ یہ صرف دلاسے تھے۔ اپنوں کی بے مروتی اور نظر انداز کئے جانے پر، میرا دل کرچیاں کرچیاں ہو جاتا اور ایک ملازمہ جو مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھی آ کر مجھے دلاسہ دیتی، کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں ان پتھر کے بتوں کی بجائے موم کی بنی اس صنف نازک کا بیٹا ہوں جو مجھے دلاسے دیتی ہے...... میرے دکھ میں برابر کی شریک ہوتی ہے...... میرے دکھ کو اپنا دکھ گردانتی ہے...... میں لیٹ آؤں تو مجھ سے پوچھ کچھ کرتی ہے...... میرے جوتی کپڑے کا خیال، میرے کھانے پینے کا خیال رکھتی ہے...... اسے مجھ سے کیا غرض ہے۔ اس کے علاوہ گھر میں اور بھی ملازم ہیں جو میرے اپنوں کی طرح بے مروت جن کے چہروں پر سدا بارہ بجے رہتے ہیں مگر ان سب میں ایک یہ عورت تھی جس کے چہرے پر پیار اور محبت دکھائی دیتا تھا۔ وہ مجھ سے ہنسی مذاق کرتی رہتی تھی میرا دل بہلائے رکھتی تھی مگر میں اب اس چاردیواری سے یکسر تنگ آ چکا تھا۔ اب مزید یہاں رہنا میرے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہاں رہتے رہتے میں جلد ہی پاگل ہو جاتا یا ان کے ایسے رویوں کو دیکھ کر کسی کا سر پھوڑ دیتا۔

موسم برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ رویہ...... رویوں کی سرد مہری، لہجوں کی تپش روح جھلسا دیتی ہے اور لہجوں کی ٹھنڈک...... انسان اکڑ جاتا ہے برف میں کسی لاش کی مانند۔

مجھے تو اب انسانوں سے وابستہ تمام بھونڈے رشتوں سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ انسان کو انسان کے درمیان ہونا چاہئے۔ گفتگو باہم ملاقات ہنسی رونا لفظوں کی گہرائیاں، انسان کی دوستی آنسوؤں کو بہنے کا راستہ دیتا ہے۔ اور پھر پونچھنے کے لئے ہاتھ بڑھاتی ہے۔

یہاں اس چاردیواری میں ہر شخص اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے اپنے راگ میں مست تھا۔ میری خوشیوں سے کسی کو کیا لینا دینا۔

''کن سوچوں میں غرق ہو ظہیر.....'' اچانک ایک مترنم سی آواز نے میری قوت سماعت پر دستک دی اور میں خیالوں کی دنیا سے واپس پلٹا۔

''آں ہاں کک..... کچھ نہیں.....'' میں نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ مگر میری آنکھوں کے دیدوں سے جھانکتے آنسو اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوسکے۔

''پریشان کیوں ہوتے ہو، میں ہوں نا، تمہارے ساتھ۔'' اس کی اس بات پہ میرا دل خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے بھی ایف ایس سی اچھے نمبروں سے کلیئر کی تھی۔ اس کا نام انذینہ تھا۔ اور اب وہ میتھ میں ماسٹر کی خواہش مند تھی۔ اس کے والدین اس کے ساتھ تھے۔ اس کے چہرے پر اس کے والدین کے چہروں پر خوشی عیاں تھی اس وقت مجھے اپنے والدین کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ اگر آج اس تقریب میں میرے پیرینٹس بھی شامل ہوتے تو مجھے کتنی خوشی ہوتی تھی۔

ہم دونوں چلتے ہوئے کینٹین میں جابیٹھے۔ تقریب کے اختتام پر تمام مہمانوں کے لئے دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس لئے انذینہ بے دھڑک میرے ساتھ چلی آئی تھی وگرنہ اس کے والدین اس بات کو بہت برا محسوس کرتے تھے۔ اس کا لڑکوں کے ساتھ باتیں کرنا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا مگر جہاں اکٹھے پڑھنا تھا، دن کے پانچ سات گھنٹے اکٹھے گزارنے تھے وہاں لڑکے لڑکیوں کو آپس میں بولنے پر کیسے کوئی پابندیاں عائد کرسکتا تھا۔ ہم ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے آرڈر انذینہ نے ہی دیا۔ برگر اور کولڈ ڈرنک کیونکہ اسے پتہ تھا کہ مجھے برگر بہت پسند تھا اور تقریباً ہم ڈیلی برگر کھاتے تھے۔

''دیکھو ظہیر حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے..... تمہیں پتہ ہے رسی جل کر راکھ بھی ہوجائے تو اس کے بل ختم نہیں ہوتے..... اسی طرح ان فرسودہ خیالات اور بھونڈی رسمی کو جو ہمارے سترہویں صدی کے والدین کے دل و دماغ میں ہیں ان کو ہم کسی طور سے ختم نہیں کرسکتے ناکہ حالات کے سامنے ہتھیار ڈال کر ہمہ تن گوش خود کو پریشان رکھ کر ایسے حالات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔'' انذینہ ہمیشہ مجھے ایسے ہی سمجھایا کرتی تھی جیسے کوئی دادی سمجھایا کرتی ہے۔ وہ بہت ذہین اور سوجھ بوجھ والی لڑکی تھی۔ حالات کا مقابلہ کرنے کی وہ عادی تھی۔ اس کے والدین بھی ایسے ہی تھے مگر اس نے ایسے دگرگوں حالات میں ہتھیار نہیں ڈالے تھے بلکہ ایسی حکمت عملی اپنائی تھی کہ آج وہی والدین اس کے گیت گاتے پھرتے تھے۔ وہ ایک لڑکی ہوکر مردوں جیسے دل گردے کی مالک تھی اور میں لڑکا ہوکر صنف نازک جیسے دل کا مالک اٹوائی کھٹوائی لیکر پڑ جانے والا۔

''نجانے کیوں انذینہ مجھے جب گھر سے محبت نہیں ملی تو دوسروں کی محبت بھی فالتو نظر آتی ہے۔'' مجھے ہر کسی کی محبت دکھلاوا لگنے لگ گئی ہے۔ ایک عجیب سی نفرت اور گھٹن ہوگئی ہے مجھے ان ناموں سے۔ میرے نزدیک محبت اور پیار چاہے جس صورت میں بھی ہو اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے بس سراب کا دوسرا نام محبت ہے چاہے وہ والدین اور اولاد کے بیچ ہو یا ایک عاشق اور معشوق کے بیچ میں.....'' میری بات سن کر اس کا چہرہ پژمردہ سا ہوگیا مگر نجانے کیوں مجھے کسی کے غم وخوشی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

ویٹر برگر اور کولڈ ڈرنک رکھ کے چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے صبر و تحمل کا درس دینے والی انذینہ اب خود نجانے کن خیالوں کی لپیٹ میں آچکی تھی۔ مگر درپردہ میں اس بات سے غافل تھا کہ میری چھوٹی سی بات نے اسے دلی طور پر کتنے بڑے صدمے سے دوچار کیا تھا۔

''ظہیر ملک ہر رشتہ دکھلائے اور مطلب پرستی میں گندھا ہوا نہیں ہوتا کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا حقیقت سے بہت تعلق ہوتا ہے۔ ایک گندی مچھلی پورے تالاب کو گندا کردیتی ہے۔ مگر اس ایک گندی مچھلی

کی وجہ سے پورے تالاب کی مچھلیوں کو گندہ کہنا دانائی نہیں بلکہ بے وقوفی کے زمرے میں پڑتا ہے۔'' وہ کولڈ ڈرنک کا گھونٹ بھر کر سرسری نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے بولی۔

میں اس وقت آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا تھا۔ میں اس کی باتوں کی گہرائی سے واقف نہ تھا۔ اس کے دلی جذبات سے واقف نہیں ہو رہا تھا کہ واقعتاً ہر رشتہ خود غرض اور مطلبی نہیں ہوتا کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں چاہ کر بھی ہم ان کو پہچان نہیں پاتے اور وہی رشتے ہوتے ہیں جو حقیقت میں ہمارے اپنے رشتے ہوتے ہیں جن کے دل میں ہماری محبت کے آلاؤ روشن ہوتے ہیں اور وہ ان آلاؤں کی تپش میں پل پل جھلتے رہتے ہیں۔ مگر اس کے پیچھے بھاگتے ہیں جس کے پیچھے بھاگنا سرابوں کے پیچھے بھاگنے کے مترادف ہوتا ہے حالانکہ ہم اسے قطعی طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں جو ہمارے پیچھے بھاگ رہا ہوتا ہے۔ جب ہم اس سے جس کے پیچھے ہم بھاگ رہے ہوتے ہیں ایک ایسا گھاؤ دکھاتے ہیں جس کے بھرنے کی کوئی امید ہی نہ ہو تو ہمیں وہ شخص نظر آتا ہے جو ہماری خاطر اپنے تن من دھن کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کرتا مگر تب تک وقت گزر چکا ہوتا ہے اور ہم ہر طرف سے مکمل طور پر تہی داماں ہو کے رہ جاتے ہیں اس وقت سوائے افسوس اور خود کو ملامت کرنے کے ہمارے پاس کچھ نہیں ہوتا۔''

''ظہیر سب کو ایک ہی ترازو میں تولنے کی بجائے حالات سے گٹھ جوڑ کرنا سیکھو۔ سہج سہج سوچ سمجھ کر عمل کرنا سیکھو۔'' اندیینہ کی آواز میں افسردگی اور مایوسی کے تاثر کو میں واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نے کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ غلط کہا ہے اور یہ مجھ پر عیاں ہو چکا تھا کہ اندیینہ دل ہی دل میں مجھ سے محبت کرنے لگی تھی اور میں اس کے جذبات کو پیہم ٹھیس پہنچائے جا رہا تھا۔

''میری زندگی کے ترازو میں سب ایک ہی پلڑے میں ہیں اندیینہ سوائے......'' میں نے اتنی بات کہہ کر چپ سادھ لی تو اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اس کے دل میں میرے لئے رتی برابر بھی محبت ہوئی تو وہ میرے اس ادھورے فقرے پر چونک کر لازماً میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھے گی اور وہی ہوا مطلب وہ واقعتاً مجھ سے محبت کرتی تھی۔

''سوائے......'' اس نے مجھے فقرہ کمپلیٹ کرنے کی طرف اشارہ دیا، ایک بے تابی اور بے چینی سی اس کی شہد رنگ خوب صورت آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔

''سوائے تمہارے......'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھنے لگی شاید اسے مجھ سے اس جواب کی توقع نہیں تھی کیونکہ آج تک میں نے اس سے کبھی اس لہجے میں بات تک نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی مجھ سے ایسی باتیں سننے کی متمنی تھی مگر میں ہی تھا جس کے سامنے بھینس کے آگے بین بجانے والی بات تھی، اور میں اسے نہ تین شمار کرتا تھا نہ تیرہ میں۔ مگر میں کبھی اس کے جذبات سے آگہی حاصل نہ کر سکا تھا حالانکہ ''بھلے گھوڑے کو ایک چابک کافی ہوتی ہے اور بھلے آدمی کو ایک بات'' مگر میں تو ''آنکھ کا اندھا، اور گانٹھ کا پورا'' بنا تھا۔ کبھی اس کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کی کوشش بھی میں نے تو نہ کی تھی کہ وہ پس پردہ مجھ سے کتنی محبت کرنے لگ گئی ہے۔

''کیا ہوا ایسے کیوں تکے جا رہی ہو۔ میں نے کوئی انہونی بات کہہ ڈالی ہے جو یوں آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھے جا رہی ہو؟''

میں نے اسے خیالات کی دنیا سے نکالا مگر وہ پھر بھی حیران وششدر تھی۔ گویا ہوئی۔

''میں ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوں کیونکہ یہی بات نجانے کب سے میں تمہارے لبوں سے سننے کی خواہش مند تھی۔ میں ہر وقت تم سے پیار بھری باتیں کرتی تا کہ تمہیں کسی طرح اپنی محبت سے آگاہ کر سکوں

مگر تم گانٹھ کے پورے کچھ سمجھنے سے ہی قاصر تھے۔ عورت چاہے جتنی بھی مرد پر مرتی ہو ظہیر ملک! عورت کے اندر ایک انا کا ایسا مادہ ہے کہ وہ اس کی محبت میں جھلتی جھلتی جان دے دیتی ہے مگر لب پر اظہار نہیں کرتی بلکہ وہ مرد کی طرف سے اظہار کی خواہش مند ہوتی ہے اور یہ میری ہی نہیں روز اول سے ہر عورت کی دیرینہ خواہشوں میں سے ایک بری خواہش چلی آ رہی ہے کہ مرد خود اس سے اپنی محبت کا اظہار کرے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلائے۔'' اس نے تقریباً روہانسی آواز میں کہا۔

''ظہیر تمہیں نہیں پتہ! میں پس پردہ تم سے کتنی محبت کرتی رہی ہوں۔ تمہاری محبت کے بل بوتے پہ ہی میری سانسوں کی روانی ہے وگرنہ جتنے دکھ و کرب کی زندگی سے میرا پالا پڑا ہے کب کی لقمہ اجل بن چکی ہوتی۔ تمہیں پتہ ہے کہ مرد اور عورت کے حوصلوں میں زمین و آسمان کا تضاد ہوتا ہے۔ مرد کمزور بھی ہو تو عورت اس کے سامنے طاقت ور ہو کر بھی کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ عورت کے حوصلے بہت ناتواں ہوتے ہیں وہ جلد ہی حالات کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوتی ہے ہاں لیکن جب ایک سچا چاہنے والا اس کی زندگی میں آ جاتا ہے تو وہ مرد سے زیادہ طاقت اور حوصلہ مند ہو جاتی ہے۔ دنیا کی ہر وقت سے نبرد آزما ہونے کا اس میں حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے وہ حالات کے نشیب و فراز سے دست و گریباں ہونے کی طاقت رکھتی ہے۔ وقت کی اونچ نیچ کا سامنا کرنے کا اس میں حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے اور ایسی ہی عورتیں مردوں کی خاطر اپنا آپ داؤ پر لگا دیتی ہیں مگر اکثر مرد انہیں سر راہ چھوڑ جاتے ہیں۔'' نہ خدا ملا نہ وصال صنم'' کے مترادف پھر عورت کے لئے ہر راستہ معدوم پڑ جاتا ہے وہ نہ آگے کی رہتی ہے اور نہ پیچھے کی......'' انذینہ نے اپنے دل کا ابال نکالنا شروع کر دیا تھا۔ جو نجانے کب سے وہ دل کے پنہاں کونوں میں چھپائے ہوئے تھی۔

وہ جیسے جیسے بول رہی تھی مجھے ویسے ویسے نہ صرف اس کی محبت کا مکمل یقین ہوتا جا رہا تھا بلکہ میں نے اس کی باتوں سے یہ نتیجہ بھی اخذ کر لیا تھا کہ وہ باتوں باتوں میں مجھے یہ سمجھا رہی تھی کہ اگر اب میں نے اس کا ہاتھ تھام ہی لیا ہے تو سر راہ چھوڑ نہ دوں۔ مگر میں تو خود حالات کا مارا تھا بھلا زندگی میں زرینہ آنٹی کے بعد انذینہ تھی زرینہ آنٹی اور میرا رشتہ ماں بیٹے والا تھا جبکہ میرا اور انذینہ کا رشتہ بھی بہت مقدس رشتہ تھا، کانچ کے جیسا جس میں ہر قدم پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ اتنا نازک رشتہ جس کو نبھانے میں بے شک بہت دقتوں سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے مگر عورت وفادار اور قابل اعتماد ہو تو کوئی بھی رکاوٹ راستے کا کانٹا نہیں بن سکتی اور مجھے فخر تھا کہ مجھے انذینہ جیسی ایک وفادار لڑکی ملی تھی۔

یوں اس دن ہم نے اس نئے رشتہ کو جسے ''محبت'' کا نام دیا جاتا ہے اس کی بنیاد رکھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ ہماری محبت ایک تناور درخت کی طرح مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔

وقت گزرنے میں دیر ہی نہ لگی، میں نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد چائلڈ اسپیشلسٹ کرنے کا سوچا جبکہ انذینہ نے ایم ایس سی میتھ کرنے کے بعد تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا اور لیکچرار کی جاب جوائن کر لی۔ اس کے گھر والوں نے اس پر شادی کا دباؤ بڑھانا شروع کر دیا مگر وہ متواتر اگنور کرتی چلی آئی۔ ملن کی تمام تر دعاؤں کے ساتھ فراق کی گھڑیاں آ چکی تھیں اور مجھے اسپیشلسٹ کرنے کے لئے فارن کنٹری آنا پڑا۔ فون پر ہم دونوں کا رابطہ رہتا، میں ہر چھ ماہ بعد گھر آتا اور زیادہ تر وقت انذینہ کے ساتھ ہی بسر کرنے لگتا۔ میری اتنی ترقی کرنے کے باوجود میرے گھر والوں کی وہی پوزیشن تھی ہمیشہ کی طرح مگر اب مجھے بھی ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرا کوئی رشتہ تھا تو صرف انذینہ کے ساتھ جسے میں جلد ہی اپنی بیوی بنانے والا تھا۔

وقت پر لگا کے گزر گیا اور میں چائلڈ اسپیشلسٹ کر کے آ گیا۔ ہاؤس جاب میں نے فارن کنٹری میں کی تھی۔ یہاں آتے ساتھ ہی جاب

[illegible]
ہمیشہ کی طرح پھٹ پڑیں۔

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی اس لڑکی کا نام لب پر لانے کی، ہم نے تم پر آج تک اتنا پیسہ پانی کی طرح لگایا اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنی من مانیاں کرتے پھرو، تمہاری شادی کہاں کرنی ہے یہ تمہیں نہیں ہمیں فیصلہ کرنا ہے اور فی الوقت شادی وادی کے چکروں میں پڑنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اپنے کام پر توجہ دو......'' امی کی زہر آلود باتوں نے میرا سینہ چھلنی چھلنی کر کے رکھ دیا۔ ابو بھی بیٹھے نیوز پیپر پڑھ رہے تھے میری بات اور اوپر سے امی کی زہر آلود باتیں سن کر انہوں نے سونے پر سہاگے والا کام کیا۔

''میں نہ کہتا تھا کہ فارن کنٹری جا کے یہ لڑکا مغربی روایات میں ڈھل جائے گا اور اس نے تو ہمیں منہ تک نہیں لگانا اور وہی ہوا اپنے قدموں پر صحیح سے کھڑا ہو نہیں پایا اپنی من مانیاں کرنی شروع کر دیں تمہیں ہی پڑی تھی اس کی حمایت کی اسپیشلسٹ کرنے باہر جانا ہے اپنے ملک میں کیا اسے کہیں اسپیشلسٹ کرنے کے لئے جگہ درکار نہ تھی۔ ملک کے چپے چپے میں میرا نام گونجتا ہے اسے تو ہاتھوں پر اٹھایا جاتا مگر اب بھگتو، مغربی تہذیب وتمدن اور روایات کا نتیجہ جو اس عرصے میں تمہارے لخت جگر نے اپنا کر خود کو مغربی تہذیب وتمدن کے سانچے میں ڈھال کر آج پہلا ثبوت دے دیا ہے۔''

ابو کی بات سن کر میرا دل تو کیا کہ انہیں جواب دوں مگر وہ پہلے اتنی باتیں کر چکے تھے کہ میرا لقمہ دینا ان کی باتوں کو درست ثابت کرنے کے مترادف تھا۔

''اپنے اوپر سے اتار دو مغربی تعلیم وتربیت کا ہر لبادہ۔ ہم کل ہی تمہارے ماموں سے تمہارے لئے رشتے کی بات کر کے تمہاری شادی کر دیں گے۔ ایسی لڑکیوں سے شادی کا مائنڈ سے ہی نکال دو جو تم سے نہیں تمہارے مال ودولت سے محبت کرتی ہیں۔ اس لئے دوبارہ ہم تمہاری زبان پر کسی ایسی ویسی لڑکی کا نام نہ سنیں۔'' امی کی نفرت بھری بازگشت میری قوت سماعت

[illegible] اور اب کی بار میں بھی چپ نہ رہ سکا۔

''ماما پلیز! بس کیجیے، اندینہ ایسی ویسی لڑکی نہیں ہے اور نہ ہی اسے ہماری دولت سے کوئی غرض ولالچ ہے ان کے پاس بھی اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔'' میری بات پر ابو نے ایسی بات کہی کہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسی گھٹیا بات بھی اپنے منہ سے ادا کر سکتے تھے۔

''ایسی دو ٹکے کی لڑکیوں کے لئے اس گھر کی چاردیواری میں کوئی جگہ نہیں ہے اگر اتنا ہی محبت کا بھوت تم پر سوار ہے تو دفعہ ہو جاؤ یہاں سے اور کر لو اس سے شادی......'' ابو کے منہ سے اتنی گھٹیا بات سن کر میں سیخ پا ہو گیا۔

''کاش کہ آپ کے اور میرے درمیان، باپ بیٹے والا رشتہ نہ ہوتا تو وہ حال کرتا کہ روح تک کانپ اٹھتی......رہی بات اس کی تو وہ میری بیوی بن کے رہے گی چاہے دنیا کی کوئی طاقت میرے راستے میں آ جائے میں ہر طاقت کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوں...... ویسے بھی محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں کو، تقسیم معاشیر کا تجربہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے۔ یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ نہ دل طبقوں کی پرواہ کرتا ہے اور نہ کوئی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں۔ کبھی باری پلٹ جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ لے جاتا ہے۔''

میں شدید جذباتی بھونچال کی زد میں آ چکا تھا۔ مگر میرے دماغ کے تاریک گوشوں میں کبھی کبھی یہ خیال کلبلاتا تھا کہ میری زندگی کا دھاوا کسی ایسے رخ پر بہہ نکلے گا جہاں مجھے ایک اجنبی اور نئی زندگی کی نوید سنائی دیتی تھی اور اس زندگی کے لئے مجھے خود اس دھارے کے ساتھ بہنا تھا، آخر کب تک اس چاردیواری میں رہ کر میں کدورت اور احساس محرومی کی چھاؤں میں پلتا بڑھتا۔ محبت یقیناً بڑی حیران کن چیز ہے وہ یاقوت اور زمرد سے بھی زیادہ بیش قیمت ہے۔ یہ

کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو بازار میں لگی ہو اور اسے مال وزر کے عوض خریدا جاسکے۔

''تمہاری اتنی مجال کہ تم اس لہجے میں مجھ سے بات کرو......'' ابو غصے سے اپنی چیئر سے اٹھے، ان کی نیلی آنکھوں میں غصہ ایسا چمکتا تھا گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے تلاطم میں کہیں آفتاب شعلہ فگن ہے پھر اس پر بادل گھر آتے ہیں اور کس تار سے بجلیاں چمکتی ہیں پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں اور پھر سورج اپنا رخ تاباں بے نقاب کر دیتا ہے۔ جس شخص نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں، وہ حسن کی کیا قدر کر سکتا ہے۔ مگر آج مجھے ان کے غصے کی قطعاً کوئی پرواہ نہ تھی۔ انہوں نے اٹھتے ساتھ ہی مجھ پر ہاتھ اٹھایا مگر میں نے ان کا ہاتھ روکا اور زور سے جھٹک کر بولا۔

''میری نظروں سے اتنا بھی مت گریں کہ باپ اور بیٹے کے درمیان جو دیوار حائل ہے وہ بھی ختم ہو جائے۔''

''ابھی اور اسی وقت دفعان ہو جاؤ اس گھر سے......اس گھر کی چار دیواری کے مکینوں سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' میں آج ہی تمہیں اپنی تمام منقولہ غیر منقولہ جائیداد سے عاق کرتا ہوں اور دوبارہ بھول کر بھی اس گھر کی طرف قدم بڑھانے کی جسارت نہ کرنا۔ آج سے ہمارا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں، ہماری طرف سے بے شک بھاڑ میں جاؤ، ڈو یو انڈر اسٹینڈ۔'' ابو کی باتوں سے نفرت کا دہکتا لاوا پھوٹ رہا تھا۔

یہ دن میری زندگی میں آنا تھا چاہے اب آتا چاہے ٹھہر کے آتا۔ میں بھی آج ان کے سامنے بھیگی بلی بننے والا نہیں تھا بہت برداشت کر لیا تھا۔

''آپ کیا سمجھ رہے ہیں مجھے آپ کی دولت سے سروکار ہے......میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی دولت پر جس میں غریبوں کا خون پسینہ شامل ہو۔ لوگوں کے سامنے بڑے پارسا بنتے ہیں اگر ان لوگوں کو آپ کی حقیقت سے آگہی ہو جائے تو وہ پلک جھپکتے میں تکہ بوٹی ایک کر کے دکھ دیں۔'' میری بات سن کر ابو آگ بگولہ ہو گئے مگر نجانے کیا سوچ کے کوئی بات نہ کی بلکہ اندر ہی اندر غم و غصے کے کڑوے گھونٹ پی گئے۔

''اس گھر سے مجھے ملا ہی کیا ہے......پیسہ تو بازاری لوگوں کے پاس بھی بہت ہوتا ہے۔ مگر ہر انسان محبت کا متمنی ہوتا ہے۔ اس گھر کی چار دیواری سے مجھے کبھی محبت میسر نہیں آئی۔ (امی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جب بھی میں آپ کے پاس آیا کہ آپ کے پاس دو پل گزار لوں آپ سے کچھ باتیں کر لوں تو آپ نے ہمیشہ مجھے دھتکار کے اپنے پاس سے اٹھا دیا۔ (ابو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور آپ کس رشتے کی بات کرتے ہیں، آپ کا تو چہرہ دیکھنے کو میری آنکھیں ترس جایا کرتی تھیں اور کبھی کبھار چودھویں کے چاند کے جیسے کوئی جھلک دکھائی بھی دیتی تو یوں لگتا جیسے میں آپ کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ آپ دونوں نے سدا مجھے نظر انداز کیا آپ کیا سمجھتے ہیں مجھے آپ کے پیسے سے غرض تھی......واہ......قربان جاؤں آپ کی سوچ پر......پیسے سے پیار سدا آپ دونوں کو رہا، اسی پیسے کی خاطر ہی تو آپ لوگوں نے مجھے ہمیشہ نظر انداز کیے رکھا کیونکہ ہر وقت آپ پر پیسے کی دھن سوار ہوتی تھی اور ہمہ تن گوش پیسے کے پیچھے بھاگتے رہے کیا دیا مجھے اس گھر میں رہ کر آپ لوگوں نے ان بیس پچیس سالوں میں...... پہلے کی بات اور تھی مسٹر شہر یار ملک اب کی اور ہے اس وقت میں نوبلوغت میں تھا مگر اب کئی اسٹیپ آگے آ گیا ہوں جب سے حقیقت کی دنیا میں، جہاں سے سوچ و بچار کا ہر راستہ شروع ہوتا ہے میں نے قدم رکھا سوائے مایوسیوں، تنہائیوں اور پریشانیوں کے کیا ملا ہے مجھے آپ لوگوں سے......'' قبل اس کے کہ میں بات مکمل کرتا ایک مشفقانہ آواز میری قوت سماعت سے ٹکرائی۔

''ظہیر! یہ تمہارے امی ابو ہیں ایسے بات نہیں کرتے چلو سوری کرو شاباش......'' مجھے اپنے کندھوں پر اس مشفق عورت کے ہاتھوں کا احساس ہوا تو میں نے

ہاتھ اوپر کر کے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سامنے کھڑا کیا۔
"کیا لگتی تھی یہ عورت میری......؟" میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر کے دونوں کو مخاطب کر کے کہا۔ امی ابو محو حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔
"اگر اس گھر کے در و دیوار میں مجھے کوئی محبت ملی تو اس عورت سے، میں ماں کے پیار کا طلب گار تھا تو اس نے مجھے ماں کا پیار دیا۔ باپ کی شفقت کا متمنی تھا تو اس نے باپ کا سا پیار دیا۔ جبکہ میرے حقیقی رشتے جن سے میرا حقیقت میں کوئی تعلق تھا انہوں نے کبھی یہ زحمت ہی گوارہ نہ کی کہ ہمارا کوئی بیٹا ہے ہماری کوئی اولاد ہے۔ ہمیں اسے بھی کچھ ٹائم دینا چاہئے یا نہیں۔"
میں زرینہ آنٹی کے گلے لگ کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ تو آنٹی نے مجھے آج پھر دلاسہ دیا۔ میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آیا کچھ ضروری سامان اکٹھا کیا اور کمرے سے باہر نکلا اس وقت زرینہ آنٹی امی ابو سے گفت و شنید کر رہی تھیں۔ مجھے حقیقت میں اس روپ میں دیکھ کے سب کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی مگر پھر بھی انا پرست میرے ماں باپ نے مجھے روکنے کی زحمت گوارہ نہ کی۔ زرینہ آنٹی نے مجھے روکنا چاہا مگر میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔
"آپ نے مجھے سدا ماں باپ کا مشترکہ پیار دیا آپ کا یہ احسان کبھی نہ بھلا پاؤں گا، اب یہ آپ کا مجھ پر آخری احسان ہوگا کہ مجھے چپ چاپ ان پتھر دل لوگوں سے دور جانے دیں اگر پھر بھی آپ نے ضد کی تو آپ مجھے ہمیشہ کے لئے کھو دیں گی۔" میری بات سن کر ان کے منہ سے دبی دبی چیخ نکلی مگر انہوں نے لبوں کو بھینچ لیا اس وقت ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی یہ تو وہی جانتی تھیں یا خالق کائنات۔ میری بات کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اشتعال کی چڑھتی آندھی اچانک تھم چکی تھی۔ مجھے کسی نے روکنے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔
میں چپ چاپ گھر سے باہر آ گیا، اتفاق سے اسی وقت روڈ سے گزرتی ایک ٹیکسی مل گئی۔ میں اس میں بیٹھ کے سیدھا اپنے آفس پہنچا۔ مجھے بیگ کے ساتھ دیکھ کر اسپتال کا مالک جو خود میڈیکل اسپیشلسٹ تھا، عجلت سے میرے پاس آیا۔ یہ ایک پرائیویٹ اسپتال تھا جہاں میں جاب کر رہا تھا اور ان لوگوں نے مجھے ہاتھ کا آبلہ بنا کر رکھا ہوا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ پورے شہر میں چائلڈ اسپیشلسٹ صرف میں ہی تھا اور مجھے یہاں سے چھوڑنے پر کہیں اور اس سے بہتر جاب مل سکتی تھی۔
"کیا بات ہے ظہیر بیٹا! تمہارا چہرہ کیوں اترا اترا سا ہے اور کیا تم کہیں جا رہے ہو......؟" انہوں نے سوال کیا۔
"میں کہیں جا نہیں رہا بلکہ اب کہیں نہ جانے کے لئے پکا پکا یہاں آ گیا ہوں۔" میری بات سن کر وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوئے۔
"پکا پکا مطلب......؟" وہ انگشت بدنداں ہو کر سوالیہ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔
"مطلب......؟" میں نے غصے سے پیچ و تاب کھا کر کہا۔ "اگر آپ لوگوں کے پاس میرے رہنے کے لئے جگہ نہیں ہے تو میں باہر ہاسٹل رکھ لیتا ہوں۔"
"نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں اس اسپتال کو اپنا ہی سمجھو۔ مجھے تو خوشی ہے اگر تم چوبیس گھنٹے یہاں رہو گے۔ اندھے کو اور کیا چاہے دو آنکھیں؟ اگر ہمیں چوبیس گھنٹے کے لے ایک ڈاکٹر مستقل ملتا ہے تو بھلا ہمارے لئے اور خوشی کی بات اس سے بڑھ کیا ہو سکتی ہے۔" ہاسپٹل کے مالک ڈاکٹر عفقان حیدر نے چہک کر جواب دیا۔ خوشی ان کے لب و لہجے سے عیاں تھی۔
اندینہ سے فون پر میں نے بات کی اور اسے تمام بات کہہ سنائی جسے سن کے وہ مضطرب ہو گئی۔ مگر میں نے اسے بتایا کہ حالات اتنے ابھی ناسازگار نہیں ہوئے کہ پریشانی کو سر پر سوار کر لیا جائے۔
"ظہیر ملک! تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں، میں ہوں ناں تمہارے ساتھ......" ہمیشہ کی طرح اس نے اپنا پرانا جملہ دہرایا اور آج میں اس جملے کی ضرورت بھی ختم کر دینا چاہتا تھا۔
"تم ٹینشن نہ لو میں ٹھیک ہوں۔ آج دوپہر میں

تم کیا کر رہی ہو......؟" میں نے سوال داغا۔

"فی الوقت تو ایسی کوئی مصروفیات نہیں سوائے اسکول کلاس اٹینڈ کرنے کے......" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "کیوں خیریت تو ہے ناں؟"

"ہاں خیریت ہی ہے تم ہاف ٹائم میں چھٹی کرنا، میں تمہیں لینے آؤں گا، آج ہم دونوں مل کے دوپہر کا کھانا کھائیں گے۔" میں نے اسے دعوت دیتے ہوئے کہا مگر شاید وہ بھی میری بات کچھ کچھ سمجھ چکی تھی۔

"پھر بھی بتاؤ تو......؟" اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ پریشانی اس کے لب و لہجے میں عیاں تھی۔

"میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا......" میں نے غصے سے مگر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے یہ کب کہا۔ ٹھیک ہے میں آجاؤں گی تم ٹائم پر پہنچ جانا......" اس نے پریشان کن لہجے میں کہا، مجھے اس کے لب و لہجے میں یاس و پریشانی کے آثار نمایاں محسوس ہو رہے تھے۔

"اوکے......" میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

☆......☆......☆

میرے علاوہ اس ہاسپٹل میں تین اور ڈاکٹر تھے۔ ایک ڈاکٹر علقان حیدر، دوسرا ڈاکٹر ارحم رسول (اسکن اسپیشلسٹ) اور تیسرا ڈاکٹر فہمون ضیاء (ہارٹ اسپیشلسٹ) ڈاکٹر فہمون ضیاء کم گو انسان تھا۔ وہ اپنے مطلب سے مطلب رکھتا تھا مگر اپنے کام کا بہت ماہر تھا۔ بنا دیکھے مریض کی کنڈیشن بتا دیتا تھا۔ پچھلے دنوں کی بات تھی جب ڈاکٹر حیدر صاحب کا ایک عزیز ان سے ملنے آیا جو شکل و صورت سے بہت ہٹا کٹا انسان تھا۔ اسے دیکھتے ہی ڈاکٹر فہمون نے مجھ سے کہا۔ "اس شخص کو ہارٹ پرابلم ہے اور یہ چند دن کا مہمان ہے۔" میں نے اس وقت تو ان کی بات سنی ان سنی کر دی، مگر ٹھیک چوتھے روز ڈاکٹر حیدر نے بتایا کہ ان کے اس عزیز کی بوجہ ہارٹ پرابلم ڈیتھ ہو گئی، میں نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈاکٹر ضیاء پر ڈالی جو شاید میری کیفیت کو بھانپ گئے تھے ان کے لبوں پر ایک ایسی فاتحانہ مسکراہٹ تھی جیسے کوئی میدان مار لینے کے بعد مسکراتا ہے اس دن میں اس شخص کے ایکسپیرئینس کا قائل ہو گیا حالانکہ میں خود اتنی کم عمری میں ڈاکٹری فیلڈ میں انٹر ہو گیا تھا۔

آہستہ آہستہ ڈاکٹر ضیاء سے میری علیک سلیک بنتی چلی گئی اور ہم دونوں میں بہت دوستی بن گئی۔ ڈاکٹر ضیاء کا بیک گراؤنڈ کیا تھا کوئی نہ جانتا تھا۔ ویسے بھی ڈاکٹر حیدر کو آموں سے غرض تھی گٹھلیوں سے ان کا کیا لینا، وہ کیسا تھا؟ اس کا بیک گراؤنڈ کیسا تھا؟ انہوں نے اس طرف توجہ نہ دی تھی اور نہ کبھی انہوں نے اس ٹاپک پر بات کرنا مناسب جانی۔

ڈاکٹر ضیاء نے ہاسپٹل کے ساتھ ہی اپنا کوارٹر لے رکھا تھا حالانکہ ڈاکٹر حیدر نے بہت کہا تھا کہ آپ ہاسپٹل کے اسٹاف رومز میں سے جو اچھا لگے وہ روم رکھ لیں مگر انہوں نے معذرت کر لی اور کہا کہ بعد از ڈیوٹی بھی جس وقت انہیں اس کی ضرورت محسوس ہو بلا جھجک بلا لیں۔ چاروناچار ڈاکٹر حیدر کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ڈاکٹر ضیاء پر کبھی کبھی مجھے بڑی حیرت ہوتی وہ جب کبھی بے موسمی چیزیں لے کر آ جاتے، ایک دوبار میں ان کے ساتھ اس کے کوارٹر میں گیا تو یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ ان کے فریج میں جتنے بھی فروٹ اور سبزیاں پڑی تھیں وہ سب بے موسمی تھی میرے پوچھنے پر وہ زیر لب مسکرائے اور بولے۔

"کن فضول چکروں میں پڑ گئے ہیں آپ؟ آپ بیٹھیں جناب یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں بے موسمی چیزیں بازار میں بھی تو مل جاتی ہیں۔"

ایک دفعہ رات کو انہوں نے مجھے مدعو کیا کہ آج رات کا کھانا میں ان کے ساتھ کھاؤں چنانچہ میں نے ان کی دعوت کو قبول کیا اور مقررہ وقت پر ان کے پاس پہنچ گیا انہوں نے بہت اچھا انتظام کر رکھا تھا مگر کھانے کے اندر ایک چیز نے مجھے انگشت بدنداں کر کے رکھ

دیا۔ ایک تو انہوں نے جو گوشت بھون کر میرے سامنے رکھا وہ اتنا لذیذ تھا کہ شاذ و نادر میں ایک کلو اکیلا ہی کھا گیا تھا۔

پھر انہوں نے ایک مشروب پلایا جسے پی کر میں مدہوش سا ہو گیا، پہلے پہل تو مجھے اس کا ذائقہ بڑا عجیب سا لگا مگر پھر آہستہ آہستہ میں پی گیا۔ اب میں اس پر کوئی اعتراض کر کے اپنے میزبان کو تو ناراض کر نہیں سکتا تھا کہ یہ کیسا مشروب مجھے پینے کے لئے دیا ہے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا مشروب جس کے اندر ایک حد تک میٹھا ڈالا گیا تھا۔ بے شک اس مشروب کا ذائقہ بہت لذیذ تھا مگر اس میں سے عجیب سی بساند آ رہی تھی مگر میں نے بھی سانس روک کے چار و نا چار حلق سے نیچے انڈیل دیا۔

پھر تو کچھ عجیب ہی کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی ، جب تک میں وہ گوشت اور مشروب نہ پیتا، نہ میری بھوک مٹتی اور نہ پیاس ختم ہوتا۔ چاہے میں جو کچھ بھی کھا پی لیتا۔ لہٰذا میں کچھ زیادہ ہی ڈاکٹر ضیاء کے قریب ہونے لگ گیا، شاید وہ بھی میری کیفیت سے آشنا ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے مجھے ایک دن اپنے آفس میں بلایا۔ میں حیران ہوا کہ یہ اچانک ڈاکٹر ضیاء کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا۔ میں اس وقت فارغ تھا اس لئے اٹھ کے ان کے آفس میں گیا۔ ہر ڈاکٹر کے لئے ایک ایک کمرہ مختص تھا۔ میں پہنچا تو وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے مجھے دیکھ کر انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا ،ان کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ چھائی ہوئی تھی۔

''آیئے ڈاکٹر صاحب! آپ کو تھوڑی زحمت دی......'' انہوں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں آپ حکم کیجیے،، بندہ ناچیز کو یاد کیا......؟'' میں نے ان کی ٹیبل کے سامنے رکھی چیئر پر براجمان ہو کے کہا۔ اس وقت ان کے دائیں ہاتھ میں پیپر ویٹ تھا جسے وہ پیہم ٹیبل پر ایک مدار کی صورت میں گھمائے جا رہے تھے ان کی آنکھوں میں مجھے ایک عجب چمک دکھائی دی۔ ان کے لبوں پر مسلسل ایک زہریلی مسکراہٹ نے قبضہ جما رکھا تھا۔

ان کی چیئر کی بیک سائیڈ پہ لگی کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے تھے جن سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مسلسل اندر آ رہے تھے۔ موسم آج بہت خوشگوار تھا۔ بادل پیہم سورج سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے کبھی کبھی سورج بادل کے کسی آوارہ ٹکڑے کی اوٹ سے جلوہ گر ہوتا مگر جلد ہی کوئی نہ کوئی بادل کا پھرتیلا ٹکڑا اسے اپنی اوٹ میں کر لیتی اور یوں اس کی کرنیں زمین پر پہنچنے سے قبل ہی دم توڑ جاتیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے شاید کمرے کا اے سی آف کیا ہوا تھا اور قدرتی ہوا سے دل و دماغ کو راحت بخش رہے تھے۔

''میں نے آپ کو اس لئے زحمت دی کہ کل میں ایک ہفتے کی چھٹی پر گھر جا رہا ہوں، میری خواہش تھی کہ میں آپ کو بھی ساتھ لے چلوں، ویسے بھی ڈاکٹر حیدر صاحب سے بھی میں نے بات کر لی ہے انہوں نے کہا ہے کہ مجھے کوئی اعتراض نہیں اگر ظہیر ملک جانا چاہیں تو بخوشی جائیں، ویسے بھی آپ لگاتار کافی دنوں سے اسی چار دیواری کے اندر قید ہو کے رہ گئے ہیں، کچھ سیر و تفریح کا موقع بھی ہاتھ آ جائے گا اور کچھ دن آپ کو ریسٹ بھی میسر آئے گی......'' ڈاکٹر ضیا کی بات سن کر جہاں میں خوشی سے باغ باغ ہو گیا تھا وہیں پریشانی کی سلوٹیں بھی میری پیشانی پر نمودار ہو گئی تھیں کیونکہ اندیشہ اس بات کی قطعاً مجھے اجازت نہ دیتی مگر اس کے لئے مجھے پہلے اس سے بات کرنا لازمی امر تھا۔

''مجھے آپ تھوڑا ٹائم دیں تا کہ میں اپنی ہونے والی زوجہ سے بات کر لوں کیونکہ وہ شاید مجھے اجازت نہ دے مگر میں کوشش کروں گا کہ اجازت لے لوں......'' میں نے جواب دیا تو میری بات سن کر وہ کھلکھلا کر ہنسے۔

''ابھی شادی نہیں ہوئی اور بھیگی بلی والا حال ہے ڈاکٹر صاحب! اور شادی ہو گئی تو سونے پر سہاگہ ہو جائے گا......'' ان کی بات میں طنز و مزاح کی آمیزش شامل تھی مگر میں نے ان کی بات کا برا منانے کی بجائے زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔

"کبھی کبھی بھیگی بلی بننے میں غنیمت ہوتی ہے

آج میں جس اسٹیج پر ہوں یہ سب اسی کی مرہون منت ہوں کیونکہ دگرگوں حالات نے مجھے دہانے پر لاکھڑا کیا تھا وہاں چاروں طرف مجھے موت کے بڑھتے قدموں کی چاپیں تھیں یوں سمجھ لیجئے حالات نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑ کر رکھ دی تھی اپنوں کی بے رخی نے دل کرچیاں کرچیاں کر کے رکھ دیں مگر عین اس وقت جب میں زندگی سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا اس واحد ہستی نے مجھے سہارہ دیا اور اب میں اپنی ہر اونچ نیچ میں اسے شامل کرتا ہوں۔ اس لئے میں بہتر یہی سمجھوں گا کہ ایک بار اس سے مشورہ کرلوں۔" میری بات سن کر انہوں نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

"ٹھیک ہے جی کرلو مشورہ اچھی بات ہے شریک حیات سے مشورہ کرنا چاہئے مگر پلیز! شام تک کنفرم کر کے بتا دینا کیونکہ میں شاید صبح ہی نکلوں......" وہ بولے۔ اتنی دیر میں ان کا اسسٹنٹ دو چائے کے کپ اٹھائے آن وارد ہوا۔ شاید میرے آنے سے قبل انہوں نے اپنے اسسٹنٹ کو چائے کا کہہ دیا تھا۔

چائے پیتے ہوئے کچھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں مگر اس تمام عرصہ میں میں نے ایک بات نوٹ کی وہ یہ کہ ڈاکٹر ضیاء آنکھیں نہیں جھپکتے تھے اور یہ بات میں نے پہلی بار محسوس کی تھی۔ حالانکہ ان کے ساتھ میرا کافی ٹائم گزرتا تھا مگر یہ بات میں نے آج پہلی بار نوٹ کی تھی۔ میں نے اپنے وہم کو یقین کا لبادہ پہنانے کے لئے کافی دیر غور کیا تو واقعی وہ آنکھیں نہیں جھپک رہے تھے اور میں اس دوران سینکڑوں بار آنکھیں جھپک چکا تھا۔ میرا شک یقین میں بدل چکا تھا مگر مجھ میں اتنی جسارت نہ پیدا ہو سکی کہ میں اپنی دل کی بات کو منہ تک لا سکوں، دوسری بات جو میں نے نوٹ کی ان کی آنکھوں میں چمک بہت تھی۔ ایک چبھتی ہوئی چمک جسے آنکھ بھر کے دیکھنا بہت مشکل تھا۔ میرے دل میں عجیب وغریب خیالات نے ڈیرے ڈالنے شروع کر دیئے مگر میں نے ان پر کوئی بات ظاہر کئے بنا چائے کا کپ خالی کیا اور اپنے آفس میں آ گیا۔

کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے میں سوچوں کے بھنور میں بری طرح سے پھنس گیا کہ ڈاکٹر ضیا کیسے عجیب وغریب انسان ہیں؟ ان کے گھر جاؤ تو بے موسمی چیزوں کی بہتات نظر آتی ہے جیسے ان کے لئے اسپیشل یہ چیزیں بھیجی جاتی ہوں اور آج یہ نیا انکشاف کہ وہ آنکھیں کیوں نہیں جھپکتے۔

مجھے بچپن کی ایک کہانی یاد آ گئی جو ایک ناگن پر لکھی گئی تھی اور اسے اس وقت بہت پسند کیا گیا تھا، اس میں، میں نے پڑھا تھا۔ "کہ سانپ آنکھیں نہیں جھپکتے۔"

میرے دل میں ایک خیال بجلی کی سی سرعت سے کوندا کہ کہیں ڈاکٹر ضیاء درپردہ سانپ تو نہیں جو سو سال بعد انسانی روپ اپنا کر ہمارے ساتھ رہ رہے ہیں مگر دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے اس خیال پر خود ہی ہنسی آ گئی کہ ایک سانپ اور وہ بھی انسانوں کے بیچ، ہاؤ اِٹس پوسیبل، سانپ اور انسان کی دشمنی تو روز اول سے چلی آ رہی ہے اور اگر یہ سانپ ہوتا تو کب کا ہم سب کو نگل چکا ہوتا۔

☆......☆......☆

"ظہیر! تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو......؟" میری بات سن کر انذینہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کے بولی۔

"میرے خیال میں، میں نے اردو کے علاوہ کسی اور زبان کا سہارا نہیں لیا بلکہ عام فہم زبان میں تم سے دو ٹوک بات کی ہے اور میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا......" میں نے ناک سیکڑتے ہوئے بھنوئیں اچکا کر کہا۔

"ظہیر! یہاں بات اردو کی نہیں بلکہ عزت بے عزتی کی ہے۔ کیا عزت رہ جائے گی ہماری معاشرے میں؟ اور ہمارے پیرینٹس کا تو طعنے دے دے کر لوگ جینا اجیرن کر دیں گے اور ویسے بھی تم ایک مرد ہو اور میں عورت۔ مرد کا کچھ نہیں جاتا اور عورت معاشرے میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی......" وہ ہنوز میرے

چہرے پر حیرت سے نگاہیں جمائے بولی۔

''کن پیرنٹس کی بات کر رہی ہو جو ہیں تلوؤں کی خاک کے برابر نہیں گردانتے..... اور معاشرہ...... ہوں...... کس معاشرے کی بات کر رہی ہو......؟ یہ معاشرہ جینے کسے دیتا ہے اگر کوئی خوش ہے تو اس سے اس کی خوشیاں چھین لیتا ہے یہ معاشرہ اور اگر کوئی افسردہ ہے تو بجائے اس کی دل جوئی کے اس کی اتنی دل آزاری کی جاتی ہے کہ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کے یا تو جان دے دیتا ہے یا خود مکمل معاشرے کے سپرد کر دیتا ہے کہ اب معاشرہ جیسے چاہے اسے کٹھ پتلی غلام کی مانند اس کے جذبات واحساسات کی دھجیاں اڑائے...... کیا تم اس معاشرے کی بات کر رہی ہو جس میں ایک شخص کو اپنوں کے بیچ رہتے ہوئے ہمیشہ اپنے غیروں کے روپ میں دکھائی دیئے۔ اپنے ہوں (ناگواری سے) جو نام کے اپنے تھے حقیقت میں غیروں سے کہیں گئے گزرے ان سے تو غیر بہتر چلو دل جوئی تو کر ہی دیتے تھے۔'' اس کی بات سن کر میں طیش میں آ گیا۔

''میں اتنی جلدی کوئی جواب نہیں دے سکتی ظہیر......'' اس نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہنیاں میبل پر جماتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ میں تمہیں کیا جواب دوں میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔''

قبل اس کے کہ ہم دونوں میں سے کوئی بولتا ویٹر کھانا لے کر آ گیا اور ایک ترتیب سے اس نے دونوں کے سامنے کھانا سجا دیا۔ گرم گرم کھانے کے دونوں کی بھوک کو ہوا دی مگر اندینہ کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ کسی چیز کو ہاتھ لگائے اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ زور زور سے بلک بلک کے روئے آج پہلی بار اسے اپنی بے چارگی پہ رونا آ رہا تھا۔ کتنی مشکل سے اس نے حالات کو کنٹرول کیا تھا۔ کتنی مشکل سے اس نے اپنے گھر کی بکھری خوشیوں کو مالا میں پروئے موتیوں کی مانند اکٹھا کر کے ایک مالا کا روپ دیا تھا۔ اس کے ماں باپ جنہیں وہ پہلے دن سے لڑتا دیکھتی چلی آ رہی تھی کتنی مشکل سے اس نے ان دونوں کے بیچ اتفاق واتحاد کی ہوا پیدا کی تھی اور اب جب گھر میں اتنی خوشیاں مجتمع ہو گئی تھی تو وہ ایک پل میں ان خوشیوں کو ریزہ ریزہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اب حالات بہت سنگین ہو چکے تھے ایک طرف محبت تھی تو دوسری والدین......

سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا بس وہ میرا دل رکھنے کے لئے کھا رہی تھی، وگرنہ لقمے تھے کہ حلق سے نیچے اترنے کا نام تک نہ لے رہے تھے۔

''میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں......'' میں نے لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا تو اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا مگر منہ سے کوئی لفظ ادا نہ کیا۔ ''میں کچھ دن کے لئے ڈاکٹر ضیاء کے ساتھ ان کے ہاں جا رہا ہوں، انہوں نے بہت ضد کی ہے اس لئے میں نے سوچا کہ تمہیں بتا دوں تاکہ تم بعد میں یہ نہ کہو کہ مجھے بتانا تک گوارہ نہیں کیا مگر تم ٹینشن نہ لینا میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے جنہیں میں نے بڑی قریب سے دیکھ لیا تھا اور باوجود کوشش کے وہ مجھ سے ان آنسوؤں کو چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

''کیا بات ہے تم رو کیوں رہی ہو......؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر احساس ہو گیا کہ وہ کس لئے رو رہی ہے۔ ''اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہیں مجبور کر رہا ہوں تو ڈونٹ وری اندینہ! تمہاری اپنی لائف ہے اور تمہاری لائف پر تمہیں مکمل اختیار حاصل ہے کہ تم اسے کیسے گزارو۔ تمہیں اپنے حال میں مست اور مجھے اپنی کھال میں مست رہنے کا حق حاصل ہے ہم کسی سے اس کے اختیارات کو نہیں چھین سکتے، وہ محبت ہی کیا جس میں اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر دوسرے کے جذبات اور احساسات اور دوسرے کے ارمانوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔''

''ظہیر ایسی بات نہیں ہے بلکہ! میری خوشی تو پہلے دن سے تمہاری خوشی سے منسوب رہی ہے مگر......

مگر اب میں حالات کے اس دہانے پر کھڑی ہوں جہاں میری سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں...... کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ اب میں کروں تو کیا کروں...... میں اتنی مجبور اور بے بس ہو چکی ہوں کہ میرا دل کر رہا ہے کہ زور زور سے چیخوں چلاؤں دیواروں سے ٹکریں ماروں اپنی اس بے بسی پر...... میرا دل پھٹا جا رہا ہے ظہیر......! نہ میں تمہیں چھوڑ سکتی ہوں اور نہ اپنے پیرینٹس کو...... مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اب کروں تو کیا کروں......؟'' اندینہ کی آواز رندھائی ہوئی تھی اور بڑی مشکل سے وہ اپنی اس کیفیت پر قابو پائے تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دل پر گرتے آنسوؤں کو میرے سامنے بہا کر خود کو بے مول نہیں کرنا چاہتی تھی مگر ضبط کے تمام پیمانے لبریز ہو چکے تھے اور قبل اس کے کہ وہ کسی لمحہ دھاڑیں مار مار کر رو دیتی بہتری اسی میں تھی کہ وہ فی الوقت یہاں سے اٹھ جاتی اسے فی الوقت تنہائی کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی بے بسی پر خوب جی بھر کے اشک ریزی کرنا چاہتی تھی۔

''ظہیر ناراض نہ ہونا! مجھے آج ایک دوست کے ہاں جانا تھا، پہلے ہی بہت لیٹ ہو گئی ہوں اس لئے فی الوقت ہمیں جانا چاہئے اور تم مجھے گھر پہنچا دو پلیز۔''

میں نے اس کی بات کو اس کی آنکھوں کے آئینے میں دیکھ لیا تھا۔ مجھے محسوس ہو چکا تھا کہ وہ فی الحال بہت تذبذب اور اضطرابیت کا شکار ہے اور اسے تنہائی کی ضرورت ہے اور میں بھی اسے زیادہ ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا۔ اتنی دیر میں وہ ہوٹل سے باہر نکل کر گاڑی میں جا بیٹھی۔

بل ادا کرنے کے بعد میں نے اسے گھر سے تھوڑے فاصلے پر ڈراپ کیا۔ ہوٹل سے یہاں آنے تک ہم دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی حالانکہ جاتے وقت ہم دونوں ایک دوسرے سے خوب چہک چہک کر باتیں کر رہے تھے۔ تمام راستے میں اس کی نگاہیں باہر ہی لگی رہیں۔ حقیقت میں وہ اشک بہا رہی تھی اور یہ سمجھ رہی تھی کہ میں اس کے گرتے ان آنسوؤں کو نہیں دیکھ رہا مگر مجھے سب معلوم تھا لیکن چاہ کر بھی میں اسے کوئی دلاسہ نہ دے پا رہا تھا۔ ایک دو بار تو ہلکی سی سسکی کی آواز اس کے منہ سے نکلی مگر وہ جلد ہی ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا گئی۔ اس کے ضبط کے تمام بند ٹوٹ چکے تھے اور چاہ کر بھی وہ گرتے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکی تھی۔ گاڑی سے اترتے وقت اس نے میری طرف دیکھنا تک گوارہ نہ کیا تھا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف چلی حتیٰ کہ گھر سے تھوڑے قدم دور اس نے تقریباً دوڑ کر گھر کی دہلیز کراس کیا۔

مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔

مجھے آناً فاناً اندینہ سے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔ پہلے مجھے اس سے اس کے خیالات جان لینا چاہئے تھے یہ بھی کنفرم تھا کہ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھی مگر اس کے گھر والوں نے اس کا رشتہ کسی صورت بھی مجھے نہیں دینا تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مجھے رشتہ دینے کا مطلب شہریار ملک سے دشمنی مول لینا تھی اور وہ ایسی حماقت نہیں کرنا چاہتے تھے حالانکہ میں نے اور اندینہ نے کئی بار انہیں سمجھایا بھی تھا مگر انہوں نے تو مجھے گھر آنے سے بھی منع کر دیا اور اندینہ کو مجھ سے ملنے پر پابندی عائد کر دی کیونکہ میرے والد نے اندینہ کے باپ کو کال کر کے خود کہا تھا کہ اپنی بیٹی پر کنٹرول کر لو اس کی وجہ سے اندرون خانہ ہمارے حالات بہت ناساز گار ہو چکے ہیں ہمارا بیٹا اس کی وجہ سے گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اس لئے فوراً سے پیشتر اپنی بیٹی کی شادی کر دو گرنہ کل کو یہ نہ کہنا کہ شہریار ملک تم نے زیادتی کی ہے انہیں تو اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے اور انہوں نے اندینہ کا رشتہ اس کے پھوپھی زاد سے طے کر دیا تھا اور یہ ساری بات نہ صرف اندینہ کو پتہ تھی بلکہ اس نے مجھے بھی بتائی تھی۔

☆......☆......☆

وہ گھر پہنچی تو خوش قسمتی سے اس کے والدین میں سے گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ملازمہ سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ آج اس کی عدم موجودگی میں اس کے سسرال والے آئے تھے جنہیں ایک ماہ کی ڈیٹ دی گئی تھی اور آج اس کے والدین اس کی شادی کے لئے کچھ شاپنگ کرنے

بازار گئے تھے۔ وہ چپ چاپ اپنے روم میں آ گئی۔ دروازہ اندر سے بند کر کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی سر کو گھٹنوں میں دبا کر وہ کافی دیر تک روتی رہی۔ آخر جب اس کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو وہ اٹھی اور آئینے کے سامنے جا کے کھڑی ہو گئی۔

''ماں باپ جتنے بھی ناراض ہوں بندہ انہیں راضی کر سکتا ہے اس دنیا میں کون سا کام مشکل ہے اندیشہ......'' یہ آواز اس کے ضمیر کی تھی جس نے اس کے دماغ کے تاریک گوشوں میں امید کی ایک کرن ابھری جس نے اس کے تاریک دماغ کو منور کر کے رکھ دیا۔ اسے پتہ تھا کہ اس کے والدین اس کا رشتہ کبھی بھی ظہیر ملک کو نہیں دیں گے اور یک بار وہ اپنی ماں سے اس ٹاپک پہ بات کر کے اچھی طرح جھاڑ بھی حاصل کر چکی تھی اس کی ماں نے اس کے باپ کو ساری بات بتائی جس پر اس کا باپ بھی آگ بگولہ ہو گیا تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے والدین اسے بعد میں معاف کر دیں گے۔ وہ اپنے پیرینٹس کی اکلوتی اور لاڈلی تھی اور جب سے گھریلو حالات کچھ بہتر ہوئے تھے ان کی محبت اور دل میں چھپی چاہتیں بھی ابھر کر سامنے آ گئی تھیں۔ وہ اسے ہاتھ کے آبلے کی طرح رکھتے تھے۔ اس کی ہر جائز ناجائز کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔

☆......☆......☆

ڈاکٹر ضیاء نے مجھے بتایا کہ ہمیں رات کو سفر پر نکلنا ہے، میں بڑا حیران و ششدر ہوا لیکن اس حیرانگی کو ان پر ظاہر نہ کیا۔ شاید وہ رات کے سفر کا عادی تھا۔ پرسکون سفر نہ ٹریفک کا رش نہ کوئی ٹینشن پرسکون اور آرام دہ سفر نہ کوئی روک ٹوک نہ کچھ۔ ٹریفک پولیس کی یہاں کوئی دن دیہاڑے نہیں سنتا تھا تو رات کو سننا تو در کنار......

ہم تقریباً دس بجے ان کے کوارٹر سے کھانا وغیرہ کھا کر نکلے۔ پورا دن اندیشہ نے مجھ سے رابطہ کرنے کی سعی نہیں کی تھی اور نہ مجھ میں اتنی ہمت پیدا ہو رہی تھی کہ اس سے رابطہ کر سکتا تبھی اچانک میرے موبائل کی ٹون نے مجھے چونکا دیا اور میں نے جیب سے موبائل نکالا۔ اس وقت ہم دونوں تھری پیس میں ملبوس تھے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا مجھے شوق نہیں بقول ڈاکٹر ضیاء کے میں بہت جچ رہا تھا مگر درحقیقت ڈاکٹر ضیاء آج بہت چاک و چوبند لگ رہے تھے۔

موبائل پر آنے والی کال اندیشہ کی تھی دل مضطرب کو مٹھی میں بھینچ کر میں نے کال ریسیو کی۔

''ہیلو......'' مجھ سے اس سے زیادہ کچھ نہ بولا گیا حالانکہ اس سے قبل جب بھی اس کی کال آتی، میں پیار سے ہزاروں نام پہلے لیتا اور پھر جا کے اسے بولنے کا موقع دیتا تھا۔

''کیا ہیلو...... یہ ہیلو ویلو کیا ہوتا ہے......؟'' اس کے شوخیانہ لہجے نے مجھے ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا۔ ''کہاں ہو؟''

''تمہیں بتایا تو تھا کہ ڈاکٹر ضیاء کے ساتھ ان کے ہاں چند دن قیام کے لئے جا رہا تھا بہت ضد کر رہے تھے......'' میری بات سن کر ڈاکٹر ضیاء نے زیر لب مسکرا کر میری طرف دیکھا اور میں ان کی مسکراہٹ کی اوٹ میں چھپے طنز کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا۔

''ایسی بھی کیا آفت برپا ہو گئی تھی کیا دن نکلنے کا انتظار بھی نہیں ہو پایا تم لوگوں سے......'' اس نے لہجے میں غصے اور پریشانی کے تاثرات کو یکجا کر کے کہا۔

''ایکچوئلی ڈاکٹر صاحب کو رات کا سفر کرنے کا بڑا چاؤ ہے اس لئے اب میں کیا کہتا......'' میں نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو دانتوں میں ماچس کی تیلی دبائے اسے جنبش دیتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔

''واپسی کب تک ہے......؟'' اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''جب تم کہو......؟'' میں نے پیار کا پہلا تیر چھوڑا

''ابھی آ جاؤ......'' اس کے لہجے میں شوخی

در آئی تھی۔

''آ جاؤں گا میری جان اتنی بھی جلدی کیا ہے ......''میں نے سیٹ کی پشت سے سر لگا کر کہا۔

''پھر بھی کتنے دن تک آؤ گے......؟''اس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

''بس چار پانچ دن میں...... ہو سکتا ہے اس سے بھی پہلے......''میں نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے جب بھی آؤ ایک کام تو کرتے آنا......؟''اس نے اچانک سیریس ہوتے ہوئے کہا۔

''میری جان حکم کرو کچھ چاہئے......؟ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔میری آنکھوں میں نیند کا خمار سر اٹھانے لگا تھا اور آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔

''ایک سرخ جوڑا اور ایک سونے کی انگوٹھی......''

اس نے جواب دیا اس کی بات سن کر میری نیند ایسے رفو چکر ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ میں ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو کر رہ گیا مجھے اپنی قوت سماعت پر شک سا ہونے لگا۔

''کیا کہا ایک بار پھر پلیز کہنا......''میں نے خوشی سے باغ باغ ہوتے ہوئے کہا۔

''زیادہ ڈرامے نہ کرو جو کہا ہے تمہیں سمجھ آ گئی اگر نہیں آئی تو جاؤ بھاڑ میں......''اس نے لہجے میں تھوڑی کڑواہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''نہ صرف میری جان سمجھ آ گئی بلکہ یوں سمجھو میں ایک دو دن میں ہی آیا۔''میں نے عجلت سے کہا تو اسی لمحے ڈاکٹر ضیا نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر میری طرف دیکھا۔وہ مجھے یوں آنکھیں پھاڑ کے دیکھ رہے تھے جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ میں نے ہاتھ سے اپنی اسٹیرنگ کی طرف اشارہ کیا اور وہ سمجھ گئے اور اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کی۔

تھوڑی دیر ادھر ادھر کی گفت و شنید کے بعد انذیبہ نے کہا کہ مجھے نیند آ رہی ہے صبح بات ہو گی چنانچہ رابطہ منقطع ہو گیا قبل اس کے کہ ڈاکٹر ضیاء دریا کو کوزے میں بند کرتے اور سوال پہ سوال دہراتے میں نے اپنی تمام بات بتائی جسے سن کر وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔

''تم جانتے ہو ظہیر کہ تم کیا قدم اٹھانے والے ہو ایک ایسا قدم جس میں نہ صرف بدنامی ہے خطرات ہمہ وقت سر پر منڈلاتے رہتے ہیں۔''وہ میری بات سن کر حواس باختہ ہو گئے تھے۔

''پیار کیا تو ڈرنا کیا۔''(میں نے زیر لب مسکرا کر کہا)''اگر انسان ڈرنا شروع کر دے تو پیار کیسے کر پائے گا پیار کے لئے جگرا چاہئے اور ڈر کس بات کا میرے گھر والے مجھے کچھ کہنے سے رہے انذیبہ کے گھر والے اسے......''میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ظہیر جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔سہج پکے سو میٹھا۔گرم ہمیشہ منہ جلاتی ہے ٹھنڈی کر کے کھاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔''ڈاکٹر نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا مگر میری کانوں پر تو جوں تک رینگنے والی نہ تھی مجھے ڈر خوف کسی طوفان کا نہ تھا نہ موسم کی کسی خوف ناک انگڑائی کا نہ حالات کی کسی جاں لیوا کروٹ کا۔

میں کوئی دنیا میں پہلا انسان نہیں جو یہ قدم اٹھانے والا ہے اس دنیا میں آئے روز ہزاروں ایسے لوگ منظر عام پر آتے ہیں اور میں کسی کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔''ویسے بھی تم رنگ میں بھنگ نہ ڈالو، یہ نہ ہو میرے حوصلے پست ہو جائیں۔''ان کی بات سن کر میری پیشانی پر سلوٹیں سر اٹھانے لگ گئی تھیں۔میری بات سن کر ڈاکٹر ضیاء نے ایک قہقہہ خارج کیا۔

''بھلے گھوڑے کو ایک چابک کافی ہوتی ہے میری جان اور بھلے آدمی کو ایک بات......''ان کی بات سن کر میں مسکرایا۔

اچھا اچھا کوئی پیارا سا گانا لگائیں......''میں نے ان سے کہا اور وہ صرف مسکرا دیئے اور پھر فضا میں نصرت فتح علی خان کی پرسوز آواز گونجی۔

''تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی
محبت کی راہوں میں آ کر تو دیکھو''

اچانک میں چونک سا گیا جب ڈاکٹر ضیا نے گاڑی کا رخ شہر سے باہر اس ویرانے کی طرف موڑا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں آسیب کا قبضہ ہے یہ ایک صحرائی علاقہ تھا اور شہر سے باہر نکل کے ایک راستہ اس طرف آتا تھا۔ مین روڈ سے چھ سات کلو میٹر کے فاصلے پر آگے سارا علاقہ آسیبی تھا۔ یہاں پہلے زمانے میں لوگ بسا کرتے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہاں آسیب نے قبضہ کیا اور لوگوں نے اس جگہ کو خیر آباد کہہ دیا تب سے یہ وسیع وعریض علاقہ خالی سنسان پڑا تھا اور یہاں آسیب نے ڈیرے جمار کھے تھے۔ میں نے مارے حیرت کے انہیں دیکھا جو دنیا ومافیا سے بے خبر گانے کی دن میں مست گاڑی ڈرائیو کر رہے تھے۔

''یہ کیا کر رہے ہیں؟'' میں نے آخری اپنی حیرت کو لفظوں کی مالا پہنائی۔

''اپنے گھر......'' انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر یہ علاقہ تو آسیب زدہ ہے اور یہاں تو آسیب کا قبضہ ہے۔ کیا آپ یہاں رہتے ہیں......؟'' میں نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوتے ہوئے کہا۔

''ایک ایجوکیٹڈ انسان ہوتے ہوئے کیسی جاہلانہ باتیں کر رہے ہو ڈاکٹر ظہیر......'' انہوں نے اچانک گاڑی روک کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' کیا تم مان سکتے ہو کہ اس سائنسی دور میں ایسی بے ہودہ اور لغو باتوں کو کوئی اہمیت حاصل ہے۔''

''مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی سنتا چلا آرہا ہوں کہ یہاں آسیبوں کا قبضہ اور یہ انسانوں کو مار ڈالتے ہیں۔'' میری بات سن کر وہ زیر لب مسکرائے۔

''میری جان ایسی بے ہودہ باتوں کو ذہن سے نکال دو اس علاقے کو آباد ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے اور وہ دیکھو انہوں نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ، میں نے اس طرف دیکھا تو روشنیاں دکھائی دیں اور میں انگشت بدنداں رہ گیا۔'' دیکھ رہے ہو نہ کہاں وہ روشنیاں یہاں ایک قسم کا پورا شہر آباد ہو چکا ہے......'' میں ان کی بات سن کر ورطہ حیرت میں مبتلا رہ گیا اور وہ بھی میری شاید حیرت کو بھانپ گئے تھے۔ اب چلیں۔''

میں نے جواباً ہاں میں سر ہلایا اور یوں ایک بار پھر ہم نے نئے سرے سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ویسے بھی منزل اب چند قدم کے فاصلے پر تھی، مگر میری حیرت متواتر اپنی جگہ ساکت وجامد تھی کیونکہ مجھے اچھی طرح سے یاد تھا کہ چھ سات ماہ قبل ڈاکٹر عفقان حیدر کے ساتھ میں یہاں سے گزرا تھا تو ان سے میں نے اس علاقے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بھی اس بات کی تصدیق کی تھی کہ واقعی یہاں آسیب آباد ہیں جبکہ ڈاکٹر ضیاء کے مطابق گزشتہ کئی برسوں سے یہاں انسان آباد ہیں۔

شہروں کے اندر رات گئے تک چہل پہل ہوتی ہے۔ شہروں میں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں مگر میں یہ دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا کہ یہاں تو شہر سے بھی زیادہ گہما گہمی کا سماں تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ رات نہ ہو دن ہو۔ پورے شہر کا شہر آباد تھا۔ لوگ مسلسل خرید وفروخت میں مصروف تھے۔ میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ سر پہ آسمان ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اتنی جلدی یہ شہر کیسے آباد ہو گیا تھا حالانکہ چند ماہ قبل میں یہاں سے گزرا تھا۔ بہر حال ہو سکتا ہے مجھے کوئی ڈاؤٹ ہوا ہو۔ میں نے دماغ میں ابھرتے سوالوں کو رفع دفع کیا۔

''یہاں کے لوگوں میں تمہارے شہروں کی نسبت بہت اتفاق ہے۔ یہاں مہمان ایک گھر کا مہمان نہیں ہوتا بلکہ پورے شہر کا مہمان ہوتا ہے......'' انہوں نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا میری نگاہیں متواتر باہر ہجوم کر بلا پہ جمی ہوئی تھیں ان گلی بازاروں میں ضروریات زندگی کی ہر چیز میسر تھی۔

بالآخر ہماری گاڑی ایک خوبصورت عمارت کے

سامنے جارکی۔ نیند سے میری بوجھل ہوئی جارہی تھیں اور میں جلد سے جلد خواب خرگوش کے مزے لوٹنا چاہتا تھا۔ مسلسل تین چار گھنٹے کے اس طویل سفر نے مجھے تھکا کر رکھ دیا تھا۔ شاید ڈاکٹر ضیاء میری کیفیت سے واقف ہوچکے تھے گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے انہوں نے اندر سے نمودار ہونے والے ملازم کے ساتھ مجھے ڈرائنگ روم میں بھیجا۔

ڈرائنگ روم کی ڈیکوریشن دیکھ کر میں عش عش کر اٹھا۔ ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی گئی تھی۔ ڈرائنگ روم کافی کشادہ بنایا گیا تھا۔ غور کرنے پر پتہ چلا کہ ڈرائنگ روم میں ڈائننگ بھی ہے بس درمیان ایک پردہ دیوار کی طرح حائل تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ اٹیچ باتھ تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ساتھ باتھ میں بھی سنگ مرمر کی ٹائیلیں لگائی گئی تھیں۔ فرش پر موٹی دبیز کا قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف آمنے سامنے دو صوفہ سیٹ بڑے سلیقے سے سجائے گئے تھے اور ان کے بیچ میں شیشے کی بنی ایک لمبی سی ٹیبل رکھی تھی۔ ایک طرف بیڈ پڑا تھا۔ شمال کی طرف جہاں ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ تھا اسی طرف باتھ بنایا گیا تھا جبکہ اس کے مخالف سمت اوپر دیوار پر اسٹینڈ لگا کر اس کے اوپر ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ شاید ہمارے آنے سے قبل یہاں کوئی بیٹھا تھا کیونکہ ٹی وی چل رہا تھا۔ دیواروں پر مختلف تصویریں آویزاں تھی مگر ان کو دیکھ کر میرے رگ وپے میں خوف کی ایک لہر سرایت کرگئی۔ کیونکہ وہ سب بہت خوف ناک تصویریں تھیں کسی تصویر میں کسی انسان کی زبان منہ سے کتے کی زبان کی مانند لٹکی ہوئی اور اس سے گرتی خون کی بوندیں دکھائی دیں، جبکہ کسی تصویر میں انسان کے خوف ناک اور بڑھے ہوئے منہ سے باہر جھانکتے دانت دکھائے گئے تھے۔ کسی جگہ انسان کی درندگی کو دکھایا گیا تھا کہ ایک درندہ صفت انسان جس کے دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے اور وہ ان دانتوں کو کسی دوسرے انسان کی شہہ رگ میں پیوست کیے ہوئے تھا۔ الغرض ہر تصویر دوسری تصویر سے بھیانک منظر پیش کررہی تھی۔

''ڈاکٹر ظہیر......'' اچانک میری قوت سماعت سے ڈاکٹر ضیاء کی بازگشت ٹکرائی اور میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ان کے ہاتھ میں تولیہ تھا۔ ''مجھے پتہ ہے جناب کو تھکاوٹ تو بہت محسوس ہو رہی ہوگی اور نیند کا غبار بھی چھایا ہوگا مگر کبھی کبھی برداشت کا مادہ پیدا کرنا چاہئے۔ آپ ذرا فریش ہو جاؤ میں آپ کا من پسند گوشت تیار کروا رہا ہوں اور آج اگر تم انگلیاں نہ چاٹتے رہ جاؤ تو کہنا۔''

گوشت کا نام سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا نیند کا غبار پل بھر میں جاتا رہا۔ میں نے زندگی میں بہت سے کھانوں سے پیٹ کا دوزخ بھرا مگر جو مزہ ڈاکٹر ضیاء کے پکائے گوشت میں تھا اس کی تاثیر میں کبھی بھلا نہیں سکتا اور یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر میں کھانا اسپتال میں کھانے کے بجائے ڈاکٹر ضیاء کے ساتھ ہی ان کے کوارٹر پر جا کے کھایا کرتا تھا۔

میں فریش ہو کے غسل خانے سے باہر نکلا تو اگلا منظر دیکھ کر میرے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ ایک حسن کی دیوی ڈرائنگ روم کے اندر ٹیبل پر کھانا سجا رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کے وہ مسکرائی۔ اس کی جان لیوا مسکراہٹ نے جیسے میرے دل کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ میں نے آج تک اتنی خوبصورت دوشیزہ نہیں دیکھی۔ اس نے برائے نام ہی کپڑے پہن رکھے تھے جن سے اس کے جسم کا ایک ایک عضو واضح دکھائی دے رہا تھا۔ میں مبہوت ہو کے رہ گیا۔ وہ دھیمے قدم اٹھاتی میری طرف بڑھنے لگی جبکہ مجھے تشویش لاحق ہونے لگی کہ اوپر سے کوئی آ گیا تو کیا سوچے گا۔ باوجود کوشش کے میں اپنی جگہ سے نہ ہل سکا جیسے آہنی زنجیروں سے میرے قدموں کو جکڑ دیا گیا ہو۔

''بڑا ہینڈسم ہے یار تو......'' اس نے بے تکلفی کی انتہا کو چھوتے ہوئے میرے سینے سے اپنا سینہ ملاتے ہوئے کہا۔ اس کے سینے کے ابھار اب واضح طور پر میری نگاہوں کے سامنے تھے۔ اس کی گرم سانسیں مجھے اپنے

جسم میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک دم اس نے مجھے اپنی بانہوں کے حصار میں جکڑ لیا مجھے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ میرے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو رہی تھی۔ سانسوں کی روانی میں وقت محسوس ہو رہی تھی۔ میں خود کو اس کی بانہوں کے شکنجے سے چھڑانا چاہتا تھا مگر یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ اس کی بانہوں کے شکنجے کو میں نہ چھڑا سکا کہاں وہ ایک صنف نازک اور کہاں میں ہٹا کٹا نوجوان۔ مگر میری تمام ہمت اس کے سامنے کمزور ثابت ہوئی۔ مدہوشی کے عالم میں وہ مجھے بیڈ کی طرف گھسیٹتی چلی گئی اور میں کٹھ پتلی کی طرح گھسٹتا چلا گیا۔ اس نے آرام سے مجھے بیڈ پر لٹایا، میں اٹھ کر بھاگ جانا چاہتا تھا چیخنا چلانا چاہتا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے آج کوئی بھی چیز میرے اختیار میں نہ تھی اور پھر اس نے بے حیائی کے ہر پردے کو ختم کر دیا۔

مرد عورت کی عزت کی دھجیاں اڑاتے ہیں مگر آج یہاں یہ فقرہ الٹ ہو چکا تھا یہاں ایک عورت مرد کی عزت کی دھجیاں اڑانے پر تلی ہوئی تھی اور میں حیران و ششدر تھا کہ جب تک وہ یہ بھیانک کارنامہ سرانجام دیتی رہی اس کے گھر کا کوئی بھی فرد اندر داخل نہ ہوا۔ ہوسکتا ہے انہوں نے جان بوجھ کر اس آفت ناگہانی کو میرے سر پر سوار کیا ہو جو کسی بھوکی شیرنی کی طرح میرے جذبات کو کچا چبائے جارہی تھی مگر پھر آہستہ آہستہ مجھے بھی اس کی قربت میں راحت و سکون میسر آنے لگا تھا اور پھر میں نے خود کو مکمل طور پر نہ صرف اس کے کنٹرول میں دے دیا بلکہ اچانک ہی میری تمام سلب ہوئی طاقتیں جیسے لوٹ آئی تھیں اب نہ میرا بھاگنے کو من چاہ رہا تھا نہ چیخنے چلانے کو۔ اب وہ اکیلی من مانی نہیں کر رہی تھی بلکہ اس کی اس من مانی میں، میں بھی برابر کا شریک تھا۔

”زندگی میں پہلی بار کسی شکار نے اتنا مزہ دیا ہے۔“ وہ میرے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ کے بولی۔ اس کی سانسوں کی گرمی میرے حلق سے نیچے اترنے لگی۔

پھر وہ اٹھی اور کپڑے پہن کر باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

کھانا بہت لذیذ تھا آج انگلیاں چاٹنے کو نہیں کاٹ کر کھا جانے کو من چاہ رہا تھا۔ میں نے جی بھر کے کھانا کھایا۔ کھانے پر ڈاکٹر ضیاء کے تمام گھر والے اکٹھے تھے جن میں ان کے ماں باپ کے علاوہ وہ لڑکی جسے وہ اپنی بہن کہہ رہے تھے شامل تھی۔ وہ بار بار کھا جانے والی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے حیرانگی ہو رہی تھی کہ اس وقت بھی اس نے اتنا باریک لباس زیب تن کیا ہوا تھا کہ اس کے جسم کا ہر ایک عضو واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا مگر اس کے گھر والوں کو اس کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں تھی۔ کیسے عجیب لوگ تھے کہ اتنی چھوٹ وہ بھی ایک جوان لڑکی کو......؟ میرے ذہن میں خیال بجلی کی سی سرعت سے کوندا۔ اسی چھوٹ کا ہی نتیجہ ہے کہ اتنی لاپرواہ ہے کہ پل بھر میں ایک مہمان سے اپنے من کی بھٹی میں دہکتی آگ کو بجھایا تھا اس نے۔

”مجھے کل واپس جانا ہے......“ میں نے کھانا کھاتے ہوئے اچانک کہا تو ڈاکٹر ضیاء سمیت سب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے ابھی تو یہاں پہنچے ہیں اور واپسی کا بھوت تم پر سوار ہو گیا ہے......“ ڈاکٹر ضیاء مارے حیرت کے بوکھلاہٹ بھرے لہجے میں مجھے تکتے ہوئے بولے۔

”کیوں ہماری مہمان نوازی میں کوئی کمی رہ گئی ہے......؟“ اچانک ڈاکٹر ضیاء کی بہن جس کا نام انہوں نے سیمون بتایا تھا نے لقمہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی شوخی تھی۔

”لگتا تو ایسے ہی ہے کہیں نہ کہیں سے کوئی کمی ضرور رہ گئی ہے ورنہ یہاں تو جو بھی آتا ہے یہیں کا ہو کے رہ جاتا ہے......“ اب کی بار ڈاکٹر ضیاء کے باپ نے لقمہ دیا تو میں فرط حیرت سے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اب احساس ہو رہا تھا کہ میں

بہت غلط جگہ پرآ گیا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء کی اصلیت اب میرے سامنے کھل کر عیاں ہوئی تھی۔ وہ حقیقت سے بہت مختلف ثابت ہوا تھا۔ پورے کا پورا اوا ہی گندا تھا۔ شرافت کے لبادے میں ڈاکٹر ضیاء کی حقیقت بہت گندی تھی۔ وہ گندگی کا ایک کیڑا تھا جس میں اس کی پرورش ہوئی تھی۔ اس کا مطلب مجھ پرآشکارا ہو چکا تھا کہ اب سب کی ملی بھگت سے اس کی بہن نے ایسی بے ہودہ حرکت کی تھی۔

''تم غلط سوچ رہے ہو ڈاکٹر ظہیر......'' اچانک ڈاکٹر ضیاء نے پانی کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے انہیں میرے من میں مچلتے سوالوں اور باتوں سے کیسے آگہی حاصل ہوگئی۔

''ہمیں سب پتہ ہے ڈاکٹر ظہیر...... !تم کیا سوچ رہے ہو؟ تمہارے دماغ میں کیسے کیسے سوالات جنم لے رہے ہیں ہمیں سب سے مکمل طور پرآگاہی حاصل ہے اور کان کھول کر سن لو اب اگر ایسا کوئی خیال تمہارے ذہن میں پیدا ہوا تو پچھتاؤ گے......'' اب کی بار ڈاکٹر ضیاء کی ماں بولی۔ میرا من کررہا تھا کہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالوں یا دیواروں میں جا کے ٹکڑیں ماروں۔

''اوہ مرے اللہ! میں یہاں کن لوگوں کے بیچ میں آن پھنسا ہوں۔'' میں نے بے بسی کے عالم میں دل ہی دل میں کہا۔

''ہم یہاں تمہیں زبردستی نہیں لائے تم اپنی مرضی اور مشورے سے آئے ہو اور کل صبح تمہیں یہاں سے جانا ہوگا......'' ڈاکٹر ضیاء کی بات سن کر اندھا اور کیا چاہے دو آنکھیں؟ کے مترادف میں راضی ہوگیا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میرے من میں مچلتے سوالوں اور باتوں سے ان لوگوں کو کیسے آگاہی ہو رہی تھی۔

''مگر یہاں سے تم ایک ہی شرط پر جاؤ گے......'' اچانک مجھے اپنی پشت سے سیمون کی باز گشت سنائی دی دوسرے ہی لمحے کچھ کہے سنے بنا وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ڈرائنگ روم میں گھس گئی جبکہ مجھے اپنی پشت پر بے غیرتی اور بے حیائی سے لبریز قہقہے سنائی دینے لگے۔

☆......☆......☆

نجانے رات کا وہ کونسا خوش قسمت پہر تھا جب اس ناگن نے مجھے چھوڑا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ نیند کا غلبہ چھایا ہوا تھا پتہ ہی نہ چلا کہ کب نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی۔ اچانک مجھ کو یوں لگا جیسے کوئی مجھے پیہم جھنجھوڑ رہا ہو۔ میں نے سہمے ہوئے لہجے میں آنکھیں کھولیں۔ اندھیرے کی چادر چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی مگر آہستہ آہستہ دن کا اجالا اس اندھیرے پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ میں نے جب آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی کیونکہ میں رات میں ڈاکٹر ضیاء کے گھر اس کے ڈرائنگ روم میں سویا ہوا تھا جبکہ اب میں شہر کو جانے والے مین روڈ کے ایک طرف جھاڑی کی اوٹ میں لیٹا ہوا تھا۔ میں عجلت سے اٹھا اور کپڑے جھاڑے ایک نظر اپنے چہار سو ڈالی وہاں کوئی نہ تھا۔ حالانکہ مجھے جھنجھوڑ کے اٹھایا گیا تھا۔ ایک عجیب سے خوف نے مجھے اپنی گرفت میں گرفتار کر رکھا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر ڈاکٹر ضیاء کے شہر کی طرف دیکھا تو یہ دیکھ کر میں گنگ رہ گیا کہ رات جہاں دور سے شہر کی لائٹنگ دکھائی دے رہی تھیں وہاں اب کچھ بھی نہ تھا۔ میں عجیب شش و پنج میں مبتلا تھا۔ دن کا اجالا اندھیرے کی دبیز تہہ کو ختم کرتا جارہا تھا مجھے کچھ سمجھ نہ آرہا تھا۔

اچانک میری قوت سماعت سے ڈاکٹر ضیاء کی بازگشت سنائی دی مگر آواز سن کے میں نے چاروں اطراف دیکھا بولنے والا کہیں موجود نہیں تھا۔

''ڈاکٹر ظہیر ملک...... !تم یہی کہہ رہے تھے ناں کہ یہ علاقہ آسیب کے قبضہ میں ہے تو غور سے سنو...... میں ڈاکٹر ضیاء...... خود ایک آسیبی دنیا سے ہوں۔ میں تمہارے بیچ رہنا چاہتا تھا مگر ہماری ایک لمٹ ہوتی

ہے اس سے زیادہ ہمیں انسانوں سے میل جول کی اجازت نہیں ہوتی...... تم اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے تو بے موسمی چیزوں کو دیکھ کر گنگ رہ جاتے تھے تو اس کی وجہ اب تمہاری عقل میں آ گئی ہوگی...... اور ہاں تمہیں میرے ہاتھ کے پکے گوشت میں بڑی لذت محسوس ہوتی تھی مگر اب یہ لذت تم خود بھی اپنے ہاتھوں میں پیدا کر سکتے ہو......'' قہقہہ بلند ہوا۔

''جانتے ہو کیسے۔'' انسانوں کو مار کر ان کے گوشت خود پکاؤ...... جو گوشت میں تمہیں کھلایا کرتا تھا وہ لذت سے بھرا ہوا اس لئے ہوتا تھا کہ وہ تم جیسے انسانوں کا گوشت ہوتا تھا اور جو مشروب تم پینے میرے پاس اسپیشل آتے تھے وہ بھی تم جیسے انسانوں کا خون ہوتا تھا جسے مشروب جان کر تم حلق میں انڈیل جاتے تھے مگر...... مگر تم ٹینشن نہ لو ہم آسیب کی خوراک تو روز اول سے ہی تم جیسے انسان ہیں مگر اب تمہاری خوراک بھی یہی انسان ہیں اور جب تک تم انسانوں کے خون اور گوشت کو حلق سے نیچے نہیں اتارو گے تمہاری پیاس اور بھوک نہیں مٹے گی چاہے دنیا کی کوئی بھی چیز کھالو...... اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو لاغر و کمزور ہوتے جاؤ گے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر مر جاؤ گے......'' ایک بار پھر قہقہوں کی بازگشت میری قوت سماعت سے ٹکرائی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میں نے چہار سو دیکھا مگر کوئی بھی نظر نہ آیا اسی وقت میں نے کسی گاڑی کے چرچراتے پہیوں کی بازگشت سنی جیسے کسی نے زبردست بریک لگا کے گاڑی روکی ہو مگر وہ کون تھا یہ میں نہ دیکھ سکا اور دوسرے ہی لمحے دنیا و مافیا سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

میری آنکھ کھلی تو چند جانے پہچانے چہرے نظروں کے سامنے آئے۔ پہلے تو دھندلاہٹ کی وجہ سے واضح نہ دکھائی دیئے مگر پھر آہستہ آہستہ آنکھوں پر چھائی دھندلاہٹ کی چادر معدوم پڑنے لگی تو میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر عفقان حیدر میرے اوپر جھکے ہوئے ہیں مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ان کے لبوں پر ایک فاتحانہ سا تبسم پھیل گیا۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر وہ سیدھے کھڑے ہو گئے تو مجھے اندینہ کا مکھڑا دکھائی دیا اس کی آنکھوں میں گہرہائے آبدار کی چمک بہت واضح دکھائی دی جبکہ پیشانی پر سلوٹیں عیاں تھیں مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر اس کے چہرے پر کچھ اطمینان کے تاثرات نمایاں ہوتے دکھائی دیئے۔

''مبارک ہو ڈاکٹر ظہیر ملک! یوں سمجھ لو کہ اللہ نے تمہیں ایک اور زندگی عطا کی ہے......'' ڈاکٹر حیدر کی بات سن کر میں انگشت بدنداں رہ گیا اور پھر کسی فلم کی طرح گزرے لمحات کی فلم میرے دماغ کی اسکرین پر چلنے لگی۔

''میں یہاں تک کیسے آیا میں تو......؟'' میں نے سوالیہ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو انہوں نے میرا فقرہ مکمل ہونے سے قبل ہی مجھے ٹوکا۔

''پرسوں رات جب آپ لوگ یہاں سے چلے گئے تو رات مجھے اپنے سسر کی کال موصول ہوئی کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں مجھے ملنے آ رہے ہیں اور صبح ہی صبح وہ یہاں پہنچ جائیں گے وہ وہاں سے رات تین بجے نکلے کیونکہ کام ہی کچھ ایسا تھا اتفاق سے وہ ابھی شہر سے تھوڑا دور نیازی موڑ پہ پہنچے کہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں انہوں نے تمہارے وجود کو دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے تم سڑک کے کنارے گر کر بے ہوش ہو گئے۔ اس کے ساتھ ان کے باڈی گارڈز بھی تھے۔ انہوں نے فوراً تمہیں یہاں پہنچا دیا اور ڈاکٹر ضیا کی اصلیت بھی ہم پر عیاں ہو چکی ہے۔ بس تم اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھو کہ ایسے درندوں سے تمہاری جان بچ گئی، جو انسانی گوشت کے بھوکے اور انسانی خون کے پیاسے ہیں......'' ڈاکٹر حیدر کی بات سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا تھا اور بیتے پل کو یاد کر کے میں خوفزدہ ہو گیا۔ خصوصاً اس ظالم ہوس پرست پیاسی ڈائن کو یاد کر کے تو میں نے جھرجھری سی لی۔

''اب کیسے ہو تم......؟'' اچانک میری قوت

سماعت سے میری جان کی بازگشت ٹکرائی۔
''تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کچھ ہوسکتا ہے کیا.....؟ میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے اٹھ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا جبکہ وہ میرے پاس آکر سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کے لب ولہجے سے یاس وپریشانی کی کیفیت عیاں تھی۔

''تم نے تو میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی علی الصبح جب ڈاکٹر حیدر نے کال کرکے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تو میرے توایک دم حواس باختہ ہوگئے تھے.....'' اس نے میرے ہاتھوں کو اپنے نرم وگداز ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر حیدر اور باقی لوگ جن میں دو ڈسپنسر اور ایک نرس تھی باہر جاچکے تھے۔

''کیا.....؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر حیدر نے تمہیں کال کرکے بتایا۔''

''ہاں تو بھلا اس میں چونکنے والی کونسی بات ہے، جب سب کو اپنی محبت کی ہسٹری سنائی ہے اور سب کو بتایا ہے کہ ہم کورٹ میرج کررہے ہیں تو اب اس بوکھلاہٹ کے کیا معنی.....؟'' اس نے بھنویں سیکٹر کر شوخی بھرے لہجے میں کہا اور کورٹ میرج والے فقرے پر تو وہ شرم سے جیسے پانی پانی ہورہی تھی۔ ''سب کو بتانے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ ہم کوئی دنیا سے انوکھا کارنامہ سرانجام دینے والے تھے اور وقت سے پہلے ایسی باتیں سب کو بتا کر کیوں اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مارنے کے ارادے ہیں۔''

وہ مجھے سمجھانے والے لہجے میں بولے چلی جارہی تھی جبکہ میں اس کی باتیں سن کر ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوئے چلا جارہا تھا۔ ان سب باتوں کا ڈاکٹر حیدر کو کیسے نالج ہوا حالانکہ یہ سب باتیں تو میرے اور ڈاکٹر ضیاء کے بیچ ہوئی تھیں سوالوں کی ہزاروں رمزیں میرے دل ودماغ پر حاوی ہورہی تھیں۔

''تم میری باتیں سن کر ایسے تذبذب کا شکار کیوں ہوئے جارہے ہو.....؟'' اس نے میری کیفیت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ ان سب باتوں کا پل بھر میں ڈاکٹر حیدر کو کیسے پتہ ہوا حالانکہ یہ سب باتیں صرف میرے اور ڈاکٹر ضیاء کے بیچ میں ہوئی تھیں.....'' میں نے اپنی پریشانی کو زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

''تو بھلا اس میں پریشانی والی کونسی بات ہے.....'' اسی نے ڈاکٹر حیدر کو ساری بات بتائی تھی اور تمہیں ہوش میں آنے سے قبل ڈاکٹر حیدر نے مجھے کہا ہے کہ جیسے ہی تم ہوش میں آتے ہو وہ یہاں ساری ارینجمنٹ کرکے ہمارا نکاح پڑھوادیں گے۔'' اس کی بات سن کر میں خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ میری ساری حیرت ساری پریشانی آٹومیٹکلی رفع دفع ہوچکی تھی۔ میں تو خود ڈاکٹر حیدر اور اس ڈریکولا صفت انسان کو ساتھ ملانا چاہتا تھا کیونکہ اگر ان کی معاونت نہ ہوتی تو میرے اکیلے کے لئے مصائب کا مقابلہ ایک دم سے بہت دشوار ہوجاتا تھا۔

قبل اس کے کہ ہم میں سے کوئی گفت وشنید کے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھاتا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر حیدر زیرلب مسکراتے ہوئے اندر آئے۔

''ہاں مسٹر اب اس بستر کی جان چھوڑو اور اپنی جان کی جان پکڑو.....'' انہوں نے اندینہ کی طرف اشارہ کرکے کہا تو اندینہ نے شرما کر منہ نیچا کرلیا۔ ''بہت ہوگئی اب اٹھو اور جلدی سے تیار ہوکر میرے روم میں آؤ سب انتظامات کمپلیٹ ہیں اور بیٹا ہم نے ایک بیوٹیشن کو بلایا ہے وہ آپ کو تیار کردے گی۔'' اندینہ کو مخاطب کرتے ہوئے۔ اور زیادہ دیر نہ کرو اندینہ کے اسکول میں چھٹی ہونے میں بہت کم وقت رہ گیاہ، یہ نہ ہو کہ سارے کئے کرائے پہ پانی پھر جائے۔ اس لئے جلدی کرو قبل اس کے کہ رنگ میں بھنگ پڑجائے۔''

عین اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک نرس اندر آئی جو اندینہ کو ہاتھ سے پکڑ کرلے گئی، میں عجلت میں اٹھا اور

جلدی سے واش روم میں گھس گیا۔

☆......☆......☆

سب کچھ اتنی جلدی ہوجائے گا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ ”چٹ منگنی پٹ بیاہ“ کے ساتھ ہماری شادی ہوگئی۔ میرے اور انذینہ کے گھر والوں کو ڈاکٹر عفقان حیدر نے مطلع کردیا تھا کہ ہم دونوں نے کورٹ میرج کرلی ہے اس لئے اگر کسی نے کسی قسم کی کوئی ہمارے کسی کام میں انٹرفیئرینس کی کوشش کی تو ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا میں حیران رہ گیا کہ میرے اور انذینہ کے گھر والوں میں سے کسی نے کسی قسم کا کوئی ایکشن نہ لیا۔

انذینہ زیورات اور آنچل کے بوجھ سے لدی حجلہ عروسی میں میری منتظر تھی۔ ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جارہے تھے۔ میں کمرے میں انٹر ہوا تو انذینہ کو دیکھ کے حیرت کا مجسمہ بن کے رہ گیا۔ وہ کسی مصور کا تخیل نظر آرہی تھی۔ حسن تو ویسے ہی اس پر ٹوٹ کے برسا تھا مگر آج زیورات، سرخ لباس اور زیورات نے اس کے حسن میں انتہا کا اضافہ کردیا تھا اس حال میں تو اسے دیکھ کے ماہتاب بھی شرائے بنا رہ سکتا۔ میں اپنے خالق کی اس تخلیق پر اور اس کی اس عطا پر بہت خوش تھا۔ میں اس خالق کائنات کا جتنا شکر بجالاتا کم تھا۔

سہاگ رات، ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت وعدے کے ساتھ جینے مرنے کے وعدے، حالات چاہے جیسے بھی سنگین ہوجاتے ہم نے ثابت قدم رہنے کی قسمیں کھائیں سوائے موت کے اب ہمارے بیچ کوئی انٹرفیئرینس کرنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ سہاگ رات ہماری زندگی کی ایک یادگار رات تھی اور یہ رات پہلی اور آخری رات ثابت ہوئی اس رات کے بعد میں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی محبت کا خون کرڈالا۔ ان قسموں، وعدوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خود ہی اپنی محبت کا قاتل بن بیٹھا۔

☆......☆......☆

سہاگ رات تو جیسے تیسے گزر گئی مگر صبح اٹھنے کے ساتھ ہی بھوک اور پیاس سے میرا برا حال تھا۔ ڈاکٹر حیدر نے صبح ہی صبح مجھے پیغام دیا کہ انہوں نے ہمارے ہنی مون کے لئے مری جیسے خوب صورت شہر میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کمرہ بک کروایا ہے اور آج ناشتے کے فوراً بعد ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔

بقول ڈاکٹر حیدر کے۔

حالات ابھی جس ڈگر پر چل رہے ہیں ہر قدم پھونک کر رکھنا بہت ضروری ہے لہٰذا ابھی تم لوگوں کا یہاں رکنا ٹھیک نہیں لہٰذا جو تھوڑا بہت سامان لے جانا ہے پیک کرو اور اندھیرے میں ہی یہاں سے چلتے بنو ایک ہفتہ آپ لوگ ایزی ہو کے انجوائے کرو ہفتے کے اندر اندر میں سارے معاملات خود سنبھال لوں گا...... ڈاکٹر حیدر کی اس ہمدردی پر میں مرمٹا تھا...... ہماری خوشی کی خاطر انہوں نے اپنے سر پر کفن باندھ لیا تھا اور خود کو دگرگوں حالات کے لئے تیار کرلیا تھا کیونکہ ویسے بھی اس سارے کام کے پیچھے ان کا ہی ہاتھ تھا اور ہم سے زیادہ خطرے میں ان کی زندگی تھی مگر انہوں نے حق ادا کیا تھا۔

ہم علی الصبح روانہ ہوئے اور دن گیارہ بارہ بجے متعلقہ روم میں تھے۔ ڈرائیور بھی ہمارے ساتھ ہی تھا۔ اس کے لئے سیپرٹ روم بک کروایا تھا بھوک و پیاس سے میرا بڑا برا حال تھا اوپر سے سفر کی تھکاوٹ نے جان نکال دی تھی۔

تیز دھوپ ہو تو آسمان کا رنگ شفاف نیلم کی طرح لگتا ہے۔ دھوپ کم ہو تو منظر سناٹے کی چادر اوڑھ لیتا ہے ہر شے رنگ بدل لیتی ہے بہار اپنے عروج پر تھی۔ سبزے کا رنگ چمکدار اور ہوا پہاڑی پھولوں کی خوشبو سے بوجھل تھی۔ وادی کی ہوا سرد، بوجھل اور نم آلود ہوچکی تھی۔ پہاڑوں کے اس پار سے آنے والے بادل صنوبر اور چیڑ کے درختوں کو کہیں پیچھے چھوڑتے ہوئے گھروں کی بالکونی میں گھومتے اور کھڑکیوں سے ہوتے ہوئے بند کمروں کے اندر جھانکتے تھے۔ یہ ہوا، یہ بادل، یہ درخت، یہ پودے، پتھر یہ سب اس وقت کتنے خوش

ہر سار اور جر پور شادی دے رہے تھے۔ پرندوں کے غول کے غول گھنے درختوں سے اڑتے اور ان کی چہکاریاں فضا میں شور سا برپا کر رہی تھیں۔

اندینہ کمرے کی کھڑکی کھول کے باہر کی دنیا سے لطف اندوز ہو رہی تھی اس کی آنکھیں ہنوز کھڑکی سے باہر خوبصورت علاقے پر جمی ہوئی تھیں جبکہ میں بری طرح تذبذب کا شکار ہوئے جا رہا تھا۔ کچھ بے زاری، کچھ اکتاہٹ، ایک ہلکی سی بے چینی سارے بدن میں نشاط انگیز بے چینی بھر رہی تھی۔ اس لئے میں فوراً فریش ہو کے آیا اس کے بعد اندینہ نے بھی فریش ہو کے چینج کیا ہلکے اسمانی اور سبز رنگ کے میچنگ ڈریس میں وہ بلا کی خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ میں اس وقت کسی بھی طرح کے پیار و محبت کے موڈ میں نہیں تھا اس کے آتے ساتھ ہی میں نے بیل دے کر ویٹر کو بلایا اور اسے فوراً سے بھی پہلے کھانا لانے کا آرڈر دیا۔

"تمہیں پتہ ہے ظہیر! میں نے کبھی خواب وخیال میں بھی نہ سوچا تھا کہ حالات ایسے ہمیں ملائیں گے......" اندینہ نے بالوں کو تولیے سے خشک کرتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی سب کچھ یوں اچانک وقوع پذیر ہو جاتا ہے جس کے بارے میں انسان کی سوچ نہیں ہوتی میری جاں......" میں نے اسے پشت سے ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنے گھر والوں کی بڑی ٹینشن ہے نجانے ہمارے بعد ان لوگوں پر کیا بیت رہی ہو گی۔" اندینہ کے لہجے میں یاس و پریشانی کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔

"اب تمہیں ٹینشن لینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کیونکہ تمہارے گھر والوں نے تمہیں اور میرے گھر والوں نے مجھے نہ صرف منقولہ وغیر منقولہ جائیداد سے عاق کر دیا ہے بلکہ ہم سے وابستہ اس ہر رشتے کو ختم کر دیا ہے جو بھی ان تک جاتا تھا انہوں نے خود کو ہمارے ہر جائز و ناجائز معاملے سے بے دخل کر دیا ہے۔" میں نے اسے چھوڑ کے آگے بیگ کھول کر نیوز پیپر نکالتے ہوئے کہا جبکہ وہ قد آدم آئینے میں ہی میری حرکات و سکنات کو دیکھتی رہی اور ساتھ ساتھ بال بھی خشک کرتی رہی شاید اسے حیرانگی ہوئی تھی کہ میں نے ایک دم اسے چھوڑ کر بیگ کھولا تھا۔

نیوز پیپر کا ٹکڑا میں نے اسے دکھایا جس میں ہم دونوں سے متعلقہ خبر تھی جس میں ہم دونوں کے گھر والوں نے ہمیں عاق کر دیا تھا۔

نیوز پیپر کا ٹکڑا اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما، عین اسی لمحے میں نے اس کی آنکھوں میں جگ مگ کرتے جگنوؤں کی چمک دیکھی۔ صنف نازک کا دل موم کا بنا ہوتا ہے۔ اور وہی موم کا دل میری زوجہ کو تکلیف پہنچا رہا تھا اپنوں کی جدائی کا دکھ اسے کرب دے رہا تھا میری خاطر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے میرے ساتھ آ گئی تھی۔ اس نے میری خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اپنا فیوچر داؤ پر لگا دیا تھا۔

خالص جذبات رکھنے والے لوگ اس دنیا کی پرکھ پر پورا نہیں اتر سکتے۔ کتنے لوگ ہوتے ہیں ایسے سینکڑوں نہیں، ہزاروں میں سے ایک...... اتنے حساس...... اتنے زود رنج...... جذبتا ناپختہ اور قوت مدافعت زیرو...... اس پر تربیتی ماحول کی کمی...... انہیں ہتھیلی پر آبلے کی صورت رکھو تو بھی پھوٹ بہتے ہیں۔ کسی ہلکی سی ٹھیس سے بھی جیسے تتلی کے نازک پروں کو کتنی بھی احتیاط سے چھوئیں۔ ان کے پوروں پر ہی اتر آتے ہیں۔ ایسے لوگ عام نہیں ہو سکتے...... جو زرد، تنہا، خزاں رسیدہ درختوں پر عاشق ہوں...... جن کی آنکھیں درخت سے جدا ہونے والے پتوں پر لہو رونے لگتی ہیں جو مدرہ تتلیوں کے پروں کو سینت سینت کر رکھتے ہیں...... جو بدلتے موسموں کی ایک ایک جنبش سے باخبر رہتے ہیں...... جو خوشیوں کے تقدس میں ذرا سی اونچ نیچ برتنے والوں کو ناخالص اور قابل نفرت گردانتے ہیں...... ایسے لوگ عام ہو ہی نہیں سکتے۔ اور میری اندینہ بھی انہی میں سے ایک تھی مگر اس نے میری خاطر بہت بڑی قربانی دی تھی جسے میں مر کر بھی نہیں بھلا پاؤں گا۔

کمرے کی بیل بجنے پر ہم دونوں چونکے اور پھر میں نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا ویٹر گرم گرم کھانا لئے حاضر تھا۔ ایک بار پھر سے میری بھوک ٹھاٹھیں مارنے لگی۔ ویٹر ایک ٹرالی کے اندر کھانے کی مختلف ڈشز سجا کے لے آیا تھا جو اس نے ٹیبل پر ایک بڑی ترتیب سے سجا دی تھی۔

ہم دونوں نے مل کر خوب سیر ہو کے کھانا کھایا، کھانا بہت لذیذ تھا مگر میری بھوک تھی کہ پھر بھی مٹنے کا نام تک نہ لے رہی تھی۔ ایک عجیب سی الجھن میرے رگ وپے میں جنم لے رہی تھی۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر اتنا کچھ کھالینے کے باوجود میری بھوک وپیاس ختم ہونے کا نام کیوں نہیں لے رہی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر ریسٹ کرنے کا سوچا۔ سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے نیند غالب آرہی تھی۔ آنکھیں بوجھل ہوتی جارہی تھی۔ ویسے بھی یہاں کے دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں اور نیند پوری کیے بنا گھومنا پھرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے ویٹر تمام سامان اٹھا کر لے گیا میں نے کمرے کو اندر سے لاک کیا۔ سلیپنگ ڈریس پہن کے ہم دونوں بیڈ پر ڈھیے سے گئے۔

لیٹنے کی دیر تھی کہ نیند کی دیوی ہم دونوں پر مہربان ہوگئی۔ نیند بھی جیسے ہمارا راستہ تک رہی تھی۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک ویران وسنسان جگہ پر کھڑا ہوں۔ اچانک ایک طرف سے گردوغبار اڑاتے گھوڑے کو میں نے دیکھا جو بہت سرعت سے میری طرف لپک رہا تھا۔ جب وہ کچھ نزدیک آیا تو میں نے دیکھا کہ اس پر کوئی شخص براجمان ہے جس نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا ہے۔ وہ آناً فاناً میرے پاس آکے رک گیا۔ اس نے نقاب اتارا تو میں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ وہ کوئی اور نہیں ڈاکٹر ضیاء تھا۔

”مجھے پتہ ہے تم پر کیا بیت رہی ہے......؟“ اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کہا بھی تھا کہ تم اب ہم جیسے بن چکے ہو، چلو آنکھیں کھولو اور اس نرم گرم لہو کو اپنے حلق میں انڈیلو اور دیکھو تو کیسا دلکش اور حسین جسم کی مالک ہے تمہاری زوجہ، نوچ نوچ کر گوشت کھاؤ بہت مزے کا گوشت ہے چلو شاباش۔“

اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی میری پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی، تبھی میری نگاہ پاس لیٹی اندینہ پر پڑی جو گھوڑے بیچ کے سو رہی تھی۔ اس کا دلکش سراپا قیامت برپا کر رہا تھا۔ عین اسی ثانیے کمرے کی کھلی کھڑکی سے یخ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے دل ودماغ کو راحت پہنچائی میں تھوڑا آگے ہوا اندینہ کو سینے سے چپکایا شاید وہ بھی نیم غنودگی کی حالت میں تھی اس نے اپنا ہاتھ میری کمر پر رکھا، اسی لمحے مجھے لگا جیسے میرے اگلے دونوں دانت خود بخود باہر نکلتے چلے آرہے ہیں میں اندینہ کے اوپر لیٹ گیا، اب وہ میرے نیچے تھی اور مکمل طور پر میرے شکنجے میں تھی۔ تبھی میں نے اپنے دونوں دانت اس کی شہ رگ میں گاڑ دیئے، خون کے گرم گرم فوارے جاری ہوئے اور اس کا گرم گرم خون میری رگوں میں پہنچنے لگا۔

وہ معصوم بے گناہ محبت کی دیوی اس آفت ناگہانی کے لئے کہاں تیار تھی، اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر بے سود، میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، وہ بار بار میرا ہاتھ منہ سے ہٹانے کے لئے تگ ودو کر رہی تھی مگر اس کی ہر تگ ودو آج اس کے لئے کسی کام نہ آنے والی تھی۔ میں اس وقت مکمل طور پر خون آشام تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت وبے چارگی بھری ہوئی تھی۔ آخر اس کی ہر سعی ناکام ہوتی چلی گئی اور پھر وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

خون کا آخری قطرہ تک میں نے اس کے حلق سے نچوڑ لیا تھا۔ میں بیڈ پر اس کے پیروں والی سائیڈ پر بیٹھ گیا میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی جو پیلا ہو چکا تھا اس کی آنکھیں خوف وحیرت سے کھلی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اسے کتنی عبرتناک موت مارا گیا تھا مگر اس وقت مجھے صرف اس

کمرے کی بیل بجنے پر ہم دونوں چونکے اور پھر میں نے آگے بڑھ کے دروازہ کھولا ویٹر گرم گرم کھانا لئے حاضر تھا۔ ایک بار پھر سے میری بھوک ٹھاٹھیں مارنے لگی۔ ویٹر ایک ٹرالی کے اندر کھانے کی مختلف ڈشز سجا کے لے آیا تھا جو اس نے ٹیبل پر ایک بڑی ترتیب سے سجادی تھی۔

ہم دونوں نے مل کر خوب سیر ہو کے کھانا کھایا، کھانا بہت لذیذ تھا مگر میری بھوک تھی کہ پھر بھی مٹنے کا نام تک نہ لے رہی تھی۔ ایک عجیب سی الجھن میرے رگ وپے میں جنم لے رہی تھی۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر اتنا کچھ کھالینے کے باوجود میری بھوک وپیاس ختم ہونے کا نام کیوں نہیں لے رہی۔ کھانا کھانے کے بعد ہم نے تھوڑی دیر ریسٹ کرنے کا سوچا۔ سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے نیند غالب آرہی تھی۔ آنکھیں بوجھل ہوتی جارہی تھی۔ ویسے بھی یہاں کے دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں اور نیند پوری کیے بنا گھومنا پھرنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے ویٹر تمام سامان اٹھا کر لے گیا میں نے کمرے کو اندر سے لاک کیا۔ سلیپنگ ڈریس پہن کے ہم دونوں بیڈ پر ڈھیے سے گئے۔

لیٹنے کی دیر تھی کہ نیند کی دیوی ہم دونوں پر مہربان ہوگئی۔ نیند بھی جیسے ہمارا راستہ تک رہی تھی۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک ویران وسنسان جگہ پر کھڑا ہوں۔ اچانک ایک طرف سے گرد وغبار اڑاتے گھوڑے کو میں نے دیکھا جو بہت سرعت سے میری طرف لپک رہا تھا۔ جب وہ کچھ نزدیک آیا تو میں نے دیکھا کہ اس پر کوئی شخص براجمان ہے جس نے نقاب سے اپنا چہرہ چھپایا ہوا ہے۔ وہ آناً فاناً میرے پاس آکے رک گیا۔ اس نے نقاب اتارا تو میں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ وہ کوئی اور نہیں ڈاکٹر ضیاء تھا۔

”مجھے پتہ ہے تم پر کیا بیت رہی ہے......؟“ اس نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کہا بھی تھا کہ تم اب ہم جیسے بن چکے ہو، چلو آنکھیں کھولو اور اس، گرم گرم لہو کو اپنے حلق میں انڈیلو اور دیکھو تو کیسا دلکش اور حسین جسم کی مالک ہے تمہاری زوجہ، نوچ نوچ کر گوشت کھاؤ بہت مزے کا گوشت ہے چلو شاباش۔“

اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی میری پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی، تبھی میری نگاہ پاس لیٹی انذیبنہ پر پڑی جو گھوڑے بیچ کے سو رہی تھی۔ اس کا دلکش سراپا قیامت برپا کر رہا تھا۔ عین اسی ثانیے کمرے کی کھلی کھڑکی سے یخ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے دل ودماغ کو راحت پہنچائی میں تھوڑا آگے ہوا انذیبنہ کو سینے سے چپکایا شاید وہ بھی نیم غنودگی کی حالت میں تھی اس نے اپنا ہاتھ میری کمر پر رکھا، اسی لمحے مجھے لگا جیسے میرے اگلے دونوں دانت خود بخود باہر نکلتے چلے آرہے ہیں میں انذیبنہ کے اوپر لیٹ گیا، اب وہ میرے نیچے تھی اور مکمل طور پر میرے شکنجے میں تھی۔ تبھی میں نے اپنے دونوں دانت اس کی شہہ رگ میں گاڑ دیئے، خون کے گرم گرم فوارے جاری ہوئے اور اس کا گرم گرم خون میری رگوں میں پہنچنے لگا۔

وہ معصوم بے گناہ محبت کی دیوی اس آفت ناگہانی کے لئے کہاں تیار تھی، اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر بے سود، میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، وہ بار بار میرا ہاتھ منہ سے ہٹانے کے لئے تگ ودو کر رہی تھی مگر اس کی ہر تگ ودو آج اس کے لئے کسی کام نہ آنے والی تھی۔ میں اس وقت مکمل طور پر خون آشام تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت وبے چارگی بھری ہوئی تھی۔ آخر اس کی ہر سعی ناکام ہوتی چلی گئی اور پھر وہ ٹھنڈی پڑ گئی۔

خون کا آخری قطرہ تک میں نے اس کے حلق سے نچوڑ لیا تھا۔ میں بیڈ پر اس کے پیروں والی سائیڈ پر بیٹھ گیا میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی جو پیلا ہو چکا تھا اس کی آنکھیں خوف وحیرت سے کھلی ہوئی تھیں جنہیں دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اسے کتنی عبرتناک موت مارا گیا تھا مگر اس وقت مجھے صرف اس

بات کا پتہ تھا کہ میں نے اس کے خون گوشت سے اپنی پیاس اور بھوک مٹائی ہے۔

میں اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگا۔ اس کے کپڑے پھاڑ کے میں نے ایک طرف پھینک دیئے، میں نے اس کے پیروں، ہاتھوں حتیٰ کہ چہرے تک کا گوشت نوچ لیا اور کھا گیا، اس کی کنڈیشن بہت ڈراؤنی تھی، تبھی مجھے اپنی پشت کی طرف سے قہقہوں کی باز گشت سنائی دی میں نے گردن موڑ کر دیکھا تو ڈاکٹر عفقان حیدر اور ڈاکٹر فہمون ضیاء دونوں صوفے پر براجمان تھے اور مجھے دیکھ دیکھ کے مسلسل قہقہہ لگا رہے تھے میں ان دونوں کو دیکھ کر حیران وششدر رہ گیا میں نے جلدی سے دروازے کی سمت دیکھا وہ اندر سے لاک تھا تو یہ دونوں کہاں سے آن وارد ہوئے۔

''سناؤ مزہ آیا کہ نہیں......'' ڈاکٹر حیدر کے منہ سے یہ بات سن کر میں سکتے میں رہ گیا تبھی جیسے میں جھرجھری لے کر ہوش کی دنیا میں لوٹا دیکھا تو میری دنیا اجڑ چکی تھی میں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی پیاری بیوی کا مرڈر کر دیا تھا۔ اس بیوی کا جس نے میری خاطر سب کچھ چھوڑ دیا تھا، میں نے اسے اس کی وفاؤں کا کیا خوب صلہ دیا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تھے

''ڈاکٹر ظہیر......!'' ڈاکٹر ضیاء نے اب کی بار مجھے مخاطب کیا اس کے لب ولہجے میں واضح چبھن اور طنز تھا۔

''یہ مگرمچھ کے آنسو اب کسی کام کے نہیں ہیں۔ اب تو سیدھا لٹکو گے تم سولی پر اور جلدی ہماری دنیا کے باسی بن جاؤ گے، تم جیسے قابل انسانوں کی ہمیں بہت ضرورت ہے، ہماری دنیا میں بہت رنگینیاں ہیں نہ کوئی ٹینشن، نہ الجھن نہ کسی کا ڈر۔''

''میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا......'' میں غصے سے چلایا اور ان کی طرف لپکا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے میرے قدموں کو آہنی زنجیروں سے جکڑ دیا گیا ہو۔ میں جہاں تھا وہیں کا وہیں ساکت وجامد ہو کے رہ گیا۔

''اور......غصہ نہیں ڈاکٹر ظہیر ملک......!'' ڈاکٹر عفقان حیدر نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم چلتے ہیں جلد ہی ملاقات ہوگی۔''

اتنا کہہ کر دونوں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئے، میں نے اپنے ہاتھوں اپنے پیاری بیوی کا قتل کر دیا تھا اس کا خون پی گیا تھا اور اس کا گوشت تک نوچ نوچ کر کھا گیا تھا، کیا یہی اس کی محبت کا صلہ تھا؟ وہ تو صرف پھول تھی یا تتلی، یا سیپ میں بند موتی یا پھر آسمان سے بچھڑا کوئی تارا...... جسے قدرت نے پھر آسمان پر سجا دیا تھا۔ اب میرے سامنے صرف ایک ادھڑی ہوئی لاش پڑی تھی میری محبوبہ تو اپنے خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔ میں دھاڑیں مار مار کے رونے لگا میری آواز سن کر سب اکٹھے ہوگئے۔ مجھ میں اتنی جسارت نہ تھی کہ اٹھ کے دروازہ کھولتا۔ دروازہ توڑ کے ہوٹل کا عملہ اندر داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر سب ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوگئے، میں آرام سے اٹھا کسی میں اتنی جسارت نہ تھی کہ کوئی مجھے روک سکتا۔ انہوں نے جلدی سے اندینہ کے مردہ جسم پر ایک کپڑا ڈالا۔

میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوٹل سے باہر نکلا۔ اتفاقاً تھانہ ہوٹل کے بالکل سامنے تھا۔ میرا رخ سیدھا تھانے کی طرف تھا شاید ہوٹل والوں نے تھانے میں اطلاع کر دی تھی کیونکہ اسی وقت مجھے تھانے سے بھاری نفری ہوٹل کی طرف آتی نظر آئی مگر میرے قریب آکر کچھ کانسٹیبلوں نے مجھ پر رائفلیں تان لیں مگر میں ان سب کی پرواہ کیے بنا چلتا رہا۔ ایک نے بڑھ کر مجھے ہتھکڑی ڈالنے کی کوشش کی مگر میری آنکھوں میں اترا خون دیکھ کر دوسرے کانسٹیبل نے اسے منع کر دیا۔ ویسے بھی میں تھانے میں ہی جا رہا تھا مگر انہوں نے متواتر رائفلیں مجھ پر تان رکھی تھیں۔ شاید انہیں اب اعتماد نہ تھا کہ میں کسی بھی لمحے دھوکہ دے کے بھاگ نہ جاؤں۔

مجھے ایک علیحدہ کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ اسی شام مجھے جیل پہنچا دیا گیا۔ عدالت نے مجھے فوری پھانسی

چاہتا تھا لہٰذا عدالت نے ایک دن مجھے دیا۔" اتنا کہہ کر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"میرے گھر والوں نے مجھے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ میں کس حالت میں ہوں بلکہ میرے والد نے تو عدالت سے یہ کہہ دیا ہے کہ پھانسی لگنے کے بعد میری لاش کو کسی لاوارث کی طرح کسی گڑھے میں دفن کردینا مگر اس گھر میں نہ بھیجنا جبکہ اندیشہ کے گھر والوں نے اتنا کچھ ہوچکنے کے باوجود عدالت سے استدعا کی کہ ہم اسے اپنی بیٹی کا خون معاف کرتے ہیں اگر علاج معالجے سے یہ ٹھیک ہوسکتا ہے تو اسے رہا کردیا جائے لہٰذا عدالت کے آرڈر کے مطابق قابل ڈاکٹر حضرات کی ایک ٹیم تشکیل دی گئی جنہوں نے مکمل طور پر میرا چیک اپ کرنے کے بعد عدالت کو یہ رپورٹ دی کہ "انسانی خون و گوشت اب اس کی زبان سے لگ چکا ہے اور ہر طرح سے چیک اپ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اگر اسے زیادہ دیر زندہ رکھا گیا تو ہوسکتا ہے اس کے ہاتھوں دوبارہ کسی معصوم کا خون ہوجائے۔"

تمام تر حالات وواقعات کی روشنی میں عدالت نے ایک بار پھر مجھے نہ صرف پھانسی کا حکم سنایا بلکہ پھانسی دینے کے فوراً بعد میرے جسد خاکی کو آگ لگا کر خاکستر کرنے کا حکم دیا......"

اس کی بات میں کرب تھا مگر اب مجھے اس درندے سے کراہیت محسوس ہورہی تھی تبھی مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی تکلیف سے دوچار ہے وہ بار بار سر کو جھٹک رہا تھا، دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ اس کے اوپر کے دونوں دانت آہستہ آہستہ باہر نکل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آگ کے آلاؤ سے جلنے لگ گئے تھے۔ اس کے ہونٹوں میں ایک عجیب سی تھرتھراہٹ پیدا ہوچکی تھی قبل اس کے کہ میں وہاں سے کھسکتا اس نے ایک جست لگا کر مجھے گرایا تو میرے منہ سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی جس کی بازگشت شاید جیلر صاحب نے اور دوسرے عملے نے بھی سن لی تھی۔

کی آواز گونجی اور وہ اچھل کر ایک طرف جا گرا۔ میں جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا میری سانسیں بے ترتیب ہوچکی تھیں بدحواسی کے عالم میں میں جلدی سے کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا کمرے کے دروازے میں جیلر صاحب ہاتھ میں رائفل پکڑے کھڑے تھے۔

میں نے ایک نگاہ جیلر صاحب پر اور دوسری سرسری نگاہ اس ڈریکولا پر ڈالی جس کے جسم سے گاڑھا سیال مادہ تیزی سے کمرے میں پھیل رہا تھا ایک عجیب سی بساند سارے کمرے میں پھیل چکی تھی اس کا جسم تھوڑی دیر ماہئی بے آب کی مانند تڑپا اور پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

"سوری جبرال صاحب! ہماری نااہلی کی بنا پر آپ کو ایسی سچویشن سے دوچار ہونا پڑا۔" جیلر صاحب نے معذرت خواہانہ لہجے میں میرے پاس آکر کہا۔

"کوئی بات نہیں جیلر صاحب، ایک خونی کا خاتمہ ہوگیا کیا یہ کم ہے......" میں نے آہستہ سے کہا۔ ایک کانسٹیبل یخ ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لے کر اندر آیا اور مجھے تھمایا جسے میں ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل گیا۔

میرا دل زور زور سے دھک دھک کررہا تھا، میں نے ایک بار پھر ایک سرسری نگاہ اس نوجوان پر ڈالی، اس کی آنکھیں موت کی کرب وتکلیف سے کھلی ہوئی تھیں، دائیں آنکھ کے دائیں کونے میں آنسو کی چمک مجھے دور سے ہی دکھائی دی تھی، خون ایک طرف جمع ہوگیا تھا، پولیس کی بھاری نفری پہنچ چکی تھی ایمبولینس بھی آگئی اور اس کے مردہ جسم کو اٹھا کر لے گئے، پولیس والے اپنی ضروری کارروائی میں مصروف تھے جبکہ میں ایک طرف بیٹھا حیران وپریشان تھا کہ آیا آج کے دور میں بھی ایسی باتیں جنم لے سکتی ہیں۔

خوش نصیب

محمد بلال۔ کراچی

حقیقت سے فرار مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہوتا ہے، حقیقت کے لبادے میں لپٹی انہونی کہانی

سریتا کے سر کا درد اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ پارٹی کے لطف سے محروم رہنے کا غم اسے اور سنگین بنانے کا سبب تھا۔

''جان من! مجھے افسوس ہے!'' سریتا نے اپنے شانے اچکاتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ سر کا یہ جان لیوا درد مجھے پارٹی میں جانے دے گا۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' آنند کمار نے اسے دلاسا دیا۔ وہ بستر کے ایک کونے میں بیٹھا کمرے میں بچھے ہوئے قالین کو بڑے غور سے دیکھے جارہا تھا۔ سریتا کو اس پر بڑا ترس آیا۔ ''میری وجہ سے کیوں محروم رہے۔'' وہ یہ سوچ کے اٹھ کے سرکتی اپنے شوہر کے قریب آگئی۔

''بہتر ہے تم اکیلے ہی پارٹی میں چلے جاؤ۔ وقت گزاری کے لئے وہاں تمہیں کئی پرانے دوست ملیں گے۔ میں اسپرین کی گولی کھا کے سوتی ہوں۔ شاید اس طرح کچھ افاقہ ہوجائے۔'' وہ اس کی گدی کے بالوں کو سہلاتی ہوئی بولی۔

آنند کمار نے قالین سے نگاہ ہٹا کے گھڑی پر نظر ڈالی اور اٹھ کے فینسی ڈریس شو میں شرکت کرنے کی غرض سے لایا ہوا اپنا لباس پہنا اور باہر نکل گیا۔

آسمان پر تیرتے ہوئے گہرے سیاہ بادل بارش کی آمد کا پتا دے رہے تھے۔ آنند کمار کے جانے کے تقریباً دو گھنٹے کے بعد چھت پر بارش کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے سر کا درد تقریباً ختم ہوچکا ہے۔

وہ بستر سے اٹھ کے کھڑکی کے قریب کھڑی موسم کی حشر سامانی سے لطف اندوز ہورہی تھی کہ اچانک اس کی نظر فرش پر رکھے ہوئے اس کیس پر پڑی جس میں اس نے پارٹی میں شرکت کے لئے بلی کی طرح کا ایک مخصوص لباس تیار کرواکے رکھا ہوا تھا۔ خیالات میں گم سریتا کے ذہن میں ایک خیال گردش کرنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اندر رکھے ہوئے مخصوص لباس کی بابت آنند کمار لاعلم ہے، کیوں نہ وہ پارٹی میں جاکے اپنے شوہر کو سرپرائز دے۔

بیس منٹ کے بعد بلی بنی ہوئی سریتا پارٹی میں موجود تھی۔ دربان اسے اس جگہ لے گیا۔ جہاں سے شباب پر آئی ہوئی پارٹی کا منظر سامنے تھا۔ مدہم روشنی ماحول کو تاریک، مدہم موسیقی اسے سحر انگیز بنائے ہوئے تھی۔ اس ملگجے ماحول کے باوجود سریتا نے آنند کمار کو پہچان لیا جو اس کے سامنے ہی سرکس کا جوکر بن کے گیا تھا۔ یہ دیکھ کر آنند کمار نرس بنی ہوئی ایک گل بدن کے ساتھ محو رقص تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے۔ خوب فائدہ اٹھایا جارہا تھا۔ اس کا اگلا ردعمل اس عورت کا سا جو جل اٹھی ہو۔

قریب بچی ہوئی میز سے اس طرح گلاس اٹھایا اور اسے آہستہ آہستہ حلق میں انڈیلنے لگی۔ حلق کی خشکی تو دور ہوگئی لیکن دماغ کی گرمی بڑھتی گئی۔ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھی۔ رقص ختم ہوگیا تو آنند کمار کی ہم رقص نے معذرت خواہانہ لہجے میں سرگوشی کی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ آنند کمار تنہا ہی ستانے کی غرض سے ایک میز کی گرد پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

پانچ منٹ کے وقفے کے بعد رقص کے اگلے دور کے لئے موسیقی کی لہریں جیسے ہی پھیلنا شروع ہوئیں تو بلی نے جھپٹا مارنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس شعلہ بدن کی قربت میں اتنی حدت تھی کہ وہ جو کر جلنے لگا۔

''یہاں قدرے شور ہے۔'' وہ ہٹ کے کھڑی ہوگئی اور سرگوشی کرتی ہوئی بولی۔ ''کسی پرسکون جگہ چلتے ہیں۔''

اگلے ہی لمحے وہ پارٹی سے کھسک گئے۔ اب ان کا رخ ان سیڑھیوں کی طرف تھا جو خواب گاہ کو جاتی تھیں۔

چالیس منٹ کے بعد سریتا لباس درست کرتی ہوئی نیچے اتر آئی۔ اس کا رخ اس دروازے کی طرف تھا جہاں سے وہ داخل ہوئی تھی۔ باہر نکل کے گاڑی اسٹارٹ کی اور رخ گھر کی جانب کرلیا۔ بیتی بات اس کے ذہن میں گدگدی کررہی تھی۔ آئندہ امکانات بھی خارج از امکان نہ تھے، اسے اس بات پر غصہ تھا کہ آنند کمار کبھی اس کے ساتھ ایسے والہانہ پن، گرم جوش اور وارفتگی سے پیش نہ آیا تھا۔ ان کی شادی کو سات برس کا عرصہ ہورہا تھا۔

سریتا نے گھر پہنچ کے مخصوص جگہ گاڑی پارک کی، خواب گاہ میں جاکے اس نے جلدی سے میک اپ صاف کیا اور لباس تبدیل کرنے کے بعد بلی کا لبادہ پیک کرکے رکھ دیا۔

بارش کے باعث موسم قدرے خوش گوار ہوچکا تھا۔ ہوا کی خنکی ان کو تازہ بہ دم کرنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن اس کے باوجود سریتا گھٹن محسوس کررہی تھی۔ اس کا جوڑ جوڑ درد کررہا تھا۔ اسے جیسے گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کے رکھ دیا گیا تھا۔ اس سہانے موسم میں نینداس کی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ وہ اپنی سوچ اور بیتے لمحات میں گم تھی کہ اسی اثنا میں اس نے آنند کمار کی گاڑی کے ہارن کی آواز سنی تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ایک بے چینی تھی جو اس پر حاوی تھی۔

''کیسی رہی پارٹی؟'' سریتا نے پوچھا۔ بظاہر ایسا نظر آنے کی کوشش کررہی تھی جیسے ابھی بیدار ہوئی ہو۔ اس اداکاری میں وہ کسی حد تک کامیاب تھی۔

''بوریت...... سراسر وقت کا ضیاع۔'' آنند کمار نے بڑی بے نوازی سے جواب دیا۔

''کوئی خاص بات؟'' سریتا نے دریافت کیا۔

''نہیں...... قطعاً نہیں......'' آنند کمار نے سادگی سے جواب دیا۔ ''میں حیران ہوں کہ چہرے کتنی جلدی ناآشنا ہوجاتے ہیں۔ میں بہ مشکل اپنے دوستوں کو پہچان سکا۔''

''پھر کیا ہوا......؟'' سریتا کے انداز سے بے چینی ظاہر ہورہی تھی۔

''میں نے ایک آدھ دفعہ رقص میں حصہ لیا لیکن تمہارے بغیر لطف نہیں آیا۔ اس لئے وہاں سے کھسک کے گوپال کے گھر پر تاش کی محفل سجائی تھی۔ اس طرح وقت اچھا کٹ گیا تھا۔''

سریتا پھٹ پڑنے والی تھی کہ آنند کمار جو قمیص اتار چکا تھا۔ ایک دم زندگی سے بھرپور قہقہہ لگا کے بولا۔ ''کیا تم وشوا ناتھ کو جانتی ہو......؟'' وہ یہ بات بھی کہنا چاہتی تھی کہ کلب میں اس نے کتنی بار دبوچا اور چاہا کہ اسے بھی تباہ کردے۔ لیکن نامراد رہا۔ یہ بات کیسے کہہ سکتی تھی۔

''نفرت ہے مجھے اس گرسنہ نگاہوں والے جنونی سے...... اس نے جانے کتنی لڑکیوں اور عورتوں کو تباہ کیا۔'' سریتا نے تیز لہجے میں کہا۔

''سنو تو سہی......'' آنند کمار نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ لڑکیوں، عورتوں کے معاملے میں ہمیشہ خوش نصیب رہا ہے۔ تاش کی بازی کے دوران اس جنونی نے مجھ سے میرا لباس مستعار لے لیا تھا...... پارٹی میں اس خوش قسمت کی ایک شوقین مزاج گل بدن سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ چالیس منٹ تک وہ اس کے ساتھ خواب گاہ میں رہی۔''